خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جنوری 2019

سالِ نو مبارک

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ	محمود ریاض
مدیرہ	نادرہ خاتون
مدیر	آذر ریاض
نائب مدیرہ	رضیہ جمیل
مدیرہ خصوصی	امت الصبور
	بلقیس بھٹی
نفسیات	عدنان
اشتہارات	خالدہ جیلانی
قانونی مشیر	نور الدین سر کی اینڈ کمپنی ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

سالِ نو مبارک

کہی اَن کہی، مدیر 12
کرن کرن روشنی، ادارہ 13
ہمارے نام، نادرہ خاتون 238

بیاد انشاء جی

خط انشاء جی کے، رضیہ فصیح احمد 18

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امتہ الصبور 236

مجھ سے ملیے

باتیں زرین افضل سے، شاہین رشید 248

انٹرویو

عفت سحر طاہر، شاہین رشید 21
خامشی کو بیاں ملے، ادارہ 246
خواب خواہش، ادارہ 27

ناول

الف، عمیرہ احمد 36
حالم، نمرہ احمد 196

مکمل ناول

رزق زوال، نعیمہ ناز 162
گلابی سے تھے ہم سفر، حیا بخاری 104

ناولٹ

حور، راشدہ رفعت 74
دل فقیر ہوا، مدیحہ سعید 138

افسانے

سونا آنگن، شازیہ الطاف ہاشمی 67
جدید دور کی قدیم عورت، سویرا فلک 71
فائدہ، نادیہ جہانگیر 135
آشیانہ، نزہت حسین ضیا 98
ابی کی بٹیا، میمونہ صدف 62
گول روٹی، غزالہ جلیل 226

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

نظمیں غزلیں

غزل، عزیز حامد مدنی 231
غزل، زوبیر فیصل عباسی 232
غزل، میثم علی آغا 231
نظم، ظریف احسن 232

رنگا رنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ 233
خبریں و بریں، واصفہ سہیل 252

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، خالدہ جیلانی 245

پکوان

موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 255
آپ کا باورچی خانہ، شازیہ الطاف ہاشمی 254

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان 256

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امتہ الصبور 258

جنوری 2019
جلد 46 شمارہ 9
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کچھ باتیں

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری 2019 آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

[illegible] ایک اور نیا سال اپنے دامن میں خواب اور مسائل لیے ہمارے سامنے ہے۔ [illegible] سال کے اختتام پر احساسات کچھ عجیب ہی رنگ لیے ہوتے ہیں۔ ایک طرف کچھ کھونے کا [illegible] نئے سال کے خوش کن خواب اور خواہشیں دل میں امید و آس جگاتے ہیں۔ جانے والے [illegible] لوگ شامل ہوتے ہیں ان کی خوشی ہوتی ہے۔ سال رواں کی آخری گھڑیاں بہت کٹھن ہوتی [illegible] دل کو گھیر لیتا ہے۔ وقت کے کتنے قیمتی لمحے ہاتھ سے نکل گئے۔ کتنے کام ہونے [illegible] پلٹے۔ تب آنے والے لمحے امید جگاتے ہیں۔ ابھی وقت باقی ہے۔ جو کام ادھورے ہیں [illegible] ارادے باندھے جاتے ہیں جو کچھ پورے ہوتے ہیں، کچھ ناکام ہی رہ جاتے ہیں [illegible] اس بات کا علم ہے کہ جو پل گزر گئے، وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ مستقبل بے یقین ہے۔ [illegible] زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اسی کو تھام لیں۔ یہی کامیابی و کامرانی کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔

قارئین کو نیا سال مبارک۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ نیا سال آپ کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابیاں لے کر آئے۔ سال گزشتہ میں [illegible] نئے سال میں ان کا سامنا نہ ہو۔ آمین۔

انشا جی

یہ کس نے کہا تم کوچ کرو، باتیں نہ بناؤ انشا جی
یہ شہر تمہارا اپنا ہے، اسے چھوڑ نہ جاؤ انشا جی

[illegible] شہر ہی کیا، ایک زمانہ ان کی راہ میں پلکیں بچھاتا تھا۔ بس انشا جی نے [illegible] انشا جی خاموشی سے چل دیے۔ ایک ایسے سفر پر جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔

انشا جی [illegible] ان جیسا کون ہوگا، کون ہو سکتا ہے۔ شاعر، مزاح نگار، کالم نگار، سفرنامے بھی لکھے [illegible]۔ شہرت کے آسمان پر چاند بن کر چمکے اور سب کے دلوں میں گھر کر لیا۔ [illegible] جگمگاتی شاعری، مزاح کی چاشنی لیے ان کے سفرنامے، انشا جی [illegible] وقت مہلت دیتا تو جانے اور کیا کچھ لکھتے لیکن اس مختصر عمر میں بھی [illegible] ادب میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

[illegible] کے موقع پر دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- [illegible]
- [illegible] کا مکمل ناول - [illegible]
- [illegible] اور [illegible] کے ناولٹ،
- [illegible] زہت جبیں ضیاء، [illegible] جہانگیر، مزلا جمیل راؤ اور سیدہ آیت گیلانی کے افسانے،
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- نمرہ احمد کا ناول - حالم،
- نعیمہ ناز کا ناول - رزقِ زوال،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ عفت سحر طاہر سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی - احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،

[illegible] اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

لباس سے متعلق احکام و مسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی جس میں نقش و نگار تھے۔ پھر فرمایا:

”مجھے اس کے نقش و نگار نے مشغول کر دیا۔ اسے ابوجہیم (رضی اللہ عنہ) کے پاس لے جاؤ اور ان سے ان کی سادہ چادر لے آؤ۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ مرد کے لیے نقش و نگار والا کپڑا پہننا جائز ہے بشرطیکہ وہ اس قسم کا نہ ہو جسے زنانہ کپڑا قرار دیا جاتا ہو۔

2۔ نمازی کے سامنے ایسے نقش و نگار نہیں ہونے چاہئیں جو نمازی کی توجہ اپنی طرف مبذول کریں، اس لیے رنگ برنگے مصلوں پر نماز پڑھنا مناسب نہیں۔

3۔ مسجد کی دیواروں کو طرح طرح سے مزین کرنا بھی درست نہیں، اس سے بھی نمازی کی توجہ نماز سے ہٹ جاتی ہے۔

4۔ مرد کے لیے سادہ لباس پہننا بہتر ہے۔

5۔ کسی کا تحفہ واپس کرنا پڑے تو عذر واضح کر دینا چاہیے۔

6۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی سے دوسری چادر اس لیے طلب فرمائی کہ ہدیہ واپس ہونے کی وجہ سے ان کی دل شکنی نہ ہو۔

7۔ مقتدیوں اور ساتھیوں کے جذبات مجروح کرنے سے حتی الوسع اجتناب کرنا چاہیے۔

8۔ انجانیہ ایک قسم کی سادہ، نقش و نگار کے بغیر چادر ہوتی تھی جو بہت معمولی درجے کے موٹے کپڑے کی ہوتی تھی۔

دو کپڑے

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے ایک موٹا تہبند دکھایا جو یمن میں بنایا جاتا ہے، اور ایک

چادر دکھائی جسے ملبدہ کہتے ہیں۔ انہوں نے قسم کھا کر فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو کپڑوں میں فوت ہوئے تھے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ ملبدہ ایک قسم کی موٹی چادر ہوتی ہے۔

2۔ اس زمانے میں عرب میں جو کپڑے پائے جاتے تھے، ان میں موٹے اونی کپڑے سستے ہوتے تھے۔ اور یہ سادہ لباس غریب لوگ پہنتے تھے۔ باریک سوتی لباس بہت قیمتی اور عمدہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے اسے امیر لوگ استعمال کرتے تھے۔

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نہایت سادہ تھی۔

4۔ تاکید کے طور پر قسم کھا کر کوئی بات بتانا جائز ہے۔

نجرانی چادر

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موٹے کنارے والی نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ (بخاری)

چادر

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک خاتون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چادر لے کر حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! میں نے یہ چادر اپنے ہاتھ سے بنی ہے تاکہ آپ کو پہناؤں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چادر لے لی کیونکہ آپ کو اس کی ضرورت تھی۔ آپ گھر سے تشریف لائے تو وہ چادر تہبند کے طور پر پہن رکھی تھی۔ فلاں آدمی آیا۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے اس دن اس شخص کا نام بھی لیا تھا (بعد میں راوی کو یاد نہیں رہا۔) اس آدمی نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! یہ چادر کتنی اچھی ہے! مجھے عنایت فرما دیجیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اچھا!"

جب آپ گھر تشریف لے گئے تو وہ چادر تہ کر کے اس صحابی کے ہاں بھیج دی۔

لوگوں نے اس سے کہا: "اللہ کی قسم! تو نے اچھا نہیں کیا۔ یہ چادر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اور آپ کو اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ تو نے آپ سے مانگ لی، حالانکہ تجھے معلوم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔"

اس نے کہا: "قسم ہے اللہ کی! میں نے آپ سے چادر پہننے کے لیے نہیں مانگی بلکہ اس لیے مانگی ہے کہ وہ میرا کفن بنے۔"

حضرت سہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جس دن وہ صاحب فوت ہوئے، وہ چادر (بھی) ان کا کفن تھی۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ تحفہ دینا اور تحفہ قبول کرنا اچھے اخلاق میں شامل ہے۔

2۔ عورتیں دستکاری کے کام کر کے گھر کی آمدنی میں اضافہ کر سکتی ہیں بشرطیکہ پردے کے تقاضے کما حقہ پورے ہو سکیں۔

3۔ کوئی چیز اگر کوئی شخص مانگ لے تو سخاوت کا تقاضا ہے کہ اسے دے دی جائے اگرچہ خود کو ضرورت ہو۔

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے مس ہونے والی چیز حصول برکت کے لیے اپنے پاس رکھنا یا استعمال کرنا درست ہے۔ یہ صرف اس صورت میں ہے جب یہ یقینی طور پر ثابت ہو کہ اس کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے رہ چکا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حکمرانوں کو جو خطوط اور گرامی نامے بھیجے تھے، ان کے علاوہ اب دنیا میں ایسی کسی چیز کا قطعاً کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ جو عوام الناس میں "موئے مبارک" وغیرہ قسم کی اشیاء مشہور کر دی گئی ہیں، بالکل بے اصل اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ ایسی تمام اشیاء کے متعلق دعوی بالکل بلا دلیل ہے۔ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کوئی

بھی چیز، از قسم: عصا، عمامہ، موئے مبارک اور نعلین وغیرہ اب دنیا کے کسی بھی حصے میں کہیں موجود نہیں۔ یہ سب من گھڑت اور خود ساختہ قصے کہانیاں ہیں۔ واللہ اعلم۔

5 سلف صالحین نے کسی صحابی یا تابعی سے منسوب چیز کو بطور تبرک محفوظ نہیں رکھا۔ جو چیزیں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں ان میں سے اکثر کی ان حضرات کی طرح نسبت درست نہیں۔

معمولی لباس

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اون کا (سادہ اور موٹا) لباس پہنا ہے، مرمت شدہ جوتا پہنا ہے اور انتہائی موٹا کپڑا زیب تن فرمایا ہے۔

جو لباس (شرعاً) ممنوع ہے

ممنوع انداز

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طرح کے لباس پہننے سے منع فرمایا۔ لباس پہننے کے دو (ممنوع) انداز یہ ہیں۔

چادر کو اس انداز سے جسم پر لپیٹنا کہ ہاتھوں اور بازوؤں کو حرکت دینا مشکل ہو جائے۔ اور ایک کپڑے میں اس طرح بیٹھنا کہ اعضائے مستورہ ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔

فوائد و مسائل:

1۔ لباس کا مقصد جسم کو اور خاص طور پر پردے کے اعضاء (شرم گاہ) کو چھپانا ہے۔ اگر چادر یا تہبند اس انداز سے استعمال کیا جائے کہ یہ مقصد حاصل نہ ہو تو یہ ممنوع ہے کیونکہ ایسا لباس حیا کے منافی ہے۔

2۔ کپڑے میں لپٹ جانے کو اشتمال الصماء کہتے ہیں۔ صماء کے معنی ٹھوس چیز کے ہیں، یعنی اس طرح چادر اوڑھ کر انسان آسانی سے حرکت کرنے سے محروم ہو جاتا ہے، جس طرح ٹھوس پتھر حرکت نہیں کر سکتا۔

3۔ احتباء کا مطلب ہے گھٹنے کھڑے کر کے اس طرح بیٹھنا کہ ایک کپڑے کے ساتھ کمر اور گھٹنوں کو باندھ لیا جائے۔ اگر تہبند کو اس طرح باندھ کر بیٹھا جائے تو پردے کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اگر تہبند کے علاوہ دوسرے کپڑے کو اس طرح لے کر بیٹھا جائے تو جائز ہے کیونکہ اس سے بے پردگی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک کپڑے میں احتباء نہیں۔

4۔ بعض اوقات گھٹنے کھڑے کر کے بازو ان کے سامنے لا کر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اس طرح بیٹھنا جائز ہے کیونکہ اس طرح بیٹھنے سے بے پردگی نہیں ہوتی، لیکن خطبے کے دوران اس طرح بیٹھنے سے روکا گیا ہے کیونکہ اس طرح بیٹھنے سے نیند آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اون کا لباس پہننا

حضرت ابو بردہ رحمتہ اللہ اپنے والد (حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انہوں نے مجھ سے فرمایا:

"بیٹا! کاش تم نے ہمیں اس وقت دیکھا ہوتا جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے، جب ہم پر بارش ہو جاتی تو (ایسی بو پیدا ہوتی کہ) تم ہماری بو کو بھیڑوں کی بو سمجھتے۔" (احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ اہل عرب اون کو اس طرح تیار کرنے کے فن سے واقف نہیں تھے جس طرح آج کل تیار کی جاتی ہے۔ اس سے نفیس اور ہموار تار تیار ہو جاتے ہیں بلکہ وہ سادہ انداز سے تیار کیا ہوا موٹا تار ہوتا تھا اور اس سے بننے والا کپڑا بھی موٹا اور کھردرا ہوتا تھا، اس لیے سوتی کپڑا نفیس اور قیمتی جبکہ اونی لباس بھدا اور سستا ہوتا تھا۔

2۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ناز و نعمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ خود تو معمولی خوراک اور لباس پر اکتفا کرتے جبکہ اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔

3۔ جب عمدہ لباس کی طاقت نہ ہو تو اونی لباس پر صبر کرنا چاہیے اور اللہ سے شکوہ کرنے کے بجائے

دین۔ وایمان کی حفاظت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

4۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ بکریوں کے کانوں پر نشان لگا رہے تھے۔ اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چادر تہ بند کے طور پر باندھے ہوئے دیکھا۔''

فوائد و مسائل:

1۔ جانوروں کو ایسی علامت لگانا جائز ہے جس سے وہ دوسروں کے جانوروں سے پہچانے جاسکیں۔

2۔ اس مقصد کے لیے جانوروں کے چہروں پر داغ نہیں دینا چاہیے، کسی اور جگہ نشان لگایا جاسکتا ہے۔

3۔ کساء سے مراد بالوں سے بنی ہوئی چادر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اونی لباس پہننا جائز ہے۔

سفید کپڑے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہارے بہترین کپڑے سفید ہیں، انہیں پہنا کرو اور اپنے فوت ہونے والوں کو ان میں کفن دیا کرو۔''

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سفید کپڑے پہنا کرو، وہ زیادہ پاک اور زیادہ عمدہ ہیں۔'' (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ سفید رنگ افضل ہے، اس لیے اہم مواقع پر سفید کپڑے پہننا بہتر ہے۔

2۔ سفید لباس خوب صورت بھی ہوتا ہے اور باوقار بھی۔ اس میں میل کچیل کا جلدی پتہ چل جاتا ہے، اس لیے اس کو جلدی دھولیا جاتا ہے اور زیادہ توجہ سے دھویا جاتا ہے جس کی بنا پر وہ زیادہ پاک صاف رہتا ہے۔

3۔ کفن کے لیے سفید کپڑا بہتر ہے، ویسے دوسرا کپڑا بھی درست ہے خصوصاً دھاری دار کپڑا۔ (سنن ابی داود، الجنائز، باب فی الکفن، حدیث: 3150)

تکبر کی وجہ سے کپڑا لٹکانا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص تکبر کے ساتھ اپنا کپڑا گھسیٹ کر چلتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف (رحمت کی) نظر نہیں فرمائے گا۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ کپڑا گھسیٹنے کا مطلب یہ ہے کہ کپڑا اتنا لمبا ہو کہ زمین پر گھسٹتا ہو یا زمین سے چھوتا ہو۔

2۔ تہبند، شلوار، پتلون، پاجامہ، عربی قمیص جو پاؤں تک ہوتی ہے ان سب میں مرد کے لیے جائز حد یہ ہے کہ کپڑا ٹخنوں سے اوپر رہے۔ اور افضل یہ ہے کہ آدھی پنڈلی تک رہے۔

3۔ جائز حد سے نیچے کپڑا لٹکانا کبیرہ گناہ ہے۔

4۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کپڑا تکبر کی نیت سے نہیں لٹکاتے، ان کا یہ عذر درست نہیں کیونکہ ارشاد نبوی ہے:

''تہبند لٹکانے سے پرہیز کرو کیونکہ وہ تکبر ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تکبر پسند نہیں۔'' (سنن ابی داود، اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار، حدیث: 4084)

تکبر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس سے ایک قریشی نوجوان گزرا جو موٹے کپڑے کی چادر زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا:

''بھتیجے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے:

''جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا گھسیٹ کر چلتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف (رحمت کی) نظر نہیں فرمائے گا۔'' (احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ کسی کو غلط کام کرتے دیکھ کر فوراً ٹوک دینا درست ہے۔ یہ نہ سوچا جائے کہ اس نے مسئلہ پہلے

بھی تو سنا ہوگا۔

2۔ غلطی پر متنبہ کرتے وقت غصے کے بجائے پیار سے بات کی جائے، خاص طور پر اپنے سے چھوٹی عمر کے فرد کو ''بیٹا'' یا ایسا مناسب لفظ بول کر مخاطب کیا جاسکتا ہے۔

تہبند کی صحیح جگہ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یا اپنی پنڈلی کے پٹھے کے نچلے حصے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

''یہ تہبند کی جگہ ہے۔ اگر تو (یہاں تک رکھنا) نہ چاہے تو نیچے کرلے۔ اگر تو نہ چاہے تو (اور) نیچے کرلے۔ اگر تو (اتنا سا اونچا بھی رکھنا) نہ چاہے تو (معلوم ہونا چاہیے کہ) تہبند کا ٹخنوں میں کوئی حق نہیں۔'' (ترمذی)

امام ابن ماجہ رحمتہ اللہ نے یہی روایت علی بن محمد کے واسطے سے بھی اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے۔

فوائد و مسائل:

1۔ پنڈلی کے پٹھے کا نچلا حصہ گھٹنے اور ٹخنے کے درمیان میں ہوتا ہے، اسی لیے اگلی حدیث میں ''پنڈلیوں کے نصف'' کا لفظ مذکور ہے۔

2۔ تہبند، پاجامہ، عربی قمیص وغیرہ پنڈلی کے نصف تک رکھنا اصل حکم ہے۔ اس سے نیچے رکھنا جائز ہے، افضل نہیں۔

3۔ مرد کا کپڑا ٹخنے سے اوپر رہنا چاہیے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن یعقوب جہنی حرقی رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

''میں نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تہبند کے بارے میں کوئی فرمان سنا ہے؟ انہوں نے کہا:

''ہاں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ''مومن کا تہبند (شلوار، پینٹ اور پائجامہ وغیرہ) اس کی پنڈلیوں کے نصف تک (بلند) ہوتا ہے۔ اس جگہ اور ٹخنوں کے درمیان رکھنے میں اس پر گناہ نہیں۔ اور جو ٹخنوں سے نیچے ہو، وہ جہنم میں ہے۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین بار فرمائی۔

''جو شخص تکبر کے ساتھ تہبند (زمین پر) گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف (رحمت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا۔'' (ابوداؤد)

فائدہ:

تہبند گھسیٹنے کا مطلب یہ ہے کہ کپڑا اتنا نیچے لٹکا لیا جائے کہ وہ زمین تک پہنچ جائے اور چلتے وقت زمین پر لگتا رہے۔ مرد کے لیے ایسا کرنا حرام ہے۔ عورت کے لیے یہ جائز ہے کیونکہ یہ اس کے لیے پردے کا باعث ہے۔ اس طرح اس کے پاؤں اجنبیوں کی نظر سے چھپے رہتے ہیں۔

قمیص کتنی لمبی ہونی چاہیے؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''(جائز حد سے زیادہ) لٹکانا تہبند میں بھی ہوتا

بٹن کھلے رکھنا

حضرت قرہ بن ایاس مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی بیعت کی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص کا بٹن کھلا ہوا تھا۔''

فوائد و مسائل:

1۔ قمیص کے گریبان میں بٹن لگانا درست ہے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید کسی ضرورت (گرمی وغیرہ کی وجہ) سے گریبان کا بٹن کھولا ہوگا۔ اگر بطور تواضع اور اتباع نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہو تو مستحب اور باعث اجر ہے مگر ہمارے ہاں بعض علاقوں میں لوگ بطور تکبر اپنا گریبان کھلا رکھتے ہیں، لہٰذا ان کی مشابہت سے بچنا ضروری ہے۔

☆

خطِ انشا جی کے

رضیہ فصیح احمد

ایک مرتبہ ہم نے کسی صاحب عقل وفراست سے پوچھا کہ۔۔۔

"اخبار کے پہلے صفحے پر کن لوگوں کی تصویریں چھپتی ہیں؟"

تو انہوں نے جواب دیا کہ "جو کچھ کرتے ہیں یا کچھ بناتے ہیں، مثلاً "جہاز ہائی جیک کرتے ہیں یا سنچریاں بناتے ہیں۔"

ہم نے پوچھا۔ "اور لکھنے والے؟"

تو انہوں نے کہا۔ "جو وزیر یا سفیر ہو جائیں یا مرجائیں۔"

انشا جی اخبار کے پہلے صفحے پر آنے کے لیے اور تو کچھ نہ کرسکے بس چپکے سے مرگئے اور تابوت کے شیشے کے پیچھے سے ان کی شبیہ اخبار کے پہلے صفحہ پر نظر آئی۔ اس بات پر وہ نہایت عمدہ کالم لکھتے کہ جو لوگ ہوائی جہاز ہائی جیک کرتے ہیں، وہ ایک کروڑ ڈالر نقد مانگتے ہیں۔ ہم بے چارے عمر کی نقدی مانگتے رہے۔ وہ بھی ادھار اور سو پچاس برس نہیں بلکہ پانچ دس برس۔ سچ ہے، فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ لیــــکھک تھے۔ ہمارے تخیل کی اڑان بس اتنی ہی تھی۔

انشا جی میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ اوروں کے ساتھ اپنا بھی مذاق اڑا لیتے تھے بلکہ اوروں کا کم اپنا زیادہ۔ میرے نام انشا جی کے خطوں میں بھی ان کے انشائیوں کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ یہ خط دوسرے بہت سے خطوں کے ساتھ ایک بڑے سے لفافے میں ہمارے گھر کی دوچھتی پر ایک سوٹ کیس میں پڑے تھے۔ وہ دوچھتی اتنی اونچی تھی کہ ایک مرتبہ جو چیز اوپر چلی جائے، وہ نیچے نہیں آسکتی تھی اور جو نیچے رہ جائے، وہ اوپر نہیں جاسکتی تھی۔ گویا زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔

اس کے علاوہ اس گھر میں اور بھی کئی خوبیاں تھیں۔ مثلاً پانی نایاب تھا۔ دیمک اور مالکہ مکان با افراط نظر آتی تھیں۔ چھت ناپختہ اور فرش زمین سے بہت دور تھی۔ مکان کے بارے میں ہر شکایت کو وہ اپنے مرحوم شوہر کے کھاتے میں ڈال دیتی تھیں یعنی "میں کیا کروں، بیوہ ہوں۔" یہ جملہ وہ ہمیشہ بزبان انگریزی ادا کرتی تھیں۔ ہوسکتا ہے ان کے نزدیک لفظ "وڈو" لفظ سے زیادہ بیوگی ٹپکتی ہو۔

بہرحال اس مکان کی خستہ دوچھتی پر سے ایک مرتبہ جب سامان اتارا گیا تو سوٹ کیس کے سارے سوٹ بھی گل چکے تھے اور کیس بھی۔ صندوقوں میں لحاف اور رضائیاں پھوئی پھوئی ہوچکی تھیں اور ایک سوٹ کیس میں سے جو خطوط نکلے، وہ بس آخری سانس لے رہے تھے۔ اگر چند دن اور نہ نکالا جاتا تو پتا بھی نہ چلتا کہ زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔

آکسیجن تو میسر نہ تھی، بہرحال خطوں کو ہوا اور دھوپ دی گئی۔ جو زندہ بچے، انہیں دوبارہ داخل صندوق کردیا گیا۔ انشا جی کے خطوط چونکہ نہایت دل چسپ ہیں، اس لیے جی چاہا کہ چھپ جائیں تو اچھا ہے کہ روشنائی روز بروز دھندلا رہی ہے۔ مرحوم ایسے خوش خط بھی نہ تھے کہ ان کی تحریر سرد و گرم زمانہ زیادہ عرصہ تک جھیل سکے۔ ظالم وقت نے جس طرح صاحب قلم کو نہ چھوڑا، ان کی خطوں کو بھی ایک نہ ایک دن کھالے گا۔

1960 میں ہم نے "ہم قلم" کے لیے ایک افسانہ اور ایک مضمون بھیجا۔ انشا جی نے رسید بھیجی اور کچھ تعرف کی۔ اس طرح ہماری خط و کتابت "فیڈ ان" ہوئی جو اشفاق احمد کے ڈراموں کی طرح سج سج چلتی 1965ء میں "فیڈ آؤٹ" ہوگئی۔ اس زمانے میں انشا جی خود کچھ نہیں لکھ رہے تھے، اس لیے ان کو خاصی پریشانی تھی۔

وہ اکثر خطوں میں میری زود نویسی پر رشک کرتے نظر آتے ہیں مگر بعد میں پتا چلا کہ کچھ لوگ چھپے رستم ہوتے ہیں، کچھ چھپے انشا ہوتے ہیں۔ جیسے انشا جی تھے کہ جب ان پر کالم نگاری کا دوسرا دور آیا تو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ان کے کالموں کی کئی کتابیں ترتیب پاگئیں جو کسی بھی باذوق شخص کے گھٹتے دل کو بڑھاوے کا کام دے سکتی ہیں یا مالیخولیا کے مریض کو مالی پریشانیوں سے تو نہیں البتہ "خولیا" یعنی خالی خولی پریشانی سے نجات دلاسکتی ہیں۔

میرا خیال ہے اگر ہم (ہم میں آپ بھی شامل ہیں) میں چکنے گھڑے ہونے کی بے پناہ صلاحیت نہ ہوتی تو انشا جی کے کالم ہر شخص کے لیے تازیانہ تھے مگر ہم ان کی ہر بات مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ انشا جی کرتے مگر ہمارے کان پر جوں نہ رینگی۔ ہم نے اپنی خو نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ انشا جی نے اپنی وضع بدل دی اور وہ جو ہمیں چلو بھر پانی میں ڈوبنے کا اشارہ دیا کرتا تھا خود منوں مٹی کے نیچے جا چھپا۔

انشا جی سے خط و کتابت کے ذریعے ہماری نصف ملاقات کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو آمنے سامنے کی دو ایک ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ایک مرتبہ ان کے دفتر میں جوان دنوں نیشنل بک سینٹر کہلاتا تھا، عالی جی بھی موجود تھے۔ کسی صاحبہ سے ہماری ملاقات کروانا چاہتے تھے۔ دونوں صلاح کرتے رہے کہ کہیں وہ صاحبہ "میجر" کی بیوی سے ملنا بھی پسند نہیں کریں گی۔ کم از کم "میجر جنرل" تو کہو...... بہرحال فون ہوا۔ شاید انہوں نے میجر جنرل کی بیوی سے ملنا پسند نہ کیا چنانچہ ان صاحبہ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ خط میں ہائر انکم گروپ اور فصیح کو میجر جنرل لکھنے کا سبب یہ واقعہ ہے۔

دو ایک مرتبہ تقاریب میں ملاقات رہی۔ ایک دن عالی جی کے گھر میں ایک نہایت گوری چٹی فربہ سی خاتون نظر آئیں۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ بیگم انشا ہیں۔ انشا جی جب لندن سے تابوت میں بند لوٹے تو ان کے دو نہایت خوش شکل اور پیارے بچوں سے ملاقات ہوئی جن کے نام سعدی اور رومی ہیں۔ اسی دن سننے میں آیا کہ ان کا بڑا بیٹا بھی کہیں سے آیا ہے مگر صرف سنا، دیکھا نہیں۔

میں انشا جی کو زیادہ جاننے کا دعوا نہیں کرسکتی مگر ان کے بارے میں اچھی ہی باتیں سننے میں آئیں۔ سنا ہے کہ وہ اچھے شوہر، اچھے باپ، اچھے دوست، اچھے شاعر اور اچھے انشا پرداز تھے۔ یعنی وہ ہر طرح اچھے انسان تھے۔ وہ ہر ایک کا بھلا چاہتے تھے۔ آج کئی سال سے وہ ہم میں نہیں ہیں۔ ان کے نام کی گلی اور پارک البتہ موجود ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان پر بھی ضرور کالم لکھتے۔

میرے نام ان کے خطوط میں سے ایک خط۔

کراچی 4 مئی 1963ء

آداب رضیہ بیگم۔

میں گیا تھا لاہور، واپس آیا کل۔ اب عید قرباں مبارک۔ خدا آپ کو قربانی کی توفیق دے، آمین۔

WOMEN SKILLS GROUP

کبھی آپ نے سوچا کہ قربانی دینے والا تو جنت میں جاتا ہے لیکن بکرا کہاں جاتا ہے؟ اگر آپ کا شمار ملفتیان شرع متین میں ہے تو بیچ اس مسئلے کے رائے زنی کیجیے۔ خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جائے گی۔
لاہور میں پورے پندرہ روز رہا لیکن یہ سارے دن ایک ذاتی ابتلا اور پریشانی کے تھے۔ اندیشہ ہائے دور دراز کی ضرورت نہیں۔ ہم سایہ، ماں جایا مشہور ہے۔ سو ایک ہمسائے نے کہ سینما کا مالک ہے، ہماری ایک دیوار ڈھادی تھی اور کچھ فوج داری وغیرہ بھی کی تھی۔ خیر اب وہ معاملہ رفت گزشت۔ آپ کے ناول کا ذکر ڈھاکے میں بھی آیا تھا۔ لاہور میں بھی۔ ممتاز مفتی بھی ملے تھے لاہور میں۔ وعدہ کر کے گئے کہ میں ناول بھجوادوں گا۔ سو وہ پنڈی میں تادم تحریر ان کے بستے میں ہے۔ اب میں پھر ان کو لکھتا ہوں۔ اس کے چھپنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ باقی رہا "درد کے فاصلے" یہ بھی مجھے تو اچھا لگا۔ کوشش یہ ہوگی کہ گلڈ کے ناول سے پہلے نہیں تو اس کے ساتھ ساتھ چھپے۔ ریاض سے کہہ دوں گا کہ آپ کو خط لکھے۔
شہاب خود ایک پریشانی میں تھے۔ ان کی بیگم کا ہر بار سیزیرین آپریشن ہوتا ہے۔ اب کے جو بچہ ہوا اس کا ایک پھیپھڑا پورا نہ کھل پایا۔ پچاس گھنٹے کے بعد انتقال ہوگیا۔ بیگم کا میجر آپریشن الگ۔ سو ہم دونوں پریشان حال اکٹھے تھے اور ایک دوسرے کا درد بانٹتے تھے۔ اس ابتلا کے چکر سے قطع نظر لاہور میں بھی "عیش" کرتے تھے۔ وہ مجھے صبح ساڑھے پانچ بجے گھر سے اٹھاتے تھے اور ہم دو گھنٹے لارنس باغ میں گھومتے اور گپ زنی کرتے اور تازہ شہتوت خرید کے کھاتے۔ اب جس شخص کی قسمت میں عیش لکھا ہو، وہ کیا کرے۔
آپ نے مجھ پر رشک کیا ہے، اس پر میں بہت محظوظ ہوا۔ اوپن کرسی اور اقتدار تو آپ نے چڑانے کے لیے لکھا ہے۔ میں ان باتوں میں نہیں آتا۔ چائے، سیون اپ اور پان البتہ وہ نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جائز کر رکھی ہیں۔ دوست احباب بھی بس ہیں۔ اب رہا چاروں طرف کتابوں کا معاملہ، سو اس میں آپ کو رشک کرنے کی اجازت ہے، ایک بیٹے کو اس کی ماں نے دعا دی تھی کہ تیرے چاروں طرف کاروں کی ریل پیل ہوگی۔ سو وہ سعادت مند بڑا ہو کر ٹریفک کانسٹیبل بنا۔ بایں ہمہ آپ کے رشک کا شکریہ یوں "بجا اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا" باقی رہا سیر و سفر کا معاملہ۔ وہ بہت ہے لیکن میں کراچی سے نکلتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ ڈھاکے آپ جائیں تو سامان تو زور یا بدیر (بلکہ زود) ہو جائے گا لیکن آپ تنہا جا بھی سکیں گی۔ اس طرح بیرون ملک وفدوں کے نقطہ نظر سے بھی بتائیے کہ کیا صورت حال ہے؟ آپ میں اتنی قوت، جان اور خود اعتمادی ہے (علاوہ لیاقت کے) کہ کوئی پرابلم نہ ہونا چاہیے۔ دونوں لوازم کا ذکر اس لیے کر دیا کہ کارکنان قضا و قدر بالعموم......

آناں راکہ اس دہند آں نہ دہند

یہ بھی سن کے خوشی ہوئی کہ میں گھرا آدمی ہوں اور میرا رعب بیٹھ سکتا ہے۔ آئندہ میں بچوں کو ڈرانے کا کام (پارٹ ٹائم) بھی کیا کروں گا۔ میجر جنرل صاحب کو سلام۔

معروف افسانہ نگار ناول نگار

عفت سحر طاہر

شاہین رشید

مجھے اس وقت بہت حیرت ہوتی ہے جب کسی سے سوال کیا جائے کہ آپ کب سے رسالے پڑھ رہی ہیں تو جواب یہ آتا ہے کہ کم عمری سے پڑھ رہے ہیں مگر گھر والوں سے چھپ کر کیونکہ گھر والے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے جب ان رسالوں کی تحریروں پر ڈرامے بنتے ہیں اور مختلف چینلز پر آتے ہیں تو پورا گھر بڑے ذوق و شوق سے دیکھتا ہے اور تعریفیں بھی ہوتی ہیں۔ اس وقت تمام چینلز پر جو ڈرامے آ رہے ہیں، وہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی رائٹرز لکھ رہی ہیں۔

دراصل جو لوگ ان رسالوں کو پڑھنے سے منع کرتے ہیں، انہیں یہ علم ہی نہیں کہ ان رسالوں میں کس قسم کی تحریریں شائع ہوتی ہیں اور وہ عملی زندگی میں لڑکیوں کے لیے کتنی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان رسالوں میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں وہ لڑکیوں کو شعور و آگہی دیتی ہیں اور مثبت سمت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

افسانہ یا ناول لکھنا تخلیقی کام ہے اور قدرت یہ صلاحیت کسی کسی کو ودیعت کرتی ہے۔ دیگر شعبوں کی طرح تخلیق کے میدان میں بھی خواتین نے خود کو منوالیا ہے۔

عفت سحر طاہر کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے کئی ناولز، بے شمار افسانے اور ناولٹ شائع ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

عفت سحر طاہر کا انداز بیاں بہت سادہ اور فطری ہے۔ ان کے کردار اسی دنیا کے باسی ہوتے ہیں۔ وہ بہت خوب صورت اور با محاورہ نثر لکھتی ہیں۔ ان کی تحریریں گنجلک نہیں ہوتیں، نہ ہی وہ دقیق اور فلسفیانہ زبان لکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار قارئین کی پسندیدہ ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔

اس بار ہم آپ کی ملاقات عفت سحر طاہر سے کروا رہے ہیں۔

"جی...... عفت! کیا حال ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ کا نام کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے؟"

"اس کا بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ میری دوست شہر بانو کی ایک دوست تھی اس کا نام "سحر" تھا اور سحر سننے میں مجھے اتنا اچھا لگتا تھا کہ میں نے اپنی کاپیوں پر اپنا نام "عفت سحر پاشا" لکھنا شروع کر دیا۔ شادی کے بعد "عفت طاہر" کرنا چاہا مگر احتل نے کہا کہ اسے ایک دم سے چینج مت کرو، لوگوں کو پہچاننے میں دقت ہوگی پھر آہستہ آہستہ تبدیلی لانی پڑی اور میں نے "عفت سحر طاہر" لکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح "سحر" میرے نام کا حصہ میرے ساتھ ساتھ ہے۔ سحر نام نے مجھے اس وقت متاثر کیا جب میں آٹھویں کی طالبہ تھی۔"

"ہوں...... اچھا...... اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟"

"ابو کا تعلق پشاور سے تھا اور امی کا گجرات سے۔ شادی کے چند سال بعد دادا ابو کے ساتھ یہ لوگ بھی گجرات آ گئے یعنی والدین اور بچے۔ میرے چار بہن بھائی پشاور میں پیدا ہوئے جبکہ میں گجرات میں۔ کاش میں بھی پشاور میں پیدا ہوتی تو پٹھانی ہوتی۔ حق ہاہ......

مجھے زیادہ تو نہیں مگر دھندلا دھندلا سا یاد ہے کہ جب میں فورتھ کلاس میں تھی تو میرے ابو کا اچانک انتقال ہو گیا۔ میرا بڑا بھائی تقریباً سولہ سال کا تھا، نہ

WOMEN SKILLS GROUP

چچا، نہ تایا، نہ ماموں —— دادا ابو ہمارے لیے مشفق چھاؤں بن گئے۔ وہ خود بھی دکھ سے چھلنی سینہ لیے ہوئے تھے کہ ان کے آٹھ بچوں میں سے صرف میرے ابو کو اللہ نے زندگی دی۔ میری دادی میرے ابو کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔

دادا جان نے ابو کو بڑے ناز و نعم سے پالا، مگر محض پینتالیس سال کی عمر میں میرے ابو چل بسے، تو آپ میرے دادا ابو کے غم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی انہوں نے ہم سب کو باپ بن کر پالا۔"

"بچپن کیسا گزرا؟ کہانیاں لکھنے والوں کا بچپن دیگر بچوں سے مختلف ہوتا ہے۔ کیا ایسا ہی تھا؟"

"جی ایسا ہی تھا —— چونکہ بچپن دادا کے ساتھ گزرا تو پہلی کہانی انہوں نے ہی بُنتا سکھائی مجھے۔ سردیوں کی راتوں میں بستر پر رضائیوں کا گھر، اس کے دائرے میں بٹھا کر وہ "علی بابا، الہ دین کا چراغ" اور ڈھیر ساری کہانیاں روزانہ سنایا کرتے تھے۔ مجھے لیٹتے ہی فوراً نیند نہیں آتی تھی اور اب تک یہی حال ہے کہ سونے سے پہلے ذہن کسی نہ کسی کہانی کو بُنتا رہتا ہے۔ بچپن میں بھی پوری کہانی فلم کی طرح چلاتے ہوئے نہ جانے کب نیند آ جایا کرتی تھی۔ کہانیاں بُنتے بُنتے مطالعہ کا شوق ہوا اور پانچویں جماعت میں جانے تک گھر میں آنے والا اخبار جہاں، جاسوسی ڈائجسٹ اور دیگر چیزیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ چاہے زیادہ سمجھ میں باتیں یا تحریریں نہیں آتی تھیں مگر پڑھنے کا چسکا لگ گیا تھا۔"

"لکھنے کا اور اک یا شوق کب ہوا؟"

"لکھنے کا شوق نویں اور دسویں جماعت میں آ کر یوں ہوا کہ ہر کاپی اور ہر کتاب مختلف کوٹیشنز اور شعروں سے بھر جاتی تھی۔ پین ہاتھ میں آتے ہی میرا ہاتھ لکھنے کو بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ شاعری بھی کر لیتی تھی اور ایک رجسٹر بھی شاعری کا بھر چکی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اب اس شاعری کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ ویسے کوئی چھوٹی شاعری میں اب بھی کر لیتی ہوں، تو جب ہاتھ میں پین آتا تھا تو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنا کیا ہے۔ میٹرک میں، میں اور میری بہنیں خواتین، شعاع، جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ لیا کرتی تھیں۔

پھر میں نے شعاع اور دوسری ڈائجسٹوں میں تبصرے لکھ کر بھیجنا شروع کر دیے۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے ذہن کہانیاں بنانا شروع ہو چکا تھا۔ ایف اے تک میں کئی افسانے اور ایک آدھ ناول لکھ کر اپنے گدے کے نیچے چھپا کر رکھتی تھی۔ گھر والے سمجھتے تھے کہ میں کالج کے نوٹس لکھ رہی ہوں۔ آپ کو بتاؤں کہ میں اس زمانے میں بے حد شرمیلی اور اپنی فیلنگز کسی پر ظاہر نہ کرنے والی اور ناکامیوں سے ڈرنے والی لڑکی تھی۔

میں اپنے خاندان کی واحد لڑکی تھی جو بی اے کر رہی تھی، جب کہ ہمارے خاندان کی دیگر لڑکیوں کی ایف اے اور میٹرک کے بعد شادیاں ہو جاتی تھیں۔ خاندان میں دور دور تک کسی کو "ادب" سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ خواتین ڈائجسٹ کے ادارے میں اس وقت رفعت سراج، ہما کوکب بخاری، فریدہ اشفاق اور غزالہ نگار اور کزئی جیسی رائٹرز کا طوطی بولتا تھا، تو سچ بتاؤں کہ ہمت ہی نہیں پڑتی تھی ان کے درمیان آ دھمکنے کی۔"

"کوئی ایسا رائٹر جس کی تحریر آپ کو بہت متاثر کرتی تھی؟"

"جی —— میں اسلم راہی انکل کی تحریروں سے بہت متاثر تھی۔ لکھنے کی تحریک ایک رائٹر کو سامنے رکھ کر ہی ملتی ہے۔ میں ان کے ناول بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ ان کے تاریخی ناولز مجھے بہت متاثر کرتے تھے۔ وہ میرے لکھنے کے شوق سے بھی واقف تھے اور مجھے اکثر کہا کرتے کہ جنون کو فنون بنالو۔ اچھا میں آپ کو یہ بتاؤں کہ اسلم راہی انکل میری دوست شہر بانو کے پھوپھا ہیں اور میرا سارا بچپن ان کے ساتھ گزرا ہے۔ ہمارے تعلقات رشتے داروں جیسے ہیں۔ پہلے وہ کراچی میں رہتے تھے، پھر گجرات میں کئی سال رہے اور آج کل لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔"

"ڈائجسٹ تک رسائی کیسے ہوئی؟ پہلا افسانہ کس ڈائجسٹ میں چھپا؟"

"میں مختلف ڈائجسٹوں میں جب نوآموز رائٹرز کے افسانے پڑھا کرتی تھی تو (معذرت کے ساتھ) میں ان کو پڑھ کر سوچا کرتی تھی کہ ان سے اچھا تو میں لکھ لیتی ہوں یا لکھ سکتی ہوں۔ تو بس یہی سوچ کر میں نے پہلا افسانہ لکھا اور بہن کے ہاتھ محلے کے ایک معتبر صاحب جو کہ ڈاک خانے میں ہی ملازم تھے، ان کو بھیجا کہ وہ ایک پرچے میں پوسٹ کر دیں۔ انہوں نے بہ مشکل رجسٹری کروایا۔ خیر افسانہ چلا گیا اور میرا انتظار شروع ہو گیا۔

ایک ماہ گزرا، پھر دو ماہ گزر گئے۔ مگر تحریر نہ لگی تو میں مایوس ہو گئی کہ اتنی دیر تو نہیں ہو سکتی، یقیناً ردی کی ٹوکری میں چلا گیا۔ مگر تیسرے مہینے باجی نے رسالا کھولا اور ایک دم سے بولیں۔

"عفت تمہارا افسانہ چھپا ہے" تو یقین کریں کہ خوشی اور بے یقینی کے مارے "ٹھگ" رہ جانے والی کیفیت تھی میری —— اور باجی افسانہ پڑھتی جا رہی تھیں اور پوچھ بھی رہی تھیں کہ "تم نے کب لکھا اور کب بھیجا تھا۔"

"اور وہ جو گدے کے نیچے چھپا کر رکھے ہوئے تھے تو وہ چھپے؟"

"جی بالکل شائع ہوئیں اور وہ تمام تحریریں اسی پرچے میں ہی شائع ہوئیں۔ میں نے تقریباً سات سال وہاں لکھا اور اس کے بعد صرف شعاع اور خواتین ڈائجسٹ میں لکھا اور اللہ کا شکر ہے کہ جو لکھا وہ سب چھپا اور میں یہاں اپنے بھائی ارشد اور بھانجے احتشام کا ذکر ضرور کروں گی جو میرے لیے بڑی سخت ڈیوٹی دیتے تھے یعنی پیپرز لا کر دینا، بال پوائنٹس لا کر دینا، ڈاک کے لفافے لانا اور پھر سردی گرمی کسی موسم کا لحاظ کیے بغیر میری تحریریں پوسٹ کر کے آنا اور ماتھے پر شکن بھی نہ لانا —— واہ! کیا بات تھی دونوں کی۔"

"لکھنے کا معاوضہ اور کتابی شکل میں جو تحریریں آئیں ان کی رائلٹی ملتی تھی؟"

"الحمد اللہ۔ پہلے افسانے سے ہی معاوضہ ملنا شروع ہو گیا

اکتوبر 98ء میں پہلے افسانے سے میری تحریر کا سفر شروع ہوا اور ہاں ایک دلچسپ اور مزے کی بات بتاؤں، یہ بات آج تک میں نے کسی سے شیئر نہیں کی کہ —— ہر ادارے کے بارہا کہنے کے باوجود کہ پہلے افسانہ بھجیں پھر کچھ اور —— میں نے خواتین ڈائجسٹ میں پہلے ایک مکمل ناول بھیج دیا اور دم سادھ کر بیٹھ گئی۔ اللہ جانے انہیں ملا یا نہیں، مگر نہ وہ ناول لگا اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی بات ہوئی۔ وہ مکمل ناول بعد میں ایک اور رسالے میں "اعتبار کا موسم" کے نام سے شائع ہوا اور بہت سراہا گیا۔ میں نے وہاں دو قسط وار ناول لکھے۔ "سبز رتوں کی جھلمل میں" اور دوسرا "محبت دل پہ دستک" اور میرے لیے فخر کی بات تو یہ ہے کہ یہ ناول پاکستان کے علاوہ انڈیا کے قارئین میں بھی میری پہچان بنا اور اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

گھر میں میری شادی کا سلسلہ چل رہا تھا تو میں نے مارچ 2005ء میں خواتین ڈائجسٹ کے تمام رولز کو فالو کرتے ہوئی شرافت سے انٹری کا سوچا اور "از میر" سیریز کا پہلا افسانہ لکھ کر بھیج دیا۔ تب کافی خود اعتمادی بھی آ چکی تھی کہ "ہاں میں اس ادارے میں لکھ سکتی ہوں" اور اپریل 2005ء میں نہ صرف وہ افسانہ شائع ہوا بلکہ ایک شام جب میں اپنی بارات کا لہنگا پہن کر فٹنگ چیک کر رہی تھی کہ احمل کی کال —— اف —— کوئی اندازہ لگا سکتا ہے میری خوشی کا۔

احمل نے نہ صرف افسانے کی تعریف کی بلکہ مزید کچھ لکھ کر بھیجنے کو بھی کہا، تو میں نے انہیں بتایا کہ

WOMEN SKILLS GROUP

میری تو شادی ہو رہی ہے...... لیکن احتل نے پھر بھی اصرار کیا کہ شادی کے بعد بھی ضرور لکھنا اور آج تک احتل کا یہ کہنا ہے کہ عفت جب ازمیر بٹ کا افسانہ آتا ہے تو میں ساری تحریریں چھوڑ کر یہ پہلے پڑھتی ہوں۔ یقین کریں سیروں خون بڑھتا ہے میرا۔

خیر...... پھر میری شادی ہو گئی۔ ایک ایسے بندے کے ساتھ جس کی نہ میں نے تصویر دیکھی اور نہ اس نے میری تصویر دیکھی...... لیکن الحمدللہ! اللہ پاک کا کرم ہوا اور ایک بڑا پیارا، انتہائی نرم خو، مہذب اور محبت کے ساتھ ساتھ عزت کرنے والا شخص میرا شریک سفر بنا جس پر میں اللہ تعالیٰ کی انتہائی ممنون ہوں۔"

"افسانوں اور ناولوں میں جب رومانس لکھتی ہیں تو نظروں کے سامنے کون ہوتا ہے؟ یا بہت سوچنا پڑتا ہے یا میاں صاحب سامنے ہوتے ہیں؟"

"مجھے رومانس یا مزاح لکھنے کے لیے سوچنا نہیں پڑتا اور میاں صاحب ہی میرے سامنے ہوتے ہیں کیونکہ ہماری گفتگو برجستہ اور بڑے مزے کی ہوتی ہے کیونکہ ہمارا پہلا رشتہ دوستی کا رشتہ ہے اور ویسے بھی ہم رائٹرز ہیروز کے لیے ایک مخصوص اصطلاح استعمال کرتے ہیں "لونگ اور کیئرنگ" تو یہ ایسے ہی ہیں۔ الحمدللہ آج تک اس بندے نے کبھی جاہل مردوں کی طرح اونچی آواز میں بات کی اور نہ ہی کوئی طعنہ اور طنزیہ بات کی۔ اللہ پاک انہیں صحت و تندرستی والی زندگی عطا کرے، آمین۔

شادی کے بعد طاہر نے خام مال لانے اور رجسٹری یا ٹی سی ایس کروانے کی ذمہ داری اٹھالی اور اس بندے کی ہمت کہ کئی بار رات گئے بھاگم بھاگ گاڑی نکال کر ٹی سی ایس کروانے جاتے کہ آخری تاریخ ہے کل ڈائجسٹ کی۔ احتل جانتی ہیں کہ میں لکھنے کے معاملے میں کتنی تھی بلکہ ست ہوں مگر احتل کے حوصلے اور برداشت کو سلام۔"

"لکھنے کے لیے کوئی مخصوص وقت ہوتا ہے یا جب خیالات ذہن میں آئے نوٹ کر لیے؟"

"شادی سے پہلے مجھے لکھنے کے لیے مخصوص ماحول کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کیونکہ جب سب کے پاس بیٹھ کر لکھتی تھی تو مجھے احساس ہی نہیں ہوتا تھا اور تھوڑی دیر بعد میں اپنے کرداروں میں کھو جاتی تھی۔ رات کا وقت اور خاموشی لکھنے کے لیے مجھے بہترین لگتے ہیں اور اب تو یہ حال ہے کہ جب خیالات وارد ہوتے ہیں، تب فارغ نہیں ہوتی اور جب فارغ ہوتی ہوں تو لکھنے کا موڈ نہیں کرتا۔ چلتے پھرتے کئی کردار، سچویشنز اور مکالمے ذہن میں آتے ہیں تو فوراً موبائل میں لکھ لیتی ہوں کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔"

"شادی کے بعد کسی نے لکھنے پر اعتراض تو نہیں کیا؟ اور فیملی لائف ڈسٹرب تو نہیں ہوئی؟"

"شادی کے بعد کسی نے بھی لکھنے پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ میں نے کبھی اپنے لکھنے کے شوق کو گھر داری پر ترجیح نہیں دی اور ہمیشہ اپنی نیند کے وقت لکھا کیونکہ یہ میرا شوق تھا اور شوق نے وقت پڑنے پر میری ضرورت بھی پوری کی، اس لیے میرے لکھنے سے سسرال میں کسی کو فرق نہیں پڑا بلکہ میری نند اور جیٹھانی شوق سے میرے ناولز پڑھتی ہیں۔"

"کوئی ایسی تحریر جو آپ کے لیے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی؟"

"جی...... "محبت دل پہ دستک" یہ ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی کہ میں قارئین میں پہچانی جانے لگی۔"

"کوئی ایسی تحریر جو بہت دل سے لکھی مگر پذیرائی نہ ملی اور کوئی ایسی تحریر جو عام تحریروں کی طرح لکھی مگر اسے بہت پذیرائی ملی ہو؟"

"بن مانگی دعا" ایک بہت ہی حساس موضوع پر لکھی جانے والی تحریر تھی، خصوصاً صالحہ اور لیہا کا کردار میں نے بہت محنت سے لکھا مگر افسوس کہ یہ تحریر پذیرائی حاصل نہ کر سکی۔ شاید میرا انداز تحریر خواتین ڈائجسٹ کی قارئین کے لیے نیا تھا اور عام تحریروں کی طرح لکھی جانے والی تحریر "خواب شیشے کا" بہت پسند کی گئی۔ ہاں "ازمیر سیریز" ادارے اور قارئین میں اتنی سراہی جائے گی اس کا اندازہ نہیں تھا اور ایک بات وہ یہ کہ اس سیریز کے کردار اکرم بٹ اور بوبی کی فیملی اصل میں بھی موجود ہے۔"

"لکھنے کے لیے پورا پلاٹ ذہن میں آتا ہے یا صرف پلاٹ؟"

"لکھنے کے لیے پلاٹ یوں ہی ایک دم کسی شعر یا کسی کا ایک جملہ سن کر بھی وارد ہو جاتا ہے تو میں اسے فوراً موبائل میں سیو کر لیتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس تین مکمل ناولز کے پلاٹس ہیں جو شروع کی کہانی لکھ کر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اب باری باری ان کی قسمت جاگے گی اور میری یہ شروع سے ہی عادت ہے دو اکٹھے پلاٹ لکھ لینا یا اکٹھی کہانیاں لکھنا شروع کر دینا اور میں اپنی اس عادت سے بہت تنگ تھی تو آنٹی تہمینہ جو کہ ڈگری کالج فوارہ چوک میں فائن آرٹ کی ٹیچر تھیں۔ ان سے یہ پرابلم شیئر کی تو انہوں نے کہا کہ "تم بہت ذہین ہو بھئی" بڑے بڑے آرٹسٹ ایسا ہی کرتے ہیں کہ ایک ساتھ دو تین تصاویر پینٹ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو بس پھر دل کو قرار آ گیا کہ ایک میں ہی سرپھری نہیں دنیا بھری پڑی ہے ہم جیسوں سے۔"

"ٹی وی پر آپ کی کوئی تحریر نظر نہیں آئی، کیوں؟"

"ایک پروڈیوسر میری خان نے بڑا اصرار کر کے میرے ایک ناول "دھند کے چھٹ جائیں گے" پر اسکرپٹ لکھوایا اور عبداللہ کاردار نے پروڈکشن ہاؤس کو دے دیا۔ مجھے اسکرپٹ کی پوری پے منٹ کر دی گئی مگر پانچ سال ہو گئے وہ اسکرپٹ شوٹ پر نہیں گیا۔ اس کے بعد میری دو تین تحریروں پر ہاتھ صاف کر کے کئی لوگ ڈرامے بنا چکے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ ایسے لوگوں کی قسمت میں اللہ نے چرایا ہوا رزق ہی لکھا ہو گا تو صبر آ جاتا ہے۔

"بن مانگی" دعا پر جو ڈراما بنا اس کے بارے میں احتل نے مجھے فون کر کے آگاہ کیا کہ تمہارے ناول پر کسی نے ڈراما بنا کر چلا بھی دیا ہے، تو یہ سب چلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد تقریباً تمام ہی چینلز سے آفرز ہوئیں۔ اے آر وائی کی ٹیم میرے گھر آئی مگر میرا دل نہیں کیا اس فیلڈ میں آنے کو۔"

"کمپیوٹر کے اس دور میں کیا مطالعہ کرنے کی عادت ہے لوگوں میں؟"

"آن لائن ریڈنگ نے جہاں پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے، وہیں کتاب سے دوری بڑھا دی ہے۔ ہمیں تو دی ہی کتاب گئی تھی اور کہا گیا...... اقراء...... یعنی کہ پڑھ تو آن لائن رائٹنگ اور ریڈنگ نے ہمارے بچوں کو واقعی کتاب سے دور کر دیا ہے۔ ایک روپیہ ہاتھ آتے ہی "عمرو عیار" اور ٹارزن کی کہانیاں خریدنا ہماری ترجیح ہوا کرتی تھی۔ ہمارے بچوں کے ہاتھ میں کمپیوٹر، آئی پیڈ اور ٹیب ہیں۔ خود بچوں کو شوق بھی نہیں، ان رسالوں کا اور وہ اب شاید ملتے بھی نہیں ہیں۔

برانڈڈ سوٹ اور جوتے خریدنے والوں کو اب رسالہ مہنگا لگتا ہے۔ میں خود آج تک کتاب اور رسالے پڑھنے کی عادی ہوں اور بچوں کے لیے نصیحتیں، کہانیاں اور نبیوں کے حالات زندگی اور سگنلز پر موجود بچوں سے خریدتی رہتی ہوں، چاہے میرے میاں اس بات جتنا بھی چڑ جائیں کہ ایک سے کتاب خرید کر پانچ فقیروں کو پیچھے لگوا لیتی ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے بچے بھی کبھار کوئی بچوں کا میگزین پڑھ لیتے ہیں۔"

"بچوں کی بات آئی تو ماشاءاللہ سے کتنے بچے ہیں اور بتائیں کہ کس نے آپ کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی؟"

"میرے ماشاءاللہ تین بچے ہیں۔ بڑا بیٹا ریان بارہ سال کا ہے۔ بیٹی ردا دس سال کی ہے اور صبحان آٹھ سال کا۔ تینوں بچے پڑھتے ہیں اور ان کی "ماں" ماسی اور ٹیوٹر میں ہی ہوں۔ میرے میاں صاحب کا

WOMEN SKILLS GROUP

نام طاہر ابراہیم ہے اور ان کی ٹریول ایجنسی ہے اور جناب جہاں تک فائدہ اٹھانے کی بات ہے تو میرے بچوں کو ماں کا نام کیش کرانا پسند ہے۔ ان کے ہر گریڈ میں کلاس ٹیچر کو ضرور پتا ہوتا ہے کہ ان کی اماں خواتین اور شعاع والی "عفت سحر" ہیں۔ ہاں میرا بیٹا ریان ایسے کام نہیں کرتا کیونکہ وہ بہت شرمیلا ہے۔

میری بھانجی حریمہ نے میرے نام کو اپنی ٹیچرز سے بہت کیش کرایا۔ اس نے تمام پیپرز میں ٹیچرز کو میرے ناول پڑھنے کے لیے دیے۔ تحریم بھی خوش ہوتی ہے کہ کالج کی دوستیں اس سے حیران ہو کر پوچھتی ہیں کہ عفت سحر واقعی تمہاری خالہ ہیں۔"

"عام لوگوں میں پہچانی جاتی ہیں؟"

"ارے نہیں، کیونکہ میں عبایا پہنتی ہوں اور نقاب کرتی ہوں مجھے تو کوئی نہیں پہچانتا۔ ہاں، ایک بار ڈاکٹر کے کلینک میں دوست کی بہن ملی تو وہ میرے ایک ناول کی تعریف کرنے لگی۔ دو چار لڑکیاں وہاں موجود تھیں، میری طرف کھنچی چلی آئیں کہ کیا نام ہے آپ کا اور کس ڈائجسٹ میں لکھتی ہیں اور جب انہیں بتایا تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔"

"ناولز اور افسانوں کے نام میں کیا سوچ یا لاجک ہوتی ہے؟"

"میں تحریروں کے نام ایسے رکھتی ہوں جیسے کوئی ماں اپنے بچے کا نام رکھتی ہے اور تحریر کے مطابق افسانے اور ناول کے نام ہوتے ہیں۔ کسی بھی فلم یا گانے کے بولوں پر نام نہیں رکھ سکتی۔ جو تحریر کی تھیم ہوتا ہے، اس کے مطابق نام رکھتی ہوں۔"

"لکھنے کے علاوہ سارے گھر کا نظام خود سنبھالتی ہوں۔ الحمدللہ کوکنگ بیکنگ کا بہت شوق ہے۔ بیکری کی کوئی چیز سوائے بریڈ کے میں نہیں منگواتی۔ الحمدللہ بچوں کے لنچ بکس میں روزانہ گھر کا بنا ہوا شوارما، پیٹیز، زنگر، انڈا برگر یا پیزا ہوتا ہے۔ سات سالوں میں میرے بچوں نے اسکول کی کینٹین سے کبھی لنچ نہیں کیا اور یہ سب میں اپنے میاں اور بچوں کی محبت میں کرتی ہوں۔

گھر میں پہننے والے عام کپڑے میں خود سلائی کرتی ہوں۔ اپنے بھی اور ردا کے بھی۔ آپ مجھے کافی حد تک سگھڑ خاتون کہہ سکتے ہیں۔ بہت گھریلو ہوں، گھر سے باہر نکلنا پہاڑ لگتا ہے اور مجھے لونگ ڈرائیو کے دوران بڑے مزے کی نیند آ جاتی ہے۔ میں بالکل انجوائے نہیں کرتی۔ میں گزرے وقت کی باتوں کو بھلا کر موجودہ زندگی اور آج پر یقین رکھتی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو پکڑیں تو وہ بڑی بن جاتی ہیں اور بڑی سے بڑی بات کو نظر انداز کر دیں تو وہ معمولی بن جاتی ہے۔ زندگی گزارنے کا یہی اصول ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری بہت سی کمیاں، کوتاہیاں نظر انداز کر کے ہمارے ساتھ رشتہ نبھا رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے، کہ جانے ہم آپ کی کتنی زیادتیاں اور کوتاہیاں نظر انداز کر کے آپ کے ساتھ چل رہے ہیں۔ رشتوں میں آسانیاں لائیے۔ انہیں بوجھ بنا کر دوسروں پر مت لادیں۔"

"کبھی ایوارڈ ملا؟"

"کبھی جب ہم قاری ہوا کرتے تھے اور ذوالقرنین بھیا کرن شام سجایا کرتے تھے، تب ایوارڈز کا سلسلہ بھی ہوتا تھا۔ ایک رائٹر اپنی ساری عمر ایک ادارے کو دے دیتا ہے، مجھے سب ڈائجسٹ والوں سے گلہ ہے کہ رائٹرز کے لیے کوئی ایوارڈز نہیں رکھے گئے۔ مجھے بھی ابھی تک تو کوئی ایوارڈ نہیں ملا مگر خواتین کا ادارہ پھر سے یہ خوب صورت روایت شروع کریں، پلیز۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"بالکل جی......! میں آخر میں احتل کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ وہ رائٹرز کو ہمہ وقت متحرک رکھتی ہیں اور ان ہی کی کاوش اور محبت ہم سب کو اس ادارے سے جوڑے رکھتی ہے۔ قارئین کی محبت اور یاد آوری کی بھی ممنون ہوں۔ بس کوئی میری سستی کو گولی مار دے تو میں یہ ناول مکمل کر لوں جس کا احتل سے وعدہ کر چکی ہوں۔"

عفت آپ کی محبت کا بھی شکریہ کہ آپ نے ہمارے لیے وقت نکالا۔

☆

آپ نے آ کر کہا تھا حال بدلے گا
بدلیاں چھٹ جائیں گی جب سال بدلے گا
کون ہے جس کو یہاں پر دکھ، پریشانی نہ ہو
اس خلقت کا کیا کبھی حال بدلے گا

حالات جس نہج پر چل رہے ہیں، اس سے تو مشکل ہی لگتا ہے کہ کبھی ہمارا حال بدلے گا۔ لیکن امید کا دوسرا نام زندگی ہے۔ زندگی میں امید، خواب اور خواہشیں نہ ہوں تو وہ زندگی نہیں رہتی۔ انسان بس جیے جاتا ہے، ایسی بے رنگ زندگی جس میں نہ غم کا احساس ہوتا ہے، نہ خوشی کی امنگ جاگتی ہے۔ گزرا وقت خواہ کیسا بھی ہو، کہیں نہ کہیں کچھ سنہری یادیں ضرور جگمگاتی ہیں۔ حال کتنا ہی پریشان کن کیوں نہ ہو، امید کے سہارے انسان ثابت قدمی سے وقت گزار لیتا ہے۔ خواب اور خواہشیں زندگی کو خوش رنگ اور خوش گوار بناتی ہیں۔ زندگی کو سنوارنے کا ڈھنگ سکھاتی ہیں۔ اس بار سروے میں ہم نے اسی حوالے سے سوال کیے ہیں۔ سوالات یہ ہیں:۔

1) اب تک گزری زندگی کا وہ یادگار سال جس سے کوئی سنہری یاد وابستہ ہے؟
2) آنے والے سال سے وابستہ آپ کے خواب، توقعات اور امیدیں؟

ہم نے یہ دونوں سوال اپنی قارئین کی زندگی کے حوالے سے کیے تھے۔ پہلے سوال کے جواب تو قارئین نے بہت اچھے دیے ہیں لیکن دوسرے سوال کو قارئین سمجھ نہیں پائیں اور زیادہ تر نے ملک کے حوالے سے اس سوال کا جواب دیا۔

آیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں:۔

خواب خواہش اور سنہری یادیں

ادارہ

روبینہ شاہد...... کراچی

(1) ایک ایسی یاد جو تلخ بھی ہے اور شیریں بھی، جو سیاہ بادلوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے رم جھم پھوار کے سفر تک لے جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک یاد کہ جب آنکھوں میں نمی اور لب مسکرا اٹھے تھے، اپنے رب کا شکر ادا کرنے کو جی چاہا تھا کہ ہم اسی جگہ سجدہ ریز ہو جائیں۔

کیونکہ غم کے بعد ملنے والی خوشی اور دکھ کے بعد ملنے والا سکھ اور درد کے بعد ملنے والی راحت بندے کو ایسے ہی سرشار کر دیتی ہے۔

یہ یاد اتنی پرانی تو نہیں مگر ہمارے لیے تو کبھی نہ بھولنے والی بن گئی۔ یہ رمضان المبارک تیس مئی 2018ء کی دوپہر تھی۔ جب میری بہن کو کال آئی کہ بابا گھر پر نہیں ہیں۔ صبح گھر سے گئے پھر لوٹ کر نہ آئے۔

میں نے اسے تسلی دی، اب مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس موبائل بھی نہیں تھا۔ کہاں گئے کچھ پتا نہ تھا، افطار تک جگہ جگہ کال کر کے پوچھا گیا۔

افطار کے بعد انہیں پاگلوں کی طرح تلاش کیا، پر ان کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ تین دن گزر گئے انہیں ڈھونڈتے ہوئے کوئی ہسپتال، رشتے دار، دوست احباب نہ چھوڑا، تھانے میں رپورٹ درج کرا دی،

WOMEN SKILLS GROUP

حتیٰ کہ سی پی ایل سی والوں سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بھی معذرت کرلی کہ موبائل نہیں ہے ان کے پاس اس لیے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔

غرض ہر ممکن کوشش کرلی (یہ داستان جو چار دنوں پر محیط ہے۔ لکھنے بیٹھیں تو صفحات کے صفحات بھر جائیں گے مختصراً بیان کررہے ہیں) پمفلٹ بنوا لیے بانٹنے شروع کردیے۔ مگر کچھ پتا نہ چل سکا۔

چوتھے روز دوران سفر ہمیں ڈرائیور نے ایدھی سینٹر جانے کا مشورہ دیا، ہم نے بتایا کہ وہاں بھی دیکھ آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ روزانہ کی بنیاد پر وہاں جائیں اور اندر جاکر خود تلاش کریں تصویر دکھا کر نہ ڈھونڈیں۔

تب میں اور میری بہن ایدھی سینٹر پہنچے، پہلے وارڈ میں قدم رکھتے ہی میری بہن چیخی' وہ رہے بابا۔

جب قریب پہنچے تو چہرہ کوئی اور نکلا اب میری بہن بضد ہوگئی کہ یہ ڈریس تو بابا کا ہے۔ امی نے میرے ساتھ (یہ گرے پینٹ اور وائٹ شرٹ جس پر لائٹ اور ڈارک گرے لائنز تھیں) خریدی تھی۔ (امی کا انتقال ہوچکا تھا اس واقعے سے پہلے ہی اسی لیے بابا بھی اپ سیٹ تھے)

میں نے سمجھایا کہ ایک جیسے کئی ڈریس ہوتے ہیں۔"

ہم نے تمام وارڈز دیکھ لیے تھے اب جو آخری وارڈ رہ گیا تھا وہاں سے چیخنے، چلانے، زور، زور سے قہقہے لگانے اور رونے کی تیز آوازیں باہر تک آرہی تھیں اور گرل سے لگے لوگ دیکھ کر خوف آرہا تھا۔

اسی وارڈ کے قریب پہنچ کر میں نے تصویر دکھائی تو چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا کہ اپنا بندہ خود پہچان لو۔ مگر میں گھبرا رہی تھی' جہاں ڈھیر سارے مرد عجیب عجیب انداز اختیار کیے چیخ چلا رہے تھے۔

چوکیدار نے تسلی دی "میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ اندرونی لاک لگانے لگا، اندر داخل ہوتے ہی میری بہن پر چلائی۔

"باجی' بابا!" میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ تیزی سے دوڑی اور میں اس کے پیچھے لپکی۔

ہم دونوں ہی بھول گئے کہ ابھی ہم یہاں داخل ہوتے ہوئے خوف زدہ تھے۔ بالکل آخری کونے پر میری بہن بابا سے لپٹ کر زاروقطار رو رہی تھی اور میں حق دق بابا کو دیکھ رہی تھی، ہونٹوں پر پپڑیاں، نقاہت زدہ جسم اور ڈارک تربوزی کرتا اور اس پر نیوی بلو گھیر دار شلوار، بابا نے تو ایسا لباس کبھی زیب تن نہ کیا تھا۔

وہ وارڈ یا برآمدہ جہاں بے انتہا شور تھا۔ وہاں کا منظر یک دم تبدیل ہوگیا تھا، ہر آنکھ اس منظر کو دیکھ رہی تھی جب ایک بیٹی باپ کے مل جانے پر زاروقطار رو رہی تھی۔ بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔

چوکیدار کی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔

"بی بی! باہر آجاؤ بابا کو لے کر۔"

"اب ایک آواز نے پوچھا' کون ہوا ہے بابا کی؟"

"بیٹیاں تھیں نا۔ تب ہی لینے آگئیں، بابا خوش نصیب ہے۔ کوئی اسے لینے آگیا ورنہ یہاں تو کوئی ایک دفعہ آجائے تو کوئی نہیں آتا پوچھنے۔"

اور کئی ایسے ہی فقرے اور جملے کانوں نے سنے، پھر کئی آنسو بھری آنکھوں نے ہمیں "اللہ حافظ" کہا۔ مسکراتے لبوں کے ساتھ۔

ساری معلومات لینے کے بعد معلوم ہوا کہ بابا صبح باہر نکلے۔ گرمی بے انتہا تھی' بائیک سے ٹکرا گئے۔ کسی نے عباسی شہید ہسپتال پہنچا دیا، بابا کو کمزوری اور نقاہت تھی۔ کسی نے گھر کا ایڈریس نہ پوچھا اور ایدھی سینٹر پہنچا دیا۔

"ہم نے بابا سے کہا کہ آپ کو تو اپنا پتا بتانا چاہیے تھا۔ تو انہوں نے کہا کہ کوئی پوچھ ہی کب رہا تھا مجھ سے۔"

اس کے بعد کافی دن تک ان کی کیفیت عجیب تھی، علاج کروایا۔ اب ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہیں۔ (ہم نے بہت مختصر لکھا ہے اس طویل یاد کو) بابا کا کھو کر مل جانا' ہمیں تو ایسے ہی لگتا ہے کہ

جیسے تپتے ہوئے صحرا میں شجر سایہ دار مل جائے۔ یہ یاد جہاں آنکھیں نم کرتی ہے' وہیں شکر سے لبریز مسکراہٹ بھی دیتی ہے۔ اپنے رب کا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔ داستان بہت لمبی ہے بہت مختصر لکھا ہے۔ کہ ہم سال 2018ء کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

(2)

روشن آنکھیں دیکھتی ہیں مستقبل کے سنہری خواب اور سنہری خواب بڑھاتے ہیں آنکھوں کی چمک اور آب و تاب عمر رفتہ کے موسم بدلتے رہتے ہیں، مگر خواب ہمیشہ آنکھوں میں سجے رہتے ہیں۔ اور ان کے پورے ہونے کی توقع قائم و دائم رہتی ہے۔ کیونکہ امید کے جگنو جو جھلملاتے ہیں' خواب دیکھنے والی آنکھوں کے آس پاس...... ہماری آنکھوں میں بھی بستا ہے ایک خواب۔

کہ ضرور ایک دن وطن عزیز کا شمار ترقی یافتہ ممالک میں ہوگا۔ تعلیم ہوگی، صحت و صفائی، امن و آشتی ہوگی۔ جہاں پیار ہوگا' ایثار ہوگا۔

یہ خواب پورے ہونے کی توقع بھی ہے' امید بھی اور یقین کامل بھی۔

نوال افضل گھمن...... کراچی

(1)

تجھ سے ناراض نہیں زندگی حیران ہوں میں
تیرے معصوم سوالوں سے پریشان ہوں میں

بے شمار لمحے ایسے ہیں جن سے بہت سی لازوال سنہری یادیں وابستہ ہیں۔ ماضی میں جھانکوں تو قیمتی لمحوں میں اداس کردینے والی یادوں کی دلہن اپنی پازیب کو چھنکاتی ہوئی نیندیں اڑا دیتی ہے۔

2018ء مئی، جون میں عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ والدہ کا ساتھ اور حرم شریف کی راتیں اور مہنگا ترین سکون۔ غلاف کعبہ کا بوسہ کل کائنات ٹھہرا۔

در محمد پر حاضری۔ کاش کوئی قیمتی عطر ہوتا جس سے آنکھیں پاک کرکے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جاتا۔ 2013ء میں محمد طہٰ ابراہیم کی پیدائش اور 2017ء میں عینی کی آمد۔ زندگی کا بہت خوب صورت بچپن کچے آنگن کی مٹی کی خوشبو اور جامن کے درخت کی ٹہنیوں سے ہوتا ہوا لاہور کی تاریخ میں گم ہو کر کراچی کی رونق میں آبسا۔ رب جلیل القدر کا ہزاروں کروڑوں احسان۔

(2)

2019ء آنے والے سال کی دہلیز میں بہت سی امیدوں کے دیے جلائے ہیں۔ رب تعالیٰ ان دیوں کی لو مدھم نہ کرے۔ ویسے ایک شدید اور دیرینہ خواہش ہے لکھاریوں کی لائن میں آنے کی۔ اللہ نیت کو انجام تک پہنچائے۔ (آمین)

ثمینہ اکرم...... بہار کالونی، لیاری

WOMEN SKILLS GROUP

وہ پھر نئے سال کی سرحد پر کھڑے ہیں ہم لوگ
راکھ ہو جائے گا یہ سال بھی، حیرت کیسی؟"

(1)

شکرالحمدللہ! میری اب تک کی زندگی بڑی عزت اور سکون سے گزری ہے، غم اور خوشی ویسے بھی ہر انسان کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ میری اور اکرم کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ میرا بیٹا عبدالمقیت (مومن) حافظ قرآن بن جائے' یہ آرزو پوری ہوئی۔ دو دسمبر 2017ء میں عبدالمقیت کی آمین اور حافظ قرآن بننے کی خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں دور دور سے عزیز و اقارب اور دوست احباب نے اس تقریب میں شرکت کی۔ اتنی رونق' خوشیاں اور گہما گہمی رہی جیسے ہمارے گھر کسی کی شادی ہو رہی ہو...... (ماشاء اللہ)

اس بابرکت اور پروقار تقریب کی خاصیت یہ رہی کہ سال گزرنے کے بعد بھی اس کا سحر کسی کے ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔

سال 2018ء نے ایک اور سنہری یاد میرے دامن میں ڈالی اور میری گڑیا بیٹی غنوئی اکرم کا رشتہ (ماشاء اللہ سے) عزت کے ساتھ اچھے لوگوں میں طے پایا اور نو ستمبر 2018ء کو ایک تقریب میں سادگی سے اس کی منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔ بیٹیاں کیسے آنگن میں کھیلتے کھیلتے اتنی بڑی ہو جاتی ہیں کہ انہیں پرایا کرنے کا دن آ پہنچتا ہے۔

اسی سال یعنی 2018ء میں رب نے ایک اور خوشی مجھے عطا فرمائی۔ میرا چھوٹا بیٹا اسود رحمان بھی حافظ قرآن بن گیا۔ سب سے بڑی حیرت یہ کہ وہ ایک سال اور چند مہینوں میں حافظ بنا۔ (ماشاء اللہ سے) اور ہمیں اس کے حفظ کرنے کا پتا بھی نہ چلا۔

اسود کے حافظ قرآن بننے کی خوشی میں 30 ستمبر کو میں نے اپنے گھر پر مدرسہ تعلیم القرآن کی مسجد کے سب اساتذہ، قاری صاحبان اور امام صاحب کو اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا۔ اور بڑے بڑے صاحب علم، علماء حضرات اور شیخ الحدیث نے میرے گھر آ کر میری عزت و توقیر میں اضافہ کیا۔ اس دن کی خیر و برکت کی وجہ سے کئی دن تک میرا گھر خوشیوں کے حصار میں رہا اور میرے بچوں کی خوشیوں سے جڑے یہ یادگار لمحات، میری زندگی کا حاصل بن گئے۔

میری والدہ مرحومہ نے بہت ضعیف عمری، بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود عمرے کی سعادت حاصل کی اور اللہ کے گھر کا دیدار کیا۔

(2)

"مزا تو تب ہے جب حال بھی بدلے
سال تو ہر سال ہی بدلتا ہے"

آنے والے سال 2019ء سے وابستہ میرے خوابوں میں سرفہرست میرا خواب' میری بیٹی غنوی کے روشن مستقبل کے حوالے سے ہے۔ میری دلاری بیٹی غنوئی اکرم کی شادی میرا، ایک اہم خواب...... جو ان شاء اللہ 2019ء میں شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔

نیا پاکستان بنانے کے لیے اور پاکستان کے نظام میں تبدیلی لانے کے لیے عوام نے عمران خان کو بطور وزیراعظم منتخب کیا ہے۔ پی ٹی آئی کی حکومت کے آنے کے بعد سے ہر طرف "تبدیلی آئی رے" نعرے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ واقعی تبدیلی تو بہت بڑی آئی ہے۔ پاکستان میں غیر یقینی صورت حال۔ معاشی بحران کی خبریں۔ گرتی ہوئی معیشت، مہنگائی، بے روزگاری، ڈالر کی اونچی اڑان اور روز بروز روپے کی گرتی ہوئی قدر و قیمت، معاشی بدحالی اور آئے دن پٹرولیم مصنوعات میں ہوش ربا اضافہ...... یہ سب نئے پاکستان میں ملا ہے اور کیا خوب تبدیلی آئی ہے۔

لوگوں کا روزگار بذریعہ بھاری مشینری کے تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ایک طرف لاکھوں نئے گھر بنانے کا وعدہ...... تو دوسری طرف غریب عوام کے گھر مسمار کر دیے گئے۔ لوگوں کی دکانیں تجاوزات کے نام پر ڈھا دی گئیں۔ کیا یہی نیا پاکستان ہے' کیا یہی تبدیلی ہے جس کا وعدہ عوام سے کیا گیا تھا...... سی این جی اور گیس کی عدم دستیابی...... گیس کا مصنوعی بحران' ان سب عوامل نے مل کر ہم پاکستانیوں کو ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ ایک بے یقینی کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ اس مشکل دور سے کس طرح نکلا جائے؟ کوئی حکمت عملی تو واضح ہو...... پاکستان کسی پلاننگ کے تحت تو چلایا جائے۔ میرا خواب ہے کہ وزیراعظم پاکستان عمران خان نے جو کرپشن سے پاک نئے پاکستان کا وعدہ کیا ہے 2019ء میں وہ وعدہ پورا ہو جائے۔

ہاجرہ عمران خان...... لاہور

(1)

مجھے سروے کے دونوں سوالات بے حد اچھے لگے۔ اسی لیے بے اختیار قلم اٹھا لیا۔ تو جناب پہلا سوال یادوں کے کئی دریچے نیم وا کر گیا۔ ایک خوب صورت یاد جولائی دو ہزار سولہ 2016ء سے جڑی ہوئی ہے۔ جب اپنے چھوٹے سے خاندان کے ہمراہ ناران، کاغان اور جھیل سیف الملوک جانے کا اتفاق ہوا، یہ سفر خطرات اور حسن و خوب صورتی کا امتزاج تھا۔ یہ میری زندگی کا خوب صورت مگر خطرناک ترین سفر رہا، اس کے لیے اپنے ہم سفر خان جی کی بے حد مشکور ہوں جو بے چارے ڈرائیو کرتے رہتے ہیں اور میں حسن کی دلفریبیوں سے پورا پورا حظ اٹھاتی ہوں۔

یہاں ایک تجربہ شیئر کرنا چاہوں گی کہ اسلام

WOMEN SKILLS GROUP

آباد تک موٹروے کا سفر بہت ہی اعلیٰ اور حسین رہا مگر جیسے ہی خیبر پختون خواہ کے موٹروے پر چڑھے، الاماں والحفیظ! مکمل اندھیرا اس پر چاند ستارے بھی غائب، صرف اکا دکا گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس، اس پر راستہ بھول کر کسی اندھیرے قبرستان میں جا نکلنا، ایک ایک لمحہ اب تک یادوں میں محفوظ ہے۔ بہت ہی مشکل سے برھان والی انٹر چینج ملا جس سے ہم ہری پور سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد پہنچے۔ وہ بھی رات کے تین بجے۔ اگلی صبح مانسہرہ کے بعد بالاکوٹ دیکھ کر تو میں مبہوت ہی رہ گئی، کوئی خطہ اس قدر شاداب اور سرسبز ہوسکتا ہے' کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ گہری سبز وادی میں دریائے کنہار اس قدر شان سے بہتا ہے کہ گرد و پیش سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ہم جیسے میدانی (گرم اور خشک) علاقوں کے لوگ جیسے قدرت کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں اور وہیں کہیں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔

سڑک کنارے کھڑے اس ملک کے محنت کش بچے جو کتابیں، بستے چھوڑ کر تازہ چیری، مکئی کے بھٹے اور سونف سپاری بیچ کر اپنے گھر والوں کا معاشی بوجھ بانٹنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ ان گورے گورے بچوں پر بے اختیار پیار آتا ہے۔ سب سے خطرناک ناران سے جھیل سیف الملوک کا سفر رہا جو کہ وہاں دستیاب جیپوں کی مدد سے ممکن ہوتا ہے مگر اللہ اللہ یہ پاکستانی موٹر بائیکرز' خطروں کے کھلاڑی، یہ بھی بلا خوف و خطر اپنی سواریوں پر ان موت کے راستوں سے قدرت کا شاہکار جھیل سیف الملوک تک جا پہنچتے ہیں (بھلا ہو مستنصر حسین تارڑ صاحب کا جن کے سفر نامے اس سفر کا محرک بنے)

بہنوں سے گزارش ہے کہ پریگنینسی کی حالت میں اور کنواری بچیوں کے ساتھ اس سفر سے پرہیز کریں اور بزرگوں کو بھی لے جانے سے احتیاط برتیں۔ البتہ ناران کاغان تک راستے بے حد خوب صورت ہیں۔ یہ سفر میری زندگی کی بہترین یادوں میں سے ایک ہے۔

(2)

جب سے ہاتھ میں قلم تھاما ہے، زندگی خوابوں، امیدوں اور توقعات سے بھر گئی ہے۔ واحد کام جو میں اپنی ذات کے لیے کرتی ہوں۔ میری ذاتی آرزو ہے کہ میں وہ لکھوں جو دنیا میں میرے آنے کے مقصد کا تعین کرے، جسے میں روز حشر اپنے رب کے حضور پیش کرسکوں۔ اردو ادب کے اچھے اچھے شماروں میں اپنا نام دیکھ سکوں، ادب کی دنیا کے لوگ میرا نام اچھے حوالوں سے یاد رکھیں۔

طاہرہ یاسمین......ٹیکسلا کینٹ

کچھ خوشیاں کچھ غم دے کر ٹال گیا
جیون کا اک اور سنہرا سال گیا

اور میری زندگی کی ڈھلتی چھاؤں کے عالم میں گزری خوشیاں آتی جاتی رہیں۔ زیادہ تر افسردہ ہی گزری لیکن زندگی میں تین سنہری یادیں ہیں۔ ایک تو 1994ء یا 95ء کا دور تھا جب میں چودہ سال کی تھی تو خواتین ڈائجسٹ میں پہلی بار میری تحریر شامل ہوئی تھی۔ شب غم کے نام سے اور وہ خوشی کے لمحات میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ ایک گھنٹہ میں خوشی سے روتی رہی اور اس کے بعد شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ پھر اس کے بعد 1996ء اپریل میں جب میری شادی ہوئی۔ بہت سے خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے کوئی میرا اپنا ہے' بہت اپنا ہے' بہت قریب ہے۔ یہ احساس لیے ہوئے میاں جی کے آنگن میں اترنا بھی نہیں بھولتا لیکن ان سے بڑھ کر دو دسمبر 1999ء کا وہ لمحہ میری زندگی کا سنہرا لمحہ' بہت قیمتی لمحہ' جب قدرت نے میرے قدموں کے نیچے جنت دی۔ وہ احساس کبھی نہیں بھول سکتی جب میری ننھی پری فاطمۃ الزہرا نے میری گود میں آنکھیں کھولیں۔ رب کائنات کے اس حسین تحفے کو گلے لگاتے ہوئے تشکر سے آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ لمحات زندگی کے سب سے خوب صورت لمحات تھے۔

(2) آنے والے سال سے وابستہ ہمارے خواب' توقعات اور امیدیں حق ہاہ۔

خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

اللہ کرے آنے والے سال میں ہمیں نیک اور وطن سے محبت کرنے والا حکمران نصیب ہو۔ مہنگائی و بے روزگاری میں پستے ہوئے سفید پوش لوگوں کا انتظار ختم ہو۔

سیما ملک......کراچی

(1) سال 2015ء میرا پسندیدہ سال ہے۔ اس سال جولائی میں ہم سب لوگ اپنے گاؤں اپنے نانا کے گھر جمع ہوئے۔ خالہ کی شادی کے سلسلے میں (ہاہ ہ ہ) اس سال کی کوئی بھی یاد میرے دماغ سے نہیں جاتی' ہم سب کزن اکٹھے تھے۔ وہاں بہت اچھا وقت گزارا ہم نے۔ ہم نے وہاں سرسبز کھیت دیکھے۔ آم کے درخت سے تازہ آم توڑ کر کھائے۔ بہت انجوائے کیا۔

(2) آنے والے سال سے بہت ساری امیدیں اور توقعات ہیں۔ اللہ پاک ہمارے ملک کو ترقی دے۔ خواب یہ ہے کہ اللہ پاک اس آنے والے سال میں ہمیں نیک اولاد سے نوازے۔

ریحانہ اعجاز......کراچی

میری زندگی کے سب سے خوب صورت تین سال جو بہت یادگار ہیں میرے لیے، پہلا جب میرے سب سے بڑے بیٹے "اسامہ بن اعجاز" نے میری گود میں آکر مجھے "ماں" کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا۔ دوسرا جب میری اکلوتی بیٹی "علینہ بنت اعجاز" نے دنیا میں آکر میری جنت مکمل کر ڈالی، تیسرا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

رخسانہ نگار عدنان
مکمل ناول کتابی شکل
میں شائع ہو گیا ہے
قیمت -/500 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

جب میرے سب سے چھوٹے میرے لاڈلے بیٹے ''علی بن اعجاز'' نے آ کر ہمارا گھر، ہماری دنیا مکمل کرتے ہوئے ہمارے گھر کو مزید خوشیوں سے بھر دیا، میں سب کچھ بھول سکتی ہوں لیکن یہ تین یادگار سال بمع دن مہینے اور تاریخ کے کبھی نہیں بھولتی' نہ ہی بھول سکتی ہوں، میرے تینوں بچے ان تین خوب صورت سالوں کی سنہری یاد ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اللہ میرے جگر گوشوں کو سدا سلامت رکھے۔ آمین۔

اس کے بعد اگر میں کہوں کہ میرا کوئی اور یادگار سال تھا ایسا جس سے دیگر بہت سی سنہری یادیں وابستہ ہیں تو وہ 2018ء کا سال ہے جس میں، میں نے نا صرف بے شمار کامیابیاں حاصل کیں بلکہ اسی سال اپریل 2018ء میں صاحب کتاب ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

بہت سے ڈائجسٹوں میں میری تحریروں کو جگہ ملی، بے شمار فورمز، ویب سائٹس' اخبارات، رسائل، جرائد اور میگزین میں نہ صرف میری تحریریں پبلش ہوئیں بلکہ بہت سے انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا۔

(2) آنے والے سال سے ہمیشہ کی طرح بہت سی توقعات وابستہ ہیں، اپنے گھر کی خوشیوں سے بڑھ کر میرے لیے کچھ بھی نہیں' اس لیے میں نے کبھی کسی اور سے کوئی امید نہیں رکھی۔ کبھی کوئی انہونا خواب نہیں دیکھا، کبھی کسی اور سے کوئی توقع نہیں رکھی، میرے خوابوں اور امیدوں کا مرکز میرے بچے ہیں۔ اس آنے والے سال میں اب میرا سب سے بڑا خواب بھی ان شاء اللہ پایہ تکمیل کو پہنچے گا اور وہ ہے میرے لاڈلے بیٹے اسامہ بن اعجاز کے سر پر سہرا سجانے کا خواب۔

بسمہ شانزے پارس نواب......کراچی

(1) اب تک گزری ہوئی زندگی کا یادگار یا سنہرا سال صرف ایک نہیں' تقریباً سارے ہی سال سنہرے تھے کیونکہ بچپن اور لڑکپن کے سال بھلانے والے تو ہوتے نہیں۔

میری زندگی کا سنہرا سال 2010ء رہا کیونکہ اس میں میری پہلی کاوش نونہال (بچوں کا ماہنامہ) میں شائع ہوئی۔

(2) خواب بہت دیکھے۔ پورے بھی ہوئے' ادھورے بھی رہے۔ خواہشیں خوابوں کو جنم دیتی ہیں، خواب پورے نہ ہوں تو دل بھی ٹوٹ جاتا ہے اور یہ بھی تو بہت سے لوگ کہتے ہیں۔

بوجھ لے کر خواہشوں کا آدمی ہلکان ہے
زندگی سادہ ہو جتنی اس قدر آسان ہے

تنزیلہ یوسف......لاہور

(1) سولہ فروری 1999ء کو اسکول کی طرف سے ہرن مینار شیخوپورہ پکنک پر لے جایا گیا تھا۔ میری سال گرہ کا دن تھا اور بہترین سہیلیوں کا ساتھ۔ اسکول کے آخری بہترین ایام میں سے ایک جو میں شاید کبھی نہیں بھلا پاؤں گی۔

(2) میں نے بچوں کے لیے تقریباً دو سال پہلے لکھنا شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔ 2019ء کے حوالے سے میرے خواب ہیں کہ خواتین ڈائجسٹ' شعاع یا کرن میں میرے افسانے بھی قابل اشاعت قرار پائیں۔ امیدیں تو بہت سی ہیں کہ بچوں کے گریڈز مزید بہتر ہو جائیں۔ نمرہ احمد کا ناول جو اختتام کے قریب ہے اس کے بعد وہ لمبی بریک پر جائے بنا اپنے کسی ایسے ہی دلچسپ ناول سے ہم پڑھنے والوں کو انتظار کی زحمت سے بچائیں۔ (اللہ جی انہیں سلامت رکھیں) ایک خواب یہ کہ مجھے کوئی یہ نہ کہے کہ، کیوں لکھتی ہو؟ یا یہ کہ، کیا ملتا ہے لکھ کر؟۔

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ — ماہنامہ شعاع
ماہنامہ کرن — عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

عمیرہ احمد

الف

حسن جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے۔

ایک بچہ تواتر سے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ جواب کا منتظر ہے، ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آ گیا ہے۔

ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ یک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے گرد روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر، اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔

مومنہ سلطان ایک باصلاحیت فنکارہ ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی موقع نہیں ملا ہے۔ انڈسٹری میں ہیروئنیں اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومنہ کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہت بڑا مداح ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومنہ کی ماں ثریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ اب انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومنہ کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ ڈائیلاسس پر ہے۔ گردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومنہ فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔

چھٹی قسط

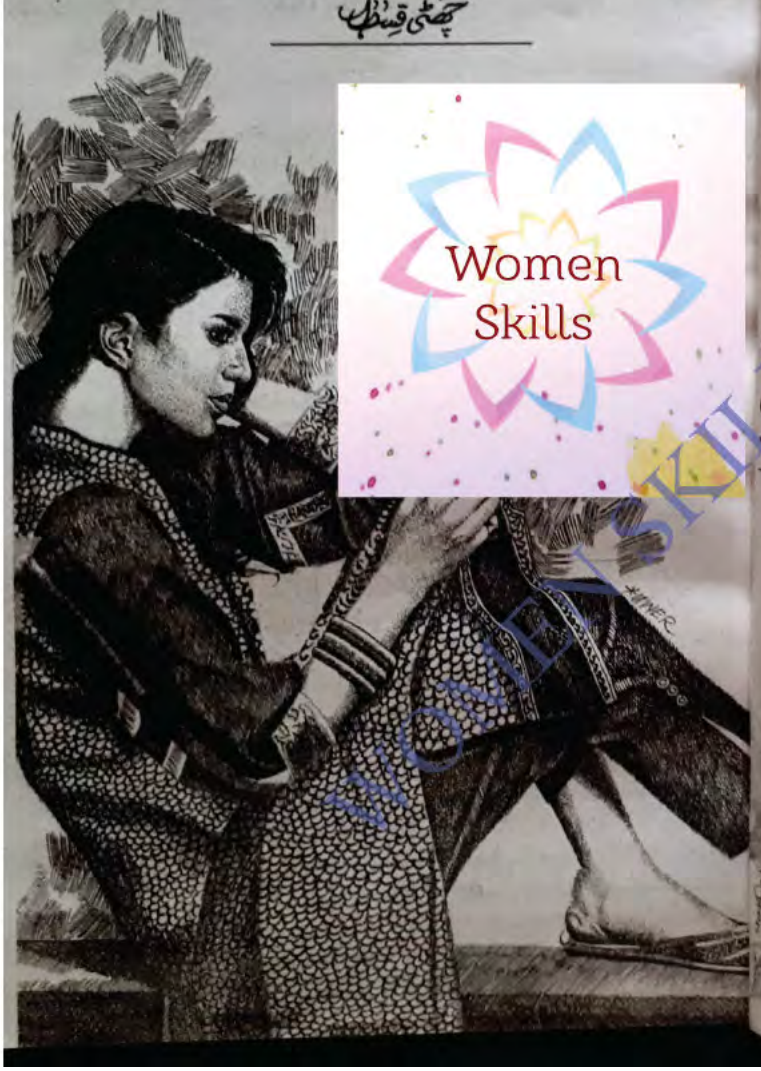

Women Skills
WOMEN SKILLS GROUP

قلب مومن نئی فلم بنانے کا اعلان کرتا ہے تو داؤد مومنہ کی سفارش کرتا ہے۔ وہ آڈیشن کے لیے قلب مومن کے پاس جاتی ہے تو قلب مومن اس کو دوپٹہ اتارنے کے لیے کہتا ہے۔ مومنہ انکار کردیتی ہے تو وہ اسے اسٹوڈیو سے نکل جانے کے لیے کہتا ہے۔ مومنہ باہر نکل جاتی ہے تو اس کو یاد آتا ہے کہ وہ جہانگیر کی میڈیکل ٹیسٹوں کی فائل اسٹوڈیو میں بھول آئی ہے۔ وہ لوٹ کر جاتی ہے تو قلب مومن اس کے ساتھ بہت ہتک آمیز انداز میں پیش آتا ہے جواباً مومنہ بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی اور اسے کھری کھری سنا کر آئینہ دکھا دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تمہارا کام چیپ اور تم اس سے زیادہ چیپ ہو، عورت کا جسم دکھا کر جو تم آرٹ کی خدمت کر رہے ہو، میں اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

طٰہٰ عبدالعلی اپنے باپ کو خط لکھتا ہے اور اس میں معذرت کے ساتھ اپنی تکلیف بھی بیان کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ وہ طٰہٰ کو معاف کریں گے تو ہی اللہ اسے معاف کرے گا۔

قلب مومن کو اس کی ماں ایک خط دیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خط اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ خط پڑھنے پر اسے علم ہوتا ہے کہ یہ خط اللہ نے نہیں اس کے دادا عبدالعلی نے لکھا ہے وہ اس سے ملنے آرہے ہیں۔

حسن جہاں کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر بھی واپس آرہا ہے تو وہ خوب بجتی سنورتی ہے اور بے تحاشا خوش ہوتی ہے۔ قلب مومن اپنی ماں کو اس طرح دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ اور ماں سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے۔

مومنہ کو اس کی ماں سمجھاتی ہے کہ اسے عقل کرنی چاہیے تھی اور یوں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جہانگیر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور سپر اسٹار بنے گی۔ جبکہ مومنہ اداکارہ نہیں بننا چاہتی۔ اسے خطاطی سے دلچسپی ہے۔

مومنہ اپنی انا کو مار کر اپنی دوست سے کہتی ہے کہ وہ ایک بار پھر داؤد سے بات کرلے۔ شاید قلب مومن اسے موقع دے دے، جہانگیر کی دن بدن بگڑتی حالت اسے مجبور کردیتی ہے کہ وہ قلب مومن سے کام مانگے۔

جبکہ دوسری جانب مومن نیہا کو پروپوز کرتا ہے اور ایک بے حد قیمتی انگوٹھی اسے پہناتا ہے۔ قلب مومن کے گھر ہونے والی ایک اور پارٹی میں پوری انڈسٹری مدعو ہوتی ہے۔ لیکن اچانک ملازم کسی نئے مہمان کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جسے دیکھ کر قلب مومن ساکت رہ جاتا ہے۔

قلب مومن اللہ کو خط لکھتا ہے۔

کچھ دن بعد اس سے اس کے دادا ملنے آتے ہیں لیکن باپ نہیں آتا۔ عبدالعلی سے حسن جہاں کو علم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر عبدالعلی کے پاس بھی نہیں گیا۔ عبدالعلی قلب مومن کے لیے ایک پینٹنگ لے کر آتے ہیں جو اُن کے ہاتھ کی بنی ہوتی ہے۔ کچھ دن بعد مومن ان سے نیہا کی ملاقات کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس کی قریبی دوست ہے۔

مومنہ حالات سے مجبور قلب مومن کے پاس جاتی ہے لیکن وہ اسے بے عزت کر کے آفس سے نکال دیتا ہے۔ وہ انتہائی دکھی اور ٹوٹی حالت میں ماسٹر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں وہ شہید قرآن پاک کی مرمت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوتی ہے۔

مومنہ کو اس کی دوست کا فون آتا ہے وہ اسے آڈیشن کے لیے لاہور بھیجتی ہے جہاں اس کا آڈیشن کامیاب ہوجاتا ہے اور اسے ہالی وڈ کی فلم کے لیے سائن کرلیا جاتا ہے۔

قلب مومن اور نیہا کا جھگڑا ہوجاتا ہے جس کی وجہ ضوفی ہے۔ مومنہ کراچی واپس آتی ہے تو اسے داؤد کا رویہ عجیب لگتا ہے وہ گھر کے بجائے اسے مردہ خانہ لے آتا ہے۔

قلب مومن کے دادا حسن جہاں کو خط لکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حسن جہاں کو اسپتال میں داخل کروانا پڑتا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے زندگی کی طرف لوٹتی ہے۔ ٹھیک ہوجانے کے بعد وہ واپس پاکستان آجاتی ہے اپنی ماں کے پاس، قلب مومن سمجھتا ہے کہ وہ لوگ بہت امیر ہوگئے ہیں۔ اب آگے پڑھیے

میری پیاری حسنِ جہاں جی!

آپ کا خط ملا اور دل کٹ گیا۔ وہ بے وفا نکلا نا، میں نے پہلے ہی کہا تھا آپ سے طٰہٰ عبدالعلی پر بھروسا نہ کریں۔ سلطان کی محبت کے سوا کسی پر بھروسا نہ کریں۔ مگر آپ نے ہمیشہ طٰہٰ کے نام کی تسبیح کی۔ سلطان کو آزمایا ہی نہیں۔ میں آپ کا خط پڑھ کر روتا رہا ہوں۔ پرندہ ہوتا تو اُڑ کر آجاتا آپ کے پاس، لیکن انسان ہوں اور انسانوں کو جانے میں لمحہ لگتا ہے، آنے میں وقت لگتا ہے۔ پھر بھی سلطان آئے گا آپ کے پاس، بس چند مہینوں یا ہفتوں کا انتظار کرلیں، اپنے آپ کے اور قلب مومن کے ٹکٹوں کے لیے پیسے جمع کرلوں تو آتا ہوں آپ کے پاس۔

پر میرے آنے تک طٰہٰ کے جانے کا غم نہ کریں آپ، نہ اُس کے لیے آنسو بہائیں، اپنی دنیا میں واپس آجائیں۔ فلم انڈسٹری آج بھی آپ کو ڈھونڈ رہی ہے۔ لوگ آج بھی آپ کو یاد کرتے ہیں، سینما کی اسکرین پر آج بھی کوئی اداکارہ حسنِ جہاں کی طرح دلوں پر راج نہیں کرتی۔ طٰہٰ عبدالعلی نے قدر نہیں کی آپ کی، آپ نے اُس کے لیے اپنی "سلطنت" چھوڑ دی تھی۔ اُس نے پروا نہیں کی تو آپ کب تک پروا کرتی رہیں گی اُس کی۔

جانتا ہوں، دل سے کسی کو بھلانا آسان ہوتا ہے، مٹانا نہیں لیکن میں آپ سے کہتا ہوں آپ نہ اُس کو بھولیں نہ اُس کو مٹائیں، بس اپنی دُنیا میں لوٹ آئیں۔

حسنِ جہاں جی! یہ جو ہم جیسے ہوتے ہیں نا یہ ہمیشہ مٹی کے ہی رہتے ہیں۔ ہمیشہ جسم ہی عروج دیتا ہے ہمیں اور یہی زوال...... ہم روح اور روحانیت کے لیے بنے ہی نہیں ہوتے۔ اُس راستے پر چلنے والے اور ہوتے ہیں۔ اُن کا خمیر بھی اور جگہ سے اُٹھا ہوتا ہے، میں اور آپ زیادہ سے زیادہ نیک ہوسکتے ہیں، اپنی اولادوں کا نام قلب مومن اور مومنہ رکھ سکتے ہیں مگر بس اتنا ہی...... اس سے آگے جائیں تو پر جلنے لگتے ہیں ہمارے اور تپش سہہ نہیں پاتے ہم۔

آپ کو روکا تھا میں نے بہت...... اسی لیے روکا تھا کیونکہ وہاں آگے آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آنا تھا اور جس دُنیا میں آپ تھیں وہاں آپ کا سکہ چلتا تھا۔ آپ نے سلطان کی بات نہیں سنی۔

سکہ بدل گیا ہے اب آپ کے جانے کے بعد یہاں کا...... پر کوئی بات نہیں...... آپ چاہیں تو پھر آپ کا راج ہوگا یہاں اور میں سلطان آپ کے ساتھ ہوں...... اچھے اور بُرے سارے دنوں میں آپ کے ساتھ سایہ بن کر چلوں گا کیونکہ آپ سے پیار کرتا ہوں...... وہی پاگلوں والا پیار جو آپ طٰہٰ سے کرتی ہیں۔ نہ آپ بدلیں گی نہ میں بدلوں گا۔

خط لکھ رہا ہوں تو دل کھول کر رکھ دیا ہے آپ کے سامنے، ورنہ اتنے سالوں میں ہر بار آپ سے بات کرتے ہوئے بھی آپ نظریں چراتی تھیں مجھی میں۔ میں جانتا ہوں سلطان کو آپ بھی بھول نہیں سکیں۔ طٰہٰ کے بعد اگر کوئی یاد آتا ہوگا تو سلطان ہی یاد آتا ہوگا آپ کو۔

میری خوش فہمی دیکھیں، کیا لکھ رہا ہوں آپ کو۔ نہ اپنی شکل دیکھ رہا ہوں۔ نہ اپنی اوقات...... لیکن پیار کا کیا کریں حسنِ جہاں جی، یہ میرے جیسوں کو بھی اوقات سے باہر کردیتا ہے...... سلطان ہی سمجھنے لگ گیا ہوں اپنے آپ کو...... آپ نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر...... بیچ راستے میں مجھے چھوڑ کر...... اتنے سالوں میں سلطان آسمان سے زمین پر آگیا مگر نہیں بدلا تو اُس کے دل میں آپ کا مقام...... آپ آج بھی سلطان کے دل کے تخت پر وہیں بیٹھی ہیں، جہاں اُس نے پہلی بار آپ کو بٹھایا تھا...... اور یہ مقام سلطان کبھی کسی کو نہیں دے گا۔ طٰہٰ اور سلطان میں بس یہی فرق رہے گا ہمیشہ...... وہ آپ کو چھوڑ سکتا ہے، سلطان نہیں۔

آپ کا سلطان۔

☆☆☆

قلب مومن صبح سویرے اپنا سامان پیک کر رہا تھا جب عبدالعلی اُس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اندر آئے تھے اور اُسے سامان پیک کرتے دیکھ کر اُن کا دل کسی دیے کی طرح بجھا تھا۔

"تم جا رہے ہو؟"

"جانے کے لیے ہی آیا تھا دادا۔" قلب مومن اُن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کھلے بیگ میں اپنی چیزیں ڈالتا رہا۔

"ناراض ہو کر جا رہے ہو؟" انہوں نے چند لمحوں کے بعد اُس سے کہا۔ قلب مومن ٹھٹکا اور اُس نے سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے اُن سے کہا۔

"ناراض کس بات پر ہوں گا؟" وہ سنجیدہ تھا۔ عبدالعلی نے اُس کا چہرہ دیکھا۔

"کل رات تمہارے اور میرے درمیان......" انہوں نے کچھ کہنا چاہا، قلب مومن نے بات کاٹ دی۔

"کل رات آپ کے اور میرے درمیان ایسا کچھ نہیں ہوا جس پر میں آپ سے خفا ہوتا، چیلنج تھا جو آپ نے دیا اور میں نے چیلنج قبول کر لیا۔ اس سب میں خفگی والی بات کہاں سے آ گئی؟"

وہ کہہ کر دوبارہ جھک کر اپنے بیگ کی زپ بند کرنے لگا تھا۔ عبدالعلی کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اُس کی بات کے جواب میں کیا کہیں۔ کچھ دیر کھڑے وہ جیسے کوئی الفاظ ڈھونڈتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

"قلب مومن میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ تمہارا دل کبھی بھی دکھانا نہیں چاہتا میں اور مجھے لگا شاید پچھلی رات میں تمہارا دل دُکھا بیٹھا ہوں۔"

انہوں نے بالآخر وہ الفاظ ڈھونڈ لیے تھے جو وہ اُس سے کہنا چاہتے تھے۔ قلب مومن نے اپنی پیکنگ ختم کر لی تھی۔ اپنے بیگز کو ایک طرف اوپر نیچے رکھتے ہوئے اُس نے بے حد اطمینان سے عبدالعلی کی بات سنی، اس کے انداز میں ایک عجیب سرد مہری سی تھی...... لاتعلقی کا ایک عجیب سا عالم تھا۔

"آپ کو پتا ہے دادا......! آپ مجھے کیوں کمتر سمجھتے ہیں؟" اُس کے جملے نے عبدالعلی کو بچھو بن کر کاٹا تھا۔

"آپ مجھے اس لیے کمتر سمجھتے ہیں کیونکہ میں حسنِ جہاں کی اولاد ہوں جس کے پاس حسن اور جسم کے استعمال کے علاوہ کچھ اور تھا ہی نہیں...... آپ اسی لیے اُن سے بابا کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ ایک ڈانسر تھیں۔"

قلب مومن کی آنکھوں اور چہرے پر جیسے "میں سب جانتا ہوں" لکھا تھا۔ عبدالعلی نے تڑپ کر اُسے روکا تھا۔

"حسنِ جہاں سے شادی سے روکنے کی وجہ نہ اُس کا اداکارہ ہونا تھا، نہ رقاصہ ہونا۔ تمہیں کس نے بتایا کہ میں تمہیں اس لیے کمتر سمجھتا ہوں اور کس نے کہہ دیا کہ حسنِ جہاں کے پاس حُسن اور جسم کے علاوہ کچھ اور تھا ہی نہیں؟" عبدالعلی کے انداز میں اب عجیب سی برہمی تھی۔

"اُس کے پاس نیک روح تھی...... جو تم نے کھو دی۔"

قلب مومن اُن کے جملے پر ہنس پڑا۔ "حسنِ جہاں کے پاس تھی...... میں نے کھو دی......" اُس نے اُن کا جملہ استہزائیہ انداز میں دُہرایا تھا۔

"آپ کے نزدیک نیک روح صرف اُن کے پاس ہوتی ہے جو یہ کام چھوڑ دیتے ہیں یا پھر اُن کے پاس جو آپ کی طرح خطاطی کرتے رہتے ہیں...... دادا spirituality (روحانیت) کسی کی میراث نہیں ہے۔" وہ ایک بار پھر اُن سے اُلجھ پڑا تھا۔ پتا نہیں کہاں چوٹ پڑی تھی مومن کو۔

"بے شک نہیں ہے...... مگر اللہ کی عطا ہے اور اللہ اسے صرف اس کی قدر جاننے والوں کو عطا کرتا ہے۔"

قلب مومن انہیں دیکھتا رہا، ایک لاوا تھا جو اُن کے اس جملے پر اُس کے اندر سے پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے عبدالعلی سے نظریں چرا لیں۔ وہ اس بوڑھے شخص کا اتنا احترام کرتا تھا کہ وہ لاوا اُن پر اُلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس لاوے کی وجہ نہیں تھے اور جسے وہ "نیک روح" کہہ رہے تھے، قلب مومن اُسے بھی "جسم" کے علاوہ کچھ ماننے پر تیار ہی نہیں تھا چاہنے کے باوجود بھی۔

"میں چلتا ہوں...... رُکوں گا تو اور بحث ہو گی ہماری......" وہ آگے بڑھا اور اُس نے دادا کو گلے لگایا۔

"جب تم یوں گلے لگاتے ہو تو طٰہٰ یاد آتا ہے مجھے۔"

وہ عبدالعلی کی آواز پر جیسے ٹھٹک گیا تھا، پھر الگ ہوتے ہوئے ہنسا۔

"جانتا ہوں میں...... بابا ہی کے لیے اداس ہوتے ہیں آپ...... میرے لیے کہاں ہوتے ہوں گے۔"

اُس نے اپنا بیگ اُٹھایا اور جیسے وہ عبدالعلی کا جواب سُنے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ عبدالعلی کو رنج ہونا چاہیے تھا۔ وہ رنجیدہ ہونے کے بجائے مسکرائے تھے۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ برف کی طرح سرد نظر آتا تھا، مگر آگ کی طرح گرم تھا، سمندر کی طرح گہرا تھا مگر ریگستان کے سراب کی طرح اشتباہِ نظر کا شکار کرتا تھا۔ قلب مومن تھا، مگر مومن بننے کے راستے سے پرے۔

☆☆☆

"وہ جو لوکیشنز کہی تھیں آپ نے، سب ہی مارک کر لی ہیں اور سب پر ہی کام ہو گیا ہے۔" داؤد اور ٹینا اُسے استنبول میں گزارے پچھلے کچھ دنوں میں کیے جانے والے کام کے بارے میں اپ ڈیٹ دے رہے تھے اور قلب مومن اُس ہوٹل کے لاؤنج میں پڑے ایک صوفہ پر بیٹھا اُن کی باتیں سنتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"استنبول کی نائٹ لائف کی عکاسی کرنے کے لیے نائٹ کلبز کی بھی ریکی کر لی ہے ہم نے۔" اب ٹینا اپنے لیپ ٹاپ پر اُسے اُن جگہوں کی تصویریں دکھانے لگی تھی جو وہ اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے منتخب کر چکے تھے۔ قلب مومن آج ہی عبدالعلی کے پاس سے واپس استنبول آیا تھا اور اس وقت داؤد اور ٹینا کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات تھی۔

"ڈیٹس فائنل کر کے کل سے ای میلو کا کام ختم کر لیں گے، شوٹنگ کو آرڈینیشن کے لیے...... پوسٹ پروڈکشن کا کام بھی یہاں ایک اسٹوڈیو کے ساتھ......"

قلب مومن نے داؤد کو پہلی بار ٹوکا۔

"میں اس فلم کی شوٹنگ کچھ عرصہ کے لیے پوسٹ پون (ملتوی) کر رہا ہوں۔"

اُس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ ٹینا اور داؤد بیک وقت چونکے تھے اور انہوں نے کچھ بے یقینی کے عالم میں اُسے دیکھا، قلب مومن مذاق یقیناً نہیں کر رہا تھا۔

"میں اس فلم سے پہلے ایک اور فلم بنانا چاہتا ہوں کیونکہ میرے پاس ایک بے حد یونیک آئیڈیا ہے۔"

قلب مومن کے اگلے جملے پر ٹینا بے حد ایکسائٹڈ ہوئی تھی۔

"ایک سال میں دو فلمز۔ فنٹاسٹک! میں تو پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ سال میں ایک کے بجائے دو فلمز کرنی چاہئیں آپ کو...... جب انویسٹرز، انویسٹ کرنے کو تیار ہیں۔ برانڈنگ اور پروڈکٹ پلیسمنٹ کے لیے تیار ہیں تو پھر بے وقوفی ہی ہے بس ایک ہی فلم کرتے جانا...... کیا سبجیکٹ ہے دوسری فلم کا؟"

ٹینا جوش و خروش میں بات کرتے کرتے اب سبجیکٹ کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔ داؤد اس ساری گفتگو کے دوران خاموش ہی رہا تھا۔

قلب مومن نے میز پر پڑے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور کہا "اسپرچوئیلٹی"۔

ٹینا چپ ہوگئی۔ داؤد کو پہلے ہی لگی ہوئی تھی۔ مگر وہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

"کیا کہتے ہیں اسے اُردو میں؟"

قلب مومن نے جیسے کچھ اُلجھ کر یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھول گیا تھا، داؤد نے کچھ کہنے کے بجائے لیپ ٹاپ پر گوگل پر اُس لفظ کا اُردو ترجمہ ڈھونڈا اور پھر کہا "روحانیت۔"

"بس اسی کے بارے میں فلم بنانی ہے مجھے۔" قلب مومن نے بے ساختہ کہا۔

"یہ جس کے نام کا مطلب ابھی گوگل سے ڈھونڈا ہے؟" ٹینا نے بے یقینی سے قلب مومن سے پوچھا۔

اُس نے جواباً اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر اس میں دکھائیں گے کیا؟" ٹینا نے بے ساختہ کہا اور اس بار تینوں کو بیک وقت چپ لگ گئی تھی۔

خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد قلب مومن نے جیسے اپنی خجالت مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سوچو۔" وہ کہتے ہوئے اُٹھ کر گیا۔

"باس! یہ میرا آئیڈیا نہیں تھا۔" داؤد نے جیسے کراہتے ہوئے اُسے پکارا تھا، مگر وہ تب تک کافی دور جا چکا تھا۔

☆☆☆

مومن کا اسٹوڈیو ایک بار پھر شوبز کے لوگوں اور جرنلسٹس سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مختلف چینلز کے کیمرہ مین اپنے کیمرے ایڈجسٹ کرنے میں مصروف تھے۔ ان سب کے درمیان مومن کمرے میں داخل ہوا تھا اور سب سے پہلے اُس کی طرف لپک کر آنے والی شیلی تھی، جو آتے ہی اُس کے گلے لگی تھی۔

"اوہ مومن! مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے اس دوسری فلم کا سُن کر...... اس فلم میں، میں ہی لیڈ کروں گی نا۔"

اُس نے الگ ہوتے ہوئے بے حد اٹھلاتے ہوئے مومن سے کہا تھا۔

"بالکل...... وقت کی کمی کی وجہ سے کوئی اور آپشن ڈھونڈنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔" قلب مومن نے بھی اسی انداز میں جواب دیا تھا، مگر شیلی بُرا ماننے کے بجائے ہنسی تھی اور وہ ایک بار پھر مومن کے گلے لگی اور تب ہی مومن کی نظریں عباس پر پڑی تھیں جو اُس کے قریب آ چکا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو مومن بھائی! میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک ہی سال میں آپ کی دونوں فلموں میں ہیرو بننے کا موقع مل رہا ہے مجھے۔"

اُس نے شیلی کے ہٹتے ہی بے حد جذباتی انداز میں کہتے ہوئے مومن کے گلے لگنا ضروری سمجھا تھا۔

"تم نے سب لوگوں کو سب کچھ ہی بتا دیا ہے، میرے انا ؤنس کرنے کے لیے کیا رکھا ہے پھر؟" اُس سے الگ ہوتے ہوئے مومن نے گردن موڑ کر ٹینا اور داؤد کو گھورتے ہوئے کہا تھا جو اُس کے ساتھ چل رہے تھے، وہ جواباً صرف مسکرا کر رہ گئے تھے۔

قلب مومن اب اسٹیج پر اپنی کرسی سنبھال کر مائیک کو ہاتھ سے ٹھیک کرتے ہوئے بات چیت کا آغاز کر چکا تھا۔

"اتنے شارٹ نوٹس پر آپ سب کا یہاں آنے کا شکریہ......" اُس نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا، اسٹوڈیو میں سرگوشیاں ہوئیں۔ کیمروں کی تیز لائٹس میں قلب مومن نے بالآخر وہ سرپرائز دیا جسے دینے کے لیے اس نے اس مجمع کو اکٹھا کیا تھا۔

"یہ فلم میری اب تک کی بنائی ہوئی فلمز سے بالکل مختلف اور منفرد ہوگی کیونکہ اس کا سبجیکٹ بے حد منفرد ہے...... سب سے زیادہ ہائی بجٹ بھی ہوگی کیونکہ میں اسے یادگار بنانا چاہتا ہوں اور کوئی کمپرومائز نہیں کرنا

چاہتا...... میری اس فلم کا سبجیکٹ روحانیت ہے...... روحانی وجود۔"

قلب مومن نے بے حد ڈرامائی انداز میں کہا اور اسٹوڈیو میں یک دم خاموشی چھائی تھی پھر اسٹوڈیو میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔

"مجھے پتا ہے، آپ لوگوں کو ایسا لگا ہوگا جیسے آپ لوگوں کو سننے میں غلطی ہوئی ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ میری یہ فلم واقعی ہی روحانیت کے بارے میں ہوگی۔"

قلب مومن نے جیسے وہاں ہونے والی سرگوشیوں اور چہروں کو پڑھا تھا اور بے حد سنجیدگی سے اُس نے اپنی بات کی وضاحت کرنا شروع کی۔ اُس سے دو نشستیں چھوڑ کر بیٹھی ہوئی شیلی نے ذرا سا جھک کر برابر بیٹھے ہوئے عباس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"یہ نشے میں ہے نا؟"

"سو فیصد نشے میں ہے...... لگتا ہے کوئی نئی ڈرگ اسٹارٹ کی ہے مومن بھائی نے۔" عباس نے بے حد فکرمند انداز میں جواباً شیلی کے کانوں میں کہا۔

وہ دونوں اس بات چیت کے دوران سامنے اسٹوڈیو میں بیٹھے میڈیا انڈسٹری سے منسلک لوگوں کے تاثرات کو بھی دیکھ رہے تھے اور وہ تاثرات کوئی خوش کُن نہیں تھے۔

"آج تک مجھ پر ہمیشہ یہ الزام لگتا رہا ہے کہ میں اپنی فلمز میں ہمیشہ صرف عورت کا وجود پیش کرتا ہوں، میری ہر فلم صرف گلیمر اور ہیروئن کے جسم پر شروع ہو کر وہیں پر ختم ہو جاتی ہے...... میں اس لیبل کو ختم کردوں گا اپنی فلم میں اور میری ہیروئن نہ تو گلیمرس وارڈروب پہنے گی، نہ ہی اُس کے کوئی آئٹم نمبرز ہوں گے...... وہ soul searching (روح کی تلاش) کرے گی...... کچھ بڑے ایشوز کو ہائی لائٹ کرے گی۔"

قلب مومن کہہ رہا تھا اور شیلی کی آنکھیں جیسے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"ہائے عباس میرا تو سر گھوم رہا ہے، یہ قلب مومن کیا کہہ رہا ہے......؟ میرا کوئی ڈانس نہیں ہوگا...... میں گلیمرس کپڑے نہیں پہنوں گی تو میں کروں گی کیا فلم میں؟" اُس نے تقریباً روہانسی ہو کر عباس کے کانوں میں کہا۔

"سول سرچنگ!" عباس نے جواباً مذاق اُڑانے والے انداز میں اُس کے کانوں میں کہا۔

سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے حاضرین اب کرسیوں پر پہلو بدلنے لگے تھے، یوں جیسے مومن کی باتیں اُن کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں...... وہ قلب مومن سے وہ سننے وہاں نہیں آئے تھے، جو وہ سنا رہا تھا۔

"آپ میں سے کوئی بھی اگر اس حوالے سے مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہتا ہو تو کر سکتا ہے۔" قلب مومن نے بالآخر اس مختصر سی تمہید کے بعد سوال و جواب کے سیشن کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھے بٹھائے اسپرچویلیٹی کے موضوع پر فلم اور وہ بھی اُن سارے اسکینڈلز کے بعد جو پچھلے چند ہفتوں سے سوشل میڈیا پر آپ کے حوالے سے آتے رہے ہیں، تو کیا یہ فلم اُن اسکینڈلز کے بعد خراب ہوتے ہوئے آپ کے امیج کو بحال کرنے کی ایک کوشش سمجھی جائے؟"

پہلا سوال ہی پرنٹ میڈیا میں شوبز کو کور کرنے والے ایک تیز و طرار صحافی کی طرف سے آیا تھا اور پہلے سوال نے ہی قلب مومن کے سامنے بے یقینی اور بد اعتمادی کے اُس "کے ٹو" کو دکھا دیا تھا جس کا سامنا اس فلم کی تکمیل کے مراحل میں اُسے ہونے والا تھا۔ وہ صحافی اختر کی طرف سے شروع کی جانے والی قانونی کارروائی اور نیہا کی طرف سے منظر عام پر آنے والی تصویروں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"مجھے اسکینڈلز کی پروا نہیں ہے اور سوشل میڈیا پر آنے والے دو چار اسکینڈلز کسی کو کروڑوں کی ایک فلم بنانے

WOMEN SKILLS GROUP

"پرنہیں اُکساتے۔" قلب مومن نے بے حد روکھے انداز میں کہا تھا۔

"لیکن اسپرچوئیلیٹی کے بارے میں آخر فلم بنانا کیوں چاہتے ہیں آپ..... کیا آپ بھی بہت سے دوسرے مسلمان نوجوانوں کی طرح بورن اگین والے مسلمان ہو گئے ہیں۔" اگلا سوال پہلے سے بھی تند و تیز تھا۔

قلب مومن نے ہنس کر جیسے اُس سوال کی کاٹ کو کم کیا تھا۔

"نہیں نہیں بورن اگین مسلمان والا کوئی چکر نہیں ہے..... میں آج بھی صرف نام کا مسلمان ہوں۔"

اُس کے جملے پر اسٹوڈیوں میں ہلکے قہقہے اُبھرے تھے۔

"اور فنانس کون کرے گا اس فلم کو..... یہ ہے سب سے بڑا سوال؟" ایک اور سوال آیا۔ قلب مومن نے بے حد اطمینان سے پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے بہت سارے برانڈز کے برانڈز مینیجرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے..... آپشنز بے شمار ہیں میرے پاس..... میری پہلی فلم میں میرے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ رہا تھا کہ اتنے سارے برانڈز تھے کہ میرے لیے یہ مشکل ہو رہا تھا کہ میں کس برانڈ کو آن بورڈ لوں اور کس کو نہیں اور یہی صورت حال ہر بار کی طرح اس بار بھی ہو گی۔"

اُس کی خود اعتمادی قابل رشک تھی اور اُن برانڈ مینیجرز کے مسکراتے ہوئے چہروں نے جیسے اُس کو تقویت دی تھی۔ اگلے کچھ سوال۔ سوشل میڈیا پر پھیلائی ان تصویروں کے حوالے سے تھے جن کا جواب دینے سے قلب مومن نے معذرت کر لی تھی۔

پریس کانفرنس ختم ہوتے ہی قلب مومن کا خیال تھا ہمیشہ کی طرح وہاں موجود جرنلسٹس اور میڈیا والے اُسے گھیر لیں گے۔ کرید کرید کر اُس سے اُس فلم کے بارے میں پوچھیں گے..... پہلی بار اُس کے پاس کوئی نہیں آیا تھا، وہاں موجود لوگ اُس ہائی ٹی پر فوکس کیے ہوئے تھے جس کا انتظام کیا گیا تھا..... وہ اُس کے اسٹیج چھوڑنے سے بھی پہلے ہی اپنی نشستوں سے اُٹھ چکے تھے۔

"کسی کے ذہن میں "روحانیت" یا روحانی وجود کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں ہے؟" قلب مومن کو جیسے اُن کے رویے سے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اُنہیں تجسس تھا تو یہ کہ وہ کیوں روحانیت پر فلم کر رہا تھا مگر کسی کو اس بات کی کرید نہیں تھی کہ وہ دکھانا کیا چاہ رہا تھا۔

قلب مومن کا خیال تھا جب وہ جرنلسٹس اور نیوز میڈیا کے نمائندوں کے گھیرے سے نکلے گا تو اُسے ان بڑے بڑے برانڈز کے نمائندے گھیر لیں گے جو اُس کی دوسری فلم کی اناؤنسمنٹ کا سنتے ہی شہد کی مکھیوں کی طرح وہاں آئے تھے، یہ بھی نہیں ہوا تھا۔ پریس کانفرنس کے فوراً بعد اُس کے لیے یہ دوسرا بڑا دھچکا تھا جب اُس نے باری باری اُن سب کو اسٹوڈیو سے نکلتے دیکھا اور اُن میں سے زیادہ تر اُس سے ملے بغیر گئے تھے، یوں جیسے چھپ کے اُس کی نظروں سے اوجھل ہونا چاہتے تھے۔ قلب مومن نے پہلی بار خود ایک انٹرنیشنل برانڈ کے برانڈ مینیجر کو روک کر اس فلم کے حوالے سے فنانسنگ کی بات شروع کی۔

"صنم کب شروع کریں گے آپ؟" اُس برانڈ مینیجر نے جواباً اُس سے کہا تھا۔

"اس فلم کے تقریباً آٹھ دس مہینے کے بعد۔" قلب مومن نے اُسے بتایا۔

"اوہ! ابھی کافی وقت ہے، آئی لو دیٹ اسٹوری۔" اور میرا برانڈ بھی بڑا کین تھا کہ وہ ذرا جلدی آجاتی۔" سوفٹ ڈرنک کا گلاس ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے اُس نے قلب مومن پر اپنی مایوسی ظاہر کی۔

"ہاں وہ تو ڈیفینیٹلی آپ لوگ کریں گے لیکن اگر آپ لوگ چاہیں تو اس فلم میں بھی آجائیں ہمارے

ساتھ۔" قلب مومن نے کہا تھا۔ جواب سیدھا سیدھا آیا تھا۔

"ہمیں یہ پسند ہے مومن لیکن اہم بات یہ ہے..... اس سبجیکٹ کو میرا برانڈ کرے گا کیا؟ آپ جانتے ہیں ہم تو سیل فون بیچتے ہیں تو اس اسپرچوئیلیٹی کی کوئی مطابقت نہیں ہے ہماری پروڈکٹ کے ساتھ..... تو یہ فلم آپ خود کر لیں پھر صنم کے لیے تو وی آر آل گیم....." کاروباری انداز کی صاف گوئی میں اُس برانڈ مینیجر نے اُسے بتایا تھا۔ قلب مومن کو جیسے چند لمحے یقین نہیں آیا کہ یہ جواب اُسے دیا گیا ہے۔

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ میرے پروجیکٹ میں انٹرسٹڈ نہیں ہیں؟" اُس نے بے ساختہ کہا تھا۔

"نہیں نہیں یہ نہیں کہہ رہے ہم..... صرف یہ بتا رہا ہوں کہ یہ فلم ہماری ٹائپ کا پروجیکٹ نہیں ہے..... "صنم" ہے..... تو "صنم" کے لیے ہم کبھی بھی مل کر بات کر لیتے ہیں۔" اُس نے مومن کا بازو ذرا سا تھپک کر اُسی پروفیشنل انداز میں کہا تھا۔

"او۔ کے، لیکن ہو سکتا ہے اس پروجیکٹ کے لیے میں آپ کے بجائے کوئی دوسرا برانڈ دیکھ لوں..... مارکیٹ میں سیل فون بھی تو بڑے ہوتے ہیں..... آپ کا مجھے شاید سوٹ نہیں کرتا..... ایکسکیوز می۔" بڑے تیکھے لہجے میں کہتا ہوا وہ اُس کے پاس سے ہٹا تھا۔ اُس نے اسٹوڈیو میں فلم کی کاسٹ کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ شیلی اور عباس دونوں ہی وہاں نہیں تھے۔

"شیلی اور عباس کہاں ہیں؟" اُس نے اپنی طرف آتی ٹینا سے پوچھا تھا۔

"وہ چلے گئے ہیں، دونوں کو کسی پارٹی میں جانا تھا۔" ٹینا نے اُسے بتایا تھا۔

مومن کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا تھا، وہ رُکے بغیر بڑے اُلجھے انداز میں خالی ہوتے اسٹوڈیو میں سے نکل کر اپنے آفس میں آ گیا تھا اور چند ہی لمحوں میں داؤد اور ٹینا بھی وہاں آ گئے تھے۔

"تو کیسا رہا میڈیا اور برانڈز کا رسپانس؟" قلب مومن نے ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوپ لیس، بالکل ٹھنڈا۔" ٹینا نے بے حد کھلے الفاظ میں اُس سے کہا۔ قلب مومن کے ماتھے پر بل آئے۔

"میرا سوال یہ ہے باس کہ ہم یہ فلم کر ہی کیوں رہے ہیں، جب ہم پہلے ہی ایک فلم کی تیاری کر چکے ہیں، وہ سب کچھ چھوڑ کر ہم یہ نئی فلم کیوں شروع کرنے جا رہے ہیں؟" داؤد نے کچھ تحمل سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"میری مرضی۔ میں جس بھی پروجیکٹ پر کام کرنا چاہوں اور کس کو پہلے کرتا ہوں، کس کو بعد میں..... یہ تم تو مجھے نہیں بتا سکتے۔" وہ اُس پر برسا تھا، داؤد نادم ہوا۔

"اصل میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آج پریس کانفرنس کے بعد شیلی اور عباس بھی بڑے کنفیوزڈ تھے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ ناخوش تھے تو غلط نہیں ہو گا۔ صوفیہ نے بھی مجھ سے کہا کہ وہ اس طرح کی فلم کے ساتھ اپنے لیبل کو منسلک نہیں کرنا چاہتی، اس لیے وہ یہ وارڈروب نہیں کر سکے گی اور برانڈز کا رویہ تو آپ نے خود دیکھ لیا، کسی ایک نے بھی کوئی دل چسپی نہیں لی۔" ٹینا نے کچھ دھیمے انداز میں قلب مومن کو سمجھانے کی کوشش کی، وہ کچھ اور بھڑکا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا.....؟ قلب مومن کے کیریئر کے سب سے بڑے پروجیکٹ میں کسی برانڈ کو دل چسپی نہیں ہے..... ایکٹرز ناخوش ہیں..... ڈیزائنر کام نہیں کرنا چاہتی۔" وہ بے حد تلخ ہوا تھا۔

"بکواس ہے یہ سب..... میں خود بات کر لوں گا سب سے..... میڈیا کو خریدا جا سکتا ہے، برانڈز کو پروپوزلز اور پریزنٹیشن بنا کر پروجیکٹ کی ویلیو سمجھائی جا سکتی ہے اور کاسٹ کو فلم چاہیے، پیسہ چاہیے..... کام مل جائے گا

WOMEN SKILLS GROUP

"انہیں پھر اور کیا مسئلہ ہے؟" وہ ہتک آمیز انداز میں جیسے اُن کی قابلیت پر سوال اُٹھا رہا تھا۔

"مسئلہ روحانیت ہے مومن...... ان سب لوگوں کو آپ سے روحانیت نہیں چاہیے۔" ٹینا نے اُسے کچھ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"پھر کیا چاہیے مجھ سے؟" مومن کا چہرہ سُرخ ہوا۔

"وہی چیز جس کے لیے آپ مشہور ہیں...... گلیمر...... انٹرٹینمنٹ...... مختصر لفظوں میں مسالہ......" ٹینا نے کہا۔

"ان لوگوں کو ایک ہٹ فلم چاہیے اور مومن کی ہر فلم ہٹ ہوئی ہے اب تک...... وہ جانتے نہیں کیا میرا کیرئیر ریکارڈ؟"

وہ دوبارہ ٹینا پر برسا تھا۔

"انہیں کسی بھی مقام، کیلی بر کے ڈائریکٹر سے روحانیت پر بنائی جانے والی کسی فلم میں دلچسپی نہیں ہے کیونکہ جو کراؤڈ سینما فلم دیکھنے جاتا ہے، وہ تفریح چاہتا ہے، تھرکنا چاہتا ہے، اچھا وقت گزارنا چاہتا ہے...... انہیں کوئی فلسفہ نہیں چاہیے...... سات سو کی ٹکٹ خرید کر انہیں سول سرچنگ نہیں کرنی...... آپ کیوں یہ بات نہیں سمجھ رہے کہ آپ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی کامیابیوں کے ٹریک ریکارڈ کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فلم ہٹ نہیں ہوگی۔ کوئی نہیں جائے گا اسے دیکھنے۔" ٹینا بے حد جذباتی انداز میں کہتی چلی گئی تھی۔

"قلبِ مومن کی فلم فلاپ نہیں ہو سکتی...... میں ہر ایک کو غلط ثابت کروں گا...... جیسے ہمیشہ کرتا آیا ہوں۔"

اُس نے ٹینا کو مزید کچھ بولنے نہیں دیا تھا، وہ اُٹھ کر اپنے آفس سے نکل گیا تھا۔

"مومن بھائی کو کسی سائیکولوجسٹ سے ملنے کی ضرورت ہے...... تمہیں نہیں لگتا؟" داؤد نے اُس کے باہر نکلتے ہی ٹینا سے کہا تھا۔

"ہاں اور عنقریب یہ ضرورت ہمیں بھی پیش آئے گی۔" ٹینا بڑبڑائی تھی۔

☆☆☆

قلبِ مومن تقریباً آدھی رات کو اپنے اپارٹمنٹ میں گھسا تھا۔ وہ ایک بُرا دن تھا۔ ساری ہمت توڑ دینے والا دن لیکن ضد کو جیسے اور پکا کر دینے والا دن۔ وہ جتنے اچھے موڈ میں گھر سے نکلا تھا، اُتنے ہی خراب موڈ میں واپس آیا تھا۔ لاؤنج کا ایل سی ڈی آن کرتے ہوئے وہ بے مقصد چینل سرفنگ کرنے لگا۔ اُس کی نظریں ہر چینل پر جیسے اپنی اُس پریس کانفرنس اور فلم کی اناؤنسمنٹ کی کوریج کا کوئی کلپ دیکھنا چاہتی تھیں...... کوئی تبصرہ...... کوئی بریکنگ نیوز...... کسی بھی لوکل چینل پر قلبِ مومن کے حوالے سے کوئی خبر نہیں تھی۔ پرائم ٹائم نیوز ریوائنڈ کر کر کے دیکھنے کے باوجود بھی۔

قلبِ مومن نے پہلی بار اپنے آپ کو غیر اہم محسوس کیا، یہ آسانی سے جانے والا احساس نہیں تھا۔ اُس نے زیرِ لب کچھ گالیاں بکیں اور کن کو بکی تھیں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا پھر وہ لوکل انٹرٹینمنٹ چینلز سے غیر ملکی چینلز پر آ گیا تھا اور تب ہی اُس نے ایک انڈین چینل پر انٹرٹینمنٹ نیوز میں اسکرین پر مومنہ سلطان کا چہرہ دیکھا۔ نیوز اینکر اُس کی ایک تصویر دکھاتے ہوئے اُس کے حوالے سے خبر دے رہی تھی اور قلبِ مومن نے پلک جھپکنے میں مومنہ کا چہرہ پہچانا تھا۔

"ودیا بالن کی جگہ جس ایکٹریس کو کلف ہیکٹر کی اگلی فلم دی لاسٹ کاز میں کاسٹ کیا گیا ہے وہ کوئی انڈین ایکٹریس نہیں ہے، بلکہ پاکستان سے تعلق رکھنے والی ایک اُبھرتی ہوئی اداکارہ ہیں، مگر پاکستانی میڈیا کو مومنہ سلطان کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں...... مگر جہاں بالکل آخری سے میں ودیا بالن نے پاکستان

جانے سے انکار کر کے اس فلم کو کھویا، وہاں مومنہ سلطان کو ملنے جا رہا ہے ہالی ووڈ میں اُن کا پہلا بڑا بریک۔ اب کیا وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا پاتی ہیں یا نہیں، یہ چند مہینے میں ہی فلم کے پہلے ٹریلر لانچ میں سامنے آ جائے گا۔"

قلبِ مومن چینل بدل نہیں سکا، پریزنٹر اب کوئی اور خبر پڑھ رہی تھی جبکہ وہ فون پر داؤد کو کال کر رہا تھا۔

"تم ایک ایکٹریس کو لائے تھے جس نے بہت بدتمیزی کی تھی میرے ساتھ...... مومنہ سلطان ہی نام تھا نا اُس کا......؟" داؤد کی غنودگی بھری آواز سنتے ہی اُس نے پوچھا تھا۔

"جی مومن بھائی...... ہالی ووڈ فلم کرنے گئی ہوئی ہے وہ آج کل۔" وہ غنودگی کی کیفیت میں بھی قلبِ مومن کو جتائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہاں پر تو دوپٹہ بھی اُتارنے پر تیار نہیں تھی۔ ہالی ووڈ کے لیے سارے اصول بدل گئے ہوں گے اُس کے۔" قلبِ مومن نے مذاق اُڑانے والے انداز میں داؤد سے کہا تھا، یوں جیسے وہ متاثر نہیں ہوا تھا۔

"نہیں مومن بھائی! ایک امریکن بورن پاکستانی کی گونگی بیوی کا رول کر رہی ہے جس کے شوہر پر دہشت گردی کا جھوٹا الزام لگتا ہے اور وہ خودکشی کر لیتا ہے، تو پھر اُس کی بیوی اُس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے قانونی جنگ لڑتی ہے۔" داؤد نے بڑے مدافعانہ انداز میں اُسے پورا رول سنایا یوں جیسے وہ اُس کا دفاع کرنا چاہتا ہو۔

"کافی بکواس رول ہے۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا اور اُس نے فون بند کر دیا۔

ریوائنڈ کر کے اُس نے ایک بار پھر اُسی چینل پر وہ خبر سُنی تھی، اور عجیب سی بے چینی اور جیلسی کا شکار ہوا تھا۔ شاید نہ ہوتا اگر آج اُس نے پہلے ہی یہ پریس کانفرنس نہ بھگتائی ہوتی۔ وہ بہت بڑے بینر کی فلم تھی جس کا حصہ بن کر وہ ہالی ووڈ میں موجود تھی اور قلبِ مومن اس شاک سے جیسے باہر نکلنا چاہتا تھا کہ شاید وہ واقعی ایک بڑے اسٹار کو دریافت کرنے کا سہرا اپنے سر نہیں سجا سکا۔

وہ اُس وقت صرف یہی سوچنا چاہتا تھا کہ مومنہ سلطان ہالی ووڈ میں کام کرے گی، ایک اتفاقی چانس ملنے پر...... اور بس......

اتفاقات روز روز نہیں ہوتے اور نہ ہی مومنہ سلطان کے لیے ہوں گے۔

☆☆☆

مگر قلبِ مومن کی خواہش، توقع اور اندازے کم از کم مومنہ سلطان کے بارے میں بالکل غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ چند سینز کے لیے اُس فلم کا حصہ بنی تھی اور پھر وہ چند سینز ودیا بالن کے اُس رول میں تبدیل ہو گئے تھے جو فلم کے اہم کرداروں میں سے ایک تھا اگرچہ لیڈ نہیں بھی تھا تو...... اور یہ سب کچھ اُس کے امریکہ پہنچنے کے چند دنوں کے اندر اندر ہوا تھا۔ اُس سے فلم کی کاسٹنگ کے وقت دو رولز کے لیے آڈیشن لیا گیا تھا مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُسے اُس دوسرے اہم رول کے لیے ذہن میں رکھ لیا گیا تھا، وہ فلم کے ڈائریکٹر کو آڈیشن میں بھی اس حد تک متاثر کر گئی تھی اور پھر ودیا بالن کے انکار نے جیسے اُس کے لیے سب کچھ بے حد آسان کر دیا تھا۔ وہ سارے فائدہ اور ساری اہمیت اور مراعات جو ودیا بالن کو ملنے والی تھیں، وہ مومنہ سلطان کے حصے میں بیٹھے بٹھائے آ گئی تھیں، خواہش کیے بغیر...... اسنوکر کی میز پر اُس گیند کی طرح جسے پلیئر پاکٹ نہ کر سکنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے اور پھر بھی وہ ایک اتفاقی ہٹ لگنے پر پاکٹ ہو کر اُسے مقابلے کا فاتح بنا دیتی ہے۔

امریکہ میں اپنے نئے کانٹریکٹ پر دستخط کرتے ہوئے وہ اس بار جذباتی نہیں تھی۔ پچھلی بار اس کانٹریکٹ کو سائن کرتے ہوئے وہ ساتویں آسمان پر تھی کیونکہ اُسے جہانگیر کی زندگی دکھنے لگی تھی، اب اُن پیپرز پر جو بھی لکھا ہوا تھا، وہ مومنہ سلطان کی اپنی زندگی کے لیے تھا...... وہ سب کچھ خود اُسے چُن رہا تھا، وہ اسے نہیں۔

WOMEN SKILLS GROUP

وہ فور اسٹار سے فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل کر دی گئی تھی، اُس کے لیے گاڑی مختص ہو گئی تھی۔ شوٹنگ کے لیے اُسے الگ وینٹی وین دے دی گئی تھی اُس کے ساتھ اب ایک پوری ٹیم تھی جو اُس کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ کھانے پینے سے وارڈروب تک، میک اپ سے لے اسکن کیئر اور فٹنس تک...... اور اس سب چکا چوند کے درمیان کبھی کبھار تحسین کرواتے ہوئے اُس کے کانوں میں فیصل کے جملے گونجتے اور اُسے پانی پانی کر دیتے۔

"تم ہاتھوں سے تھوڑا کما رہی ہو، تم تو اپنے چہرے اور جسم سے کما رہی ہو۔"

وہ کیمرہ کے سامنے کھڑے اپنی لائنیں بھول جاتی...... وہ لائنیں جو اُسے اشاروں میں ادا کرنا تھیں، وہ بار بار اُن سارے جملوں کو ذہن سے جھٹک کر بھول جانا چاہتی تھی۔ کچھ بھی یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی وہ اس گونج سے باہر نکلنا چاہتی تھی......

"کوئی بات نہیں...... ایسے بھی سخت لفظ نہیں تھے۔" وہ بار بار دل پر مرہم رکھنے کے لیے دہراتی مگر وہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ لفظ سخت نہیں تھے۔ "کہنے والا" اہم تھا۔ اُس کی زبان سے نکلنے پر وہ خنجر بنے تھے کوئی اور کہتا تو مومنہ دوسری تیسری بار سوچتی تک نہیں۔

اُسے رد کر دینے کی دلیری دکھا دینے کے باوجود جو ہمت وہ اپنے اندر پیدا نہیں کر پائی تھی وہ ثریا اور سلطان کو اس رشتہ کے ختم کر دینے کا انکشاف تھا۔

"تم نے فیصل کو امریکا جانے کا نہیں بتایا؟ وہ گھر آیا تھا۔" ثریا نے اُس کے جانے کے دوسرے دن فیصل کے گھر آنے کی اطلاع امریکہ پہنچنے پر گھر کی جانے والی پہلی کال پر ہی دے دی تھی۔

"بتایا تھا اماں! وہ بھول گیا ہوگا۔" اُس نے ثریا کو ٹالا۔

"ایسے کیسے بھول گیا؟" ثریا کو یقین نہیں آیا۔

"بھولتا ہے وہ۔ بہت شروع سے ہی عادت ہے اُس کی...... اچھا پھر بعد میں فون کروں گی۔" اُس نے کہتے ہوئے لائن کاٹ دی تھی۔

ثریا ماں تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ دو جملے اور بول کر چوروں کی طرح پکڑی جائے۔ وہ یہ انکشاف اُن پر کرنے کے لیے چند دن انتظار کرنا چاہتی تھی مگر اب ہفتے گزر گئے تھے۔ وہ روز سلطان اور ثریا سے بات کرتی تھی۔ وہ روز فیصل کا ذکر کرتے اور وہ خاموشی سے سنتی رہتی، اُس کے بھیجے ہوئے پیسوں سے اُس کے جہیز کی تیاری کی پرجوش انداز میں سُنائی جانے والی خبریں بھی اُس کے بار بار منع کرنے کے باوجود اور پھر یہ گلے بھی کہ اُس کے امریکہ جانے کے بعد سے فیصل نے رابطہ کیا، نہ وہ سلطان اور ثریا کا فون اُٹھاتا ہے۔ اور وہ ہر بار اُن دونوں سے جھوٹ بولتے ہوئے اُنہیں اُس کی مصروفیت اور ٹورز کے قصے سنانے بیٹھ جاتی۔ وہ ہالی ووڈ میں اپنی اداکاری کی قابلیت پر کام کر رہی تھی، اتنی اداکاری تو وہ ماں باپ کے سامنے بھی کر ہی لیتی کہ وہ اُس کی بات پر یقین کرتے۔

"تم سے تو رابطہ کرتا ہے نا؟"

ثریا ہر ایسے موضوع کا اختتام ایک ہی سوال پر کرتی اور وہ بے حد ڈھٹائی سے کہتی "ہاں" اور ثریا کسی بچے کی طرح بہل کر مطمئن ہو جاتی۔

اور ایسی ہی کم ہمتی وہ اقصیٰ کے ساتھ فون پر رابطے میں دکھاتی۔ وہ اُس سے بھی یہ کہہ نہیں پا رہی تھی کہ فیصل اور اُس کے درمیان اب کچھ نہیں رہا۔ اقصیٰ فون پر فیصل کا ذکر چھیڑتی اور مومنہ آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے سوال گول کرتی رہتی۔

کچھ دن کے لیے اس کی زندگی میں ایک پریوں کی کہانی آئی تھی اور وہ اُس سے نکل آنے کے بعد بھی خود سے جڑے ان سب لوگوں کی زندگی کو ویسا ہی رکھنا چاہ رہی تھی...... کہ وہ یہ سمجھتے رہتے کہ اُس کی زندگی میں اب سب اچھا تھا۔ سب ٹھیک تھا۔

اور اس سب کے دوران اُسے براڈوے سے اپنی انڈین ایجنٹ کے ذریعہ پہلی آفر آئی تھی۔ وہ تھیٹر آرٹسٹ نہیں تھی، نہ براڈوے اُس کا خواب تھا، مگر مومنہ سلطان جیسے اب ہر موقع کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ اتنا کام کرنا چاہتی تھی کہ اُس کے پاس کچھ بھی سوچنے کے لیے وقت نہ ہوتا...... مشین کی طرح......

اُس نے براڈوے کا وہ ڈرامہ سائن کر لیا تھا جو امریکہ میں بسنے والے کچھ انڈینز کے بارے میں تھا اور جس دن اُس نے اُس ڈرامے کے لیے کانٹریکٹ سائن کیا تھا اُسی دن اُسی انڈین چینل پر جس پر قلبِ مومن نے مومنہ سلطان کی پہلی فلم کے بارے میں خبر سنی تھی اُسے مومنہ سلطان کے براڈوے پلے کے بارے میں بھی خبر مل گئی تھی......

ہالی ووڈ کے ایک بڑے بینر کے ساتھ کی جانے والی فلم اتفاق ہو سکتی تھی لیکن براڈوے اتفاق تھا تو مومنہ سلطان سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں تھا۔

قلبِ مومن نے ایل سی ڈی پر اُس خبر کو دیکھنے کے بعد مومنہ سلطان کو سوشل میڈیا پر ڈھونڈنا شروع کیا تھا۔ وہ اب لاشعوری انداز میں اُسے کھوج رہا تھا۔

☆☆☆

"ساری دُنیا کی لعنت پڑے گی اُس پر، ناس پیٹا مردود...... بالیاں لے کر بھاگ گیا میری...... کیسے پائی پائی جوڑ کر بنائی تھیں۔"

جھومر نے گلی کے تھڑے پر چوکڑی مارے بیٹھے زار و قطار روتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تالیاں اور گالیاں بیک وقت دے رہا تھا۔ سلطان اُس کے سامنے خاموش بیٹھا آدھ گھنٹے سے اُس کے ساتھ ہونے والے دھوکے کے بارے میں سُن رہا تھا جو اُس کے کسی "محبوب" نے اُس کے ساتھ کیا تھا۔

"جھومر بڑی بد قسمت ہے محبت کے معاملے میں...... اتنا حُسن اور جوانی دے کے بھی اللہ آزما رہا ہے...... بس کر دے میرے مالک! بس کر دے۔" وہ اب گلے میں پڑا ارسی نما دوپٹہ پھیلا کر اللہ سے دہائیاں دینے لگا تھا۔

"جھومر! میرے لیے کوئی کام ڈھونڈ۔" اُس کے رونے دھونے کے بیچ میں سلطان نے اُسے ٹوک کر کہا تھا۔ جھومر نے روتے روتے چند لمحوں کا توقف کیا اور اُس سے کہا۔

"ابھی تو کوئی فنکشن نہیں ہے میرے پاس سلطان بھائی! ملتا ہے کوئی فنکشن مجھے تو آتی ہوں تیرے پاس میک اپ کرانے...... ہائے میری بالیاں...... کتنے تولے کی تھیں۔" اُس نے سلطان کی بات کا جواب دینے کے بعد پھر سے دہائیاں دے کر رونا شروع کر دیا تھا۔

"نہیں جھومر! میک اپ کا کام نہیں...... کوئی اور کام...... سیلز مینی یا چوکیداری کا......" سلطان نے اس بار کچھ جھجکتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

"سیلز مینی میں کھڑا ہونا پڑتا ہے سلطان بھائی! چوکیداری کے لیے بھاگنا پڑتا ہے...... تو دونوں کام نہیں کر سکتا اور وہ کام چھوڑنا کیوں چاہتا ہے، جس سے اللہ تجھے رزق دے رہا ہے؟" جھومر نے حسبِ معمول اپنے رونے دھونے کے بیچ میں توقف کر کے اُس سے سوال و جواب کیے۔

"وہ مومنہ کے سسرال والے بڑے امیر لوگ ہیں۔ اُن لوگوں کو پسند نہیں ہے یہ کام...... میں نے لڑکے سے وعدہ کیا تھا کہ یہ کام چھوڑ دوں گا...... اب اتنے ہفتوں سے کوئی اور کام ڈھونڈ رہا ہوں اور کوئی کام نہیں مل

WOMEN SKILLS GROUP

رہا۔" سلطان نے اپنا مسئلہ بتایا۔ جھومر اپنا رونا دھونا بھول کر یک دم تڑپ اُٹھا، تالی بجاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"کیوں لڑکے کی ماں بہنیں میک اپ نہیں کراتیں...... پارلروں میں جا کر...... امیروں کی عورتیں...... لڑکا نہیں جاتا پارلر...... تو تُو کیوں وعدے کرتا پھر رہا ہے کام چھوڑنے کے...... کام ہے تیرا سلطان بھائی! کام۔" جھومر نے کہا۔

"کر سکتا ہوں یہ ساری باتیں میں بھی جھومر! پر مومنہ کے لیے کر رہا ہوں سب کچھ...... ایک ہی اولاد رہ گئی ہے میری۔ اب اُس کا مستقبل میری اُس قربانی سے سنورتا ہے تو سنور جائے...... اُس نے پہلے ہی بڑی قربانیاں دی ہیں ہمارے لیے۔" سلطان نے بے حد مدھم آواز میں اُس سے کہا۔ جھومر کے غبارے سے مومنہ کے نام پر جیسے ہوا نکل گئی۔

"مومنہ باجی کے لیے کر رہا ہے تو پھر تو ٹھیک ہی ہے، پر وہ تو خود امریکہ گئی ہوئی ہیں فلم کرنے...... وہ چھوڑیں گی فلم؟" جھومر نے تجسس سے پوچھا تھا۔

"آخری فلم ہے یہ اس کی۔ بس پھر گھر بیٹھے گی ان شاء اللہ!" سلطان نے عجب سی خوشی کے ساتھ کہا تھا۔

"آگے پیچھے نوکر پھریں گے اُس کے، راج کرے گی۔" سلطان نے فخریہ انداز میں کہا۔

"تیرے دل کو کچھ نہیں ہوگا وہ ڈبہ ہمیشہ کے لیے بند کرتے جس پر حسنِ جہاں کی تصویر لگا رکھی ہے تُو نے سالوں سے۔"

جھومر نے اُس کی بات سننے کے بعد اُس سے بڑا ٹیڑھا سوال کیا تھا۔

سلطان ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا تھا۔

"دل کا کیا ہے جھومر...... دل کو سمجھا لیتا ہے انسان...... حسنِ جہاں گئی تو سمجھا لیا...... جہانگیر گیا تو سمجھا لیا۔" سلطان نم آنکھوں کے ساتھ عجب سے انداز میں ہنستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

"ایک بُری خبر ہے۔" دروازہ کھول کر اندر آتی ہوئی ٹینا نے کہا تھا۔ قلبِ مومن استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

"ابھی کوئی بُری خبر باقی رہ گئی ہے؟" ٹینا کو اندازہ تھا اُس کا اشارہ اُن اخبارات اور میگزینز کی طرف تھا جنہوں نے یا تو اُس کی پریس کانفرنس کو اٹینڈ کرنے کے باوجود کوریج نہیں دی تھی اور اگر دی تھی تو مذاق اڑانے والے انداز میں۔

"ٹیلی فائن نے صنم کی اسپانسرشپ سے معذرت کر لی ہے۔" ٹینا نے جیسے اُس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

"واٹ؟" قلبِ مومن کو جیسے کرنٹ ہی لگ گیا تھا۔

"احسن کے ساتھ اُس کی فلم کی اسپانسرشپ کے لیے ڈیل سائن کر لی ہے انہوں نے۔" ٹینا نے جیسے ایک اور دھماکا کیا۔

"یہ کر کیسے سکتے ہیں وہ...... میٹنگ کے لیے ٹائم لو اُن سے فوری طور پر۔" قلبِ مومن شدید پریشان ہوا تھا۔

"انہیں اگلے چھ مہینے میں کوئی بڑا پراجیکٹ کرنا تھا اور آپ نے صنم کو ہولڈ پر ڈال دیا تو برانڈ بیک آؤٹ کر گیا۔" ٹینا نے جیسے اُسے برانڈ کے پیچھے ہٹنے کی وجہ بتائی۔

"کر تو رہا ہوں بڑا پراجیکٹ اسی ٹیم کے ساتھ...... اُس سے بڑی پروڈکشن۔" وہ بے حد پریشانی کے عالم میں بولا تھا۔

"وہ مذہب سے ریلیٹڈ کچھ نہیں کرنا چاہتے۔" ٹینا نے کہا۔

"مذہب......؟ یہ روحانیت ہے مذہب کی بات نہیں ہے اور روحانیت تو یونیورسل تھیم ہے۔" وہ جیسے ٹینا کو ہی وہ وضاحتیں دینے لگا تھا جو اُسے شائد برانڈ کو دینی چاہیے تھیں۔

"باس! اُن کے لیے مذہب اور روحانیت ایک ہی چیز ہے۔" ٹینا نے دوٹوک انداز میں اُس سے کہا۔

"کیا ایک ہی چیز؟" قلبِ مومن جھنجھلایا۔

"فنڈامینٹل ازم...... بنیاد پرستی۔" ٹینا نے صاف گوئی سے کہا۔ قلبِ مومن اُس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

"مذاق کر رہی ہو مجھ سے؟"

"یہ سب میں نہیں کہہ رہی اُن کی ٹیم نے مجھ سے کہا ہے۔ انہیں مذہب اور روحانیت کے قریب سے بھی نہیں گزرنا...... وہ اس سے بچنا چاہتے ہیں یہ ٹابو ہے اُن کے برانڈ کے لیے۔" وہ اُسے پھر سمجھانے لگی تھی۔

"آپ دس میٹنگز کر لیں اُن کے ساتھ، اُنہیں فرق نہیں پڑے گا۔ وہ بہت کلیئر ہیں اس معاملے میں۔ کارپوریٹ ورلڈ ہے یہ اور آپ کو پتا ہے کیسے چلتا ہے یہ...... اسی لیے آپ سے کہہ رہی تھی یہ رسک نہ لیں...... بہت بڑا رسک ہے۔"

"قلبِ مومن لے سکتا ہے یہ رسک اور لے گا۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ کروڑوں کی ڈیل ڈوب جانے پر بھی اُسی طرح تھا۔

"میرے پاس اسٹارز ہیں...... پاکستان کی فلم انڈسٹری کے سپر اسٹارز...... کوئی بھی برانڈ آ جائے گا میرے ساتھ...... ٹیلی فائن جائے بھاڑ میں۔" وہ اب غضب ناک ہو رہا تھا۔ ٹینا کچھ دیر خاموش رہی پھر اُس نے مدھم آواز میں اُس سے کہا۔

"اُن اسٹارز سے ایک بار بات کر لیں آپ۔" قلبِ مومن نے نہ سمجھنے والے انداز میں اُس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا بات کر لوں؟" وہ واقعی ہی نہیں سمجھا تھا۔

"کہ کیا وہ فلم کریں گے بھی یا نہیں؟" ٹینا نے اپنے لہجے کو حتی المقدور نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی اُسے اب قلبِ مومن پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ ایک ہی دن میں اُس پر بُری خبروں کا انبار نہیں لادنا چاہتی تھی لیکن شاید قلبِ مومن کے ستارے گردش میں آ گئے تھے یا پھر وہ خود گردش میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

"جان میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ پہلے صنم کو شوٹ کر لیتے ہیں جس پر اتنا کام کر کے رکھا ہے پھر اس فلم پر کام کر لیں گے۔ دیکھو! ابھی تو پری پروڈکشن ہوئی ہے اس فلم کی اور پتا نہیں کیا ہونا ہے۔ اسپریچوئل فلم بنانا آسان تھوڑی ہے۔" ٹینا نے اپنے لہجے کو حتی المقدور شہد بناتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ ٹینا نے شیلی کے اعتراضات قلبِ مومن کو پہنچا دیے تھے اور اب وہ اُس سے مل رہا تھا۔

"ہو جائے گا سب کام...... تم پریشان مت ہو...... میں اُن ہی ڈیٹس میں شوٹ کروں گا جن میں میں نے صنم کو شوٹ کرنا تھا۔ دیر ہوئی بھی تو چند ہفتوں کی ہوگی...... مہینوں پر نہیں جائے گی بات۔" قلبِ مومن نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن صنم کو پہلے شوٹ کر لینے میں اعتراض کیا ہے تمہیں جان؟" شیلی اُس کی تسلی سے جیسے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے شیلی۔ مجھے یہ فلم صنم سے پہلے شوٹ کرنی ہے۔ تمہیں کیوں اعتراض ہے اس پر؟" اس نے جواباً شیلی سے کہا تھا۔

"مجھے نہیں سب ہی کو اعتراض ہے۔ جان ڈیکھو بُرا مت ماننا لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھائے صنم کو ہولڈ پر کیوں ڈال دیا تم نے...... اور پھر ایک ایسی فلم کے لیے...... جان اتنا عجب تجربہ کیوں کر رہے ہو

WOMEN SKILLS GROUP

"تم؟"
قلب مومن اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ شبلی تھی جو اُس سے کسی فلم کے حوالے سے سوال تک نہیں کرتی تھی۔ اعتراض تو دور کی بات تھی، جو قلب مومن کی بنائی گئی ہر چیز میں مفت بھی کام کرنے پر تیار ہو جاتی تھی اور آج وہ اُسے کہہ رہی تھی کہ وہ عجیب تجربے کرنے جا رہا تھا۔

"یہ صرف میرے اعتراض نہیں ہیں۔ عباس کو بھی بڑی شکایتیں ہیں تم سے۔" شبلی اُس کی نظروں سے جیسے کچھ گڑبڑائی تھی اور اُس نے کہا تھا۔

"عباس سے کہہ دینا کہ اُسے زیادہ اعتراض ہے تو نہ کرے وہ کام اور تمہیں اعتراض ہے تو تم بھی سوچ لو۔" قلب مومن کی اب جیسے ہمت جواب دینے لگی تھی۔

"نہیں، وہ اسکرپٹ نہیں ہے اور کہانی کا کوئی آئیڈیا بھی نہیں ہے تو اس لیے کنفیوژن ہے ورنہ یہ تو نہیں کہہ رہے کہ کام نہیں کریں گے جان۔" شبلی اُس کے اکھڑے انداز پر یک دم گڑبڑائی تھی اور اُس نے وضاحت دینے والے انداز میں ایک نیا جواز دینے کی کوشش کی۔ اُس کے سامنے جیسے آگے کنواں، پیچھے کھائی والی صورت حال تھی۔ وہ قلب مومن کو خفا کرتی تو پھر صرف اس فلم سے نہیں، قلب مومن کی آنے والی ہر فلم سے آؤٹ ہوتی۔

"اسکرپٹ پر بیٹھ رہا ہوں اس ہفتے بغیر اسکرپٹ کے فلم نہیں کرتا کوئی...... اتنا اُلو کا پٹھا نہیں ہوں میں۔" قلب مومن نے اُسی جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"اور جب تم روح کی بات کرو گے تو یہ سارے لوگ جنہیں تم دوست اور ساتھی کہتے ہو تمہیں چھوڑ جائیں گے۔" عبدالعلی کے جملے اُسے پچھلے کئی دنوں سے تنگ کر رہے تھے۔

☆☆☆

"چل سلطان! فیصل کی طرف چلنا ہے آج۔" سلطان گھر میں داخل ہوا ہی تھا جب ثریا چادر لپیٹے ہوئے اندر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"کس لیے؟" سلطان حیران ہوا تھا۔

"اتنے ہفتے ہو گئے، کوئی رابطہ نہیں ہوا میرا تو اب دل ہولنے لگا ہے۔" ثریا اُسے اپنی پریشانی بتا رہی تھی۔

"مومنہ کہتی ہے، وہ ملک سے باہر ہے مگر آخر کتنے دن باہر رہنا ہے اُس نے...... آج جائیں گے اُس کے گھر اور اُس کی امی سے مل کر آئیں گے اگر فیصل نہ ملا تو بھی۔" ثریا نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"ہاں، یہ ٹھیک کہا تو نے لیکن مومنہ سے مشورہ نہ کر لیں پہلے۔" سلطان نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن پھر جیسے متامل ہوا۔ "کوئی ضرورت نہیں اس کی...... ہم ماں باپ ہیں، وہ ماں باپ نہیں ہے ہماری...... چل رکشہ پکڑ...... پتا ہے نا تمہارے پاس؟" ثریا نے اُس کی بات پر زیادہ توجہ دینے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف چل دی تھی۔

"ہاں، وہ جس دن اپنی ماں کو لایا تھا تو دے کر گیا تھا...... میرے پاس رکھا ہے...... اندر سے لاتا ہوں۔" سلطان کو یک دم یاد آیا تو وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

"ہاں اور دیکھ پھل اور مٹھائی بھی لینے ہیں راستے میں۔ پہلی بار اُن کے گھر جا رہے ہیں۔" اُس نے جاتے ہوئے سلطان کو ٹوکا۔

"ہاں ہاں وہ تو لیں گے۔ خالی ہاتھ تھوڑی جائیں گے بیٹی کے سسرال۔" سلطان نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹوں بعد وہ نمودار ہوا تو اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور بڑے فاتحانہ انداز میں اُس نے ایک کاغذ ہوا میں لہرایا تھا۔

"مل گیا اُس کا پتا۔" ثریا کا چہرہ بھی چمکا۔ "اور دیکھو چائے پینے نہ بیٹھ جانا...... وہ لوگ تو کھانے کے لیے بھی کہیں گے مگر ہم نے نہیں بیٹھنا...... سمجھے۔" ثریا اب اُس کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے جیسے اُسے سمجھا نہیں رٹوا رہی تھی۔

"ہاں ہاں، جانتا ہوں سب...... بیٹی کا سسرال ہے...... کہاں کچھ کھانے بیٹھوں گا۔ اتنا بھی کم عقل نہ سمجھ تو سلطان کو۔" سلطان نے اُسے جیسے یقین دلایا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اُسے وہاں کس طرح برتاؤ کرنا ہے۔

ایک رکشہ پکڑ کر ڈھیر ساری مٹھائی اور پھل لیتے ہوئے وہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت طے کر کے شہر کے دوسرے کونے میں جب فیصل کے گھر پہنچے تو شام ہو چکی تھی اور فیصل کا گھر برقی قمقموں سے روشن تھا۔ رکشے سے شاپر پکڑے اُترتے ہوئے ثریا اور سلطان نے بڑی حیرت سے اُس گھر کو دیکھا تھا جہاں یقیناً اس وقت کوئی فنکشن ہو رہا تھا۔

"ایڈریس تو یہی بتایا تھا اُس نے۔" سلطان نے کاغذ کے اُس ٹکڑے پر ایڈریس دیکھا اور پھر نیم پلیٹ اور اُس کے برابر میں لکھے ہوئے نمبر کو۔

"یہ گھر پر بتیاں کیوں لگی ہوئی ہیں؟" ثریا کچھ اُلجھی تھی۔

"کوئی پارٹی ہو رہی ہے شاید۔" سلطان نے اندازہ لگایا۔ "غلط پتے پر نہ آ گئے ہوں، پتا دوبارہ دیکھ۔ کوئی پارٹی ہوتی تو ہمیں کیوں نہ بلاتے وہ...... رشتہ دار ہیں اب تو ہم۔" ثریا جیسے بے چین ہوئی تھی۔

"پوچھتا ہوں چوکیدار سے۔" سلطان نے آگے بڑھتے ہوئے گھر کے کھلے دروازے کے پاس کھڑے چوکیدار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ فیصل صاحب کا گھر ہے کیا؟" سلطان نے چوکیدار سے سلام دعا کے بعد کہا۔

"ہاں جی۔ آپ اُن کی شادی میں شریک ہونے آئے ہیں؟" چوکیدار نے جواباً اُن دونوں سے پوچھا۔ سلطان اور ثریا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اُنہیں لگا اُنہیں سننے میں غلط فہمی ہوئی تھی۔

"فیصل کی شادی؟" سلطان نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں جی۔ آج مہندی ہے اُن کی...... آپ چلے جائیں اندر۔"

چوکیدار نے ہاتھ کا اشارہ اندر پورچ کی طرف کرتے ہوئے کہا تھا اور ثریا کے ہاتھ میں پکڑا سیبوں کا شاپر زمین پر گر گیا تھا۔ سلطان کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ فیصل کے گھر کے گیٹ کے باہر ماربل کے سفید فرش پر سرخ سیب ہر طرف لڑھک رہے تھے اور ثریا اور سلطان اُس بقعۂ نور بنے گھر کو حسرت سے دیکھ رہے تھے جو اُن کی بیٹی کا نصیب تھا اور اب کسی اور کا نصیب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"ٹینا اور داؤد نے آپ لوگوں کو بتا دیا ہو گا کہ مجھے کس طرح کا سبجیکٹ چاہیے اس فلم کے لیے۔" قلب مومن نے اُن تین نوجوان اسکرین پلے رائٹرز سے کہا تھا جو اس وقت اُس کے آفس میں اُس کی فلم کے اسکرپٹ اور کہانی کے ون لائنرز ڈسکس کرنے کے لیے آ بیٹھے تھے۔ وہ تینوں فلم انڈسٹری میں نئے نہیں تھے۔ مختلف فلمیں لکھ چکے تھے اور قلب مومن کا خیال تھا، ٹینا اور داؤد کی بریفنگ کے بعد وہ جب اُس کے پاس اس سیشن کے لیے آئیں گے تو بہت سارے آئیڈیاز لے کر آئیں گے اور اب وہ اُن آئیڈیاز کو سننا چاہتا تھا۔

"مجھے اصل میں کوئی ریفرنس چاہیے تھا۔" اُن تین رائٹرز میں سے واحد لڑکی نے تمہید باندھتے ہوئے اپنی وضاحت دی۔

"کیسا ریفرنس؟" قلب مومن نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کسی فلم، کسی کتاب کا ریفرنس...... جس طرح کی کہانی آپ کو چاہیے۔" اُس لڑکی نے مزید کہا۔

"بالکل یہ ہو جائے تو بڑی آسانی ہو جائے گی ہمیں۔" ایک دوسرے رائٹر نے بھی اُس لڑکی کی ہاں میں

WOMEN SKILLS GROUP

ہاں ملاتے ہوئے کہا۔
"کچھ آئیڈیاز لائے تو ہیں ہم لیکن ریفرنس مل جائے تو زیادہ بہتر آئیڈیاز آسکتے ہیں۔" تیسرے رائٹر نے بھی پہلے دونوں رائٹرز کی بات کی تائید کی۔
"لیکن میں چاہوں گا کہ پہلے آپ لوگوں کے آئیڈیاز سنوں...... سمجھ تو سکوں کہ آپ کس فارمیٹ پر سوچ رہے ہیں۔" مومن نے جواباً اُن سے کہا تھا۔ کمرے میں اس وقت اُن تین رائٹرز اور مومن کے ساتھ ٹینا اور داؤد بھی تھے جو اپنے لیپ ٹاپ کھولے اس اسٹوری میٹنگ کے منٹس لے رہے تھے۔
پہلے رائٹر نے مومن کی بات پر اپنا رائٹنگ پیڈ نکال لیا اور اُسے کھولتے ہوئے اُس نے اپنا آئیڈیا ڈسکس کرنا شروع کیا۔
"یہ ایک بڑی روحانی کہانی ہے۔" اُس نے ____ تمہید باندھتے ہوئے باری باری مومن ٹینا اور داؤد کو داد طلب انداز میں دیکھا۔ وہ تینوں بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔
"ایک انتہائی روحانی اور اُتنی ہی کمرشل کہانی۔" رائٹر نے اگلا ڈرامائی جملہ ادا کیا۔ "طوائفوں کے ایک کوٹھے سے کہانی شروع ہوتی ہے۔ دو طوائفوں کا دل ایک سید گھرانے کے خوبرو لڑکے پر......" اس سے پہلے کہ وہ اپنا دوسرا جملہ مکمل کر پاتا قلب مومن نے بے حد سپاٹ لہجے میں اُس کی بات کاٹ دی۔
"نیکسٹ آئیڈیا پلیز۔" رائٹر نے کچھ شرمندہ سا ہو کر صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا میرا خیال تھا یہ آئیڈیا تو ضرور ہی پسند آئے گا آپ کو...... لیکن چلیں، دوسرا سناتا ہوں۔" اُس نے کہتے ہوئے کاغذ پر نظر دوڑائی اور پھر کہنا شروع کیا۔
"ایک مزار پر قوالی ہو رہی ہے اور وہاں ایک لڑکی اپنے محبوب کے لیے منت ماننے آتی ہے۔ اُس لڑکی کا محبوب......"
قلب مومن نے اُسے ایک بار پھر ٹوکا۔ "مجھے روحانی وجود اور روح پر فلم چاہیے۔ یہ روایتی کہانی نہیں چاہیے...... مزار، قوالی، محبوب...... اس میں روحانیت کہاں ہے؟" اُس نے جیسے چیلنج کرنے والے انداز میں رائٹر سے کہا اور وہ جیسے بوکھلا گیا۔
"سوری مومن صاحب اگر آپ بتادیں کہ آپ کو بنیادی طور پر چاہیے کیا کہانی میں تو ہمیں بھی آسانی ہو جائے گی۔"
"بتا تو رہا ہوں کہ مجھے روحانیت چاہیے۔"
"اور روحانیت کیا ہے؟" اس بار اُس رائٹر نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد مومن نے کہا۔
"مجھے اللہ سے تعلق کی کوئی کہانی چاہیے۔"
"اللہ سے تعلق کی وضاحت کر دیں تو ہمیں اور بھی آسانی ہو جائے گی۔" اس بار یہ بات کہنے والا دوسرا رائٹر تھا۔
"اللہ سے تعلق......" مومن کہتے ہوئے گڑبڑایا۔
"ہاں، مطلب اللہ سے تعلق ہے کیا اور وہ کیا روحانیت ہے جو آپ اس کہانی میں چاہتے ہیں۔" اس رائٹر لڑکی کا سوال بالکل واضح تھا، اس کے باوجود مومن صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔
"میں رائٹر نہیں ہوں، آپ رائٹر ہیں۔ آپ لوگوں کو پتا ہونا چاہیے کہ ڈائریکٹر کیا ڈیمانڈ کر رہا ہے۔" وہ کچھ جھنجلا سا گیا تھا۔
"ڈائریکٹرز کے پاس ہمیشہ ریفرنسز ہوتے ہیں جیسے آپ بھی ہمیں فلمز کا بتا کر سمجھاتے ہیں کہ مجھے فلاں فلم

کا وہ والا کردار چاہیے یا حقیقی زندگی کا۔ تو ایسے ہی آپ ہمیں سمجھا دیں کہ روحانیت ہے کیا اور وہ کون سے کردار ہیں جن کی کہانی ہم لکھیں مگر اس سے بھی بڑا سوال ہے کہ اللہ سے تعلق ہے کیا؟" اسی رائٹر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔
قلب مومن نے ان سب کو دیکھا پھر بڑی روانی سے کہنے لگا۔ "روحانیت...... یعنی اللہ سے تعلق...... جیسے......"
وہ بے ربط لفظوں کی گردان کرنے لگا۔
ذہن اور دل کی سلیٹ بیک وقت صاف تھی، وہاں کہیں بھی کچھ لکھا ہی نہیں ہوا تھا جو زبان پر لفظ بن کر آجاتا۔ اس کے باوجود اس کے اندر گنبد کی بازگشت کی طرح وہ لفظ گونج رہے تھے۔ "روحانیت...... یعنی اللہ سے تعلق...... جیسے......"
"روحانی وجود کیا اور اللہ سے تعلق کس جیسا؟" دو سوال تھے اور دونوں کے جواب اس کی ساری قابلیت دینے میں ناکام تھی۔ "جسم" ان سوالوں کے جواب دے ہی نہیں سکتا تھا جب تک وہ روح سے خالی رہتا۔ اس لمحے پہلی بار قلب مومن کو اپنے اندر کا وہ خالی پن محسوس ہوا تھا جو دادا بار بار اس کو بتانے کی کوشش کرتے تھے تو اسے غصہ آتا تھا۔
"تمہارے پاس روح نہیں ہے قلب مومن! تم روحانیت کے بارے میں کیا فلم بناؤ گے۔" دادا نے اس سے کہا تھا۔ "تمہاری روح کو وہ کامیابی کھا گئی ہے جس میں فلاح نہیں ہے۔ دنیا کو چنا ہوا ہے تم نے، سب کچھ دنیا کے لیے، سب کچھ جسم کے لیے۔ روح کیسے نہ مرتی تمہاری۔"
عجیب شاک کے عالم میں ان پانچ لوگوں کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے قلب مومن نے سوچا تھا۔ کیا وہ واقعی روح کے بغیر تھا اور دادا سچ کہتے تھے اور اگر ایسا تھا تو ایسا کب ہوا تھا۔ کوئی تاریخ، کوئی دن، کوئی لمحہ جب وہ صرف جسم رہ گیا تھا۔ اندر سب کچھ خالی، کوئی الجھن تھی جو سلجھ نہیں رہی تھی۔ کوئی آواز، اس کا جواب نہیں دے رہی تھی۔
"آ...... ہم...... اس پر ایک دو دن تک دوبارہ سٹنگ کرتے ہیں، دوبارہ ریفرنس ڈھونڈتا ہوں میں تاکہ آسانی ہو کردار...... کہانی......" اس نے ان سب سے نظریں چراتے ہوئے عجیب بے ربطی سے کہا تھا۔ ٹینا جیسے اس کی مدد کو آئی تھی۔
"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ دوبارہ سٹنگ کرتے ہیں۔ آج یہ تو کلیئر ہو گیا کہ ٹیپیکل، روایتی کہانی نہیں چاہیے، کوئی نئی چیز چاہیے۔ اگلی میٹنگ میں اور بھی وضاحت ہو جائے گی۔"
اس نے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی تھی اور اگلے چند منٹوں میں مومن کا آفس خالی ہو گیا تھا۔ وہ بھی زیادہ دیر وہاں نہیں رکا تھا، اس کا جی ہر چیز سے عجیب انداز میں اچاٹ ہوا تھا۔
اس کا اپارٹمنٹ بھی اسی کی طرح خاموش اور خالی تھا اور یہ احساس قلب مومن کو آج پہلی بار گھر واپس آ کر ہوا تھا۔ وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ اھدنا الصراط المستقیم کی اسی کیلی گرافی کے نیچے مگر آج پہلی بار اس کی پشت اس کیلی گرافی کی طرف نہیں تھی۔ وہ دوسرے صوفے پر تھا۔ اس کیلی گرافی کے بالکل سامنے وہ آیت جیسے اس کو چیلنج کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ عبدالعلی کی مہارت کو سراہ رہا تھا۔ ان کا ہنر اتنا بے عیب تھا جتنا انسانی آنکھ ڈھونڈ سکتی تھی۔
"اللہ سے تعلق؟" وہ سوال پھر اس کے اندر گونجنے لگا تھا۔ "ایسا مشکل سوال تو نہیں تھا کہ اس طرح گونگا ہو جاتا میں یا شاید اس لیے مشکل ہو گیا کہ میرا اور اللہ کا تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ تعلق رہا ہی نہیں۔"

WOMEN SKILLS GROUP

زندگی میں پہلی بار وہ اپنی ذات کے سامنے اعتراف کر رہا تھا۔ وہ بات مان رہا تھا جو وہ دادا کے سامنے ماننے سے انکاری تھا۔

"کیسے ٹوٹا؟"

"کب ٹوٹا؟"

"مجھے کیوں پتا نہیں چلا؟" عجیب شاک اور بے یقینی کے عالم میں وہ اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا اور جواب کہیں نہیں تھا۔

"مومن بھائی!" شکور وہاں آیا تھا اور مومن نے اس کی آواز سنتے ہی بے حد درشتی سے اسے دیکھے بغیر مزید کچھ کہنے سے روکا تھا۔

"کھانا نہیں کھانا مجھے اور تم اب مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔" شکور کچھ نروس سا اس کے سامنے آیا تھا۔

"میں تو بس یہ دینے آیا ہوں مومن بھائی!" اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا سا ڈبا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ جھنجلایا تھا۔

"یہ دادا جی نے بھیجا ہے آج ہی آیا ہے۔ کہہ رہے تھے، آپ کو دے دوں۔" شکور نے ڈرتے ڈرتے میز پر وہ ڈبا رکھا تھا۔

"کھولوں؟" اس نے مومن سے پوچھا۔

"نہیں، میں کھول لوں گا، تم جاؤ۔" مومن نے کہا۔ شکور برق رفتاری سے غائب ہوا۔

مومن کچھ دیر تک میز پر دھرے اس ڈبے کو دیکھتا رہا۔ جس پر اسی خوب صورت، جانی پہچانی موتیوں جیسی لکھائی میں اس کا پورا نام اور پتا لکھا ہوا تھا اور پھر بھیجنے والے کا نام اور پتا......

وہ عبدالعلی کی کوئی خطا طی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی سالگرہ کے علاوہ وہ اسے پچھلے سالوں میں کبھی کوئی خطاطی نہیں دیتے رہے تھے اور خطاطی اس شکل اور سائز کے ڈبے میں ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ قلب مومن نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کیا وہ کچھ بھول گیا تھا دادا کے گھر پر جسے انہوں نے لوٹایا تھا، کچھ یاد نہیں آیا مگر اسے یقین تھا، وہ کوئی بھول کر رہ جانے والی چیز ہی تھی۔ اس نے ڈبے کی پیکنگ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ بڑی احتیاط سے پیک کیا گیا تھا۔ پیکنگ کو ہٹا کر اس نے ڈبا کھول لیا۔ وہ اس کا لیٹر باکس تھا، ہاتھ سے بنا ہوا لکڑی کا ایک بہت پرانا لیٹر باکس۔

قلب مومن لیٹر باکس کو ہاتھ میں پکڑے ساکت رہ گیا تھا۔ وہ سرا جسے وہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا وہ مل گیا تھا۔ روح کو کب مارا تھا۔ اللہ سے تعلق کب ٹوٹا تھا۔ لیٹر باکس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے اس نے اندر دیکھا، وہ خطوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے لفافوں والے خط۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لیٹر باکس کے اندر سے سارے خط نکال کر میز پر ڈھیر کر دیے۔ اس کے ہاتھ کی لکھائی میں ہر لفافے پر اللہ اور اس کا نام لکھا تھا۔

"اللہ کے نام۔"

اللہ کا گھر......

قلب مومن!

قلب مومن نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے یوں جیسے وہ ان کی کپکپاہٹ روکنا چاہتا تھا۔ یادوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لے جا رہا تھا۔ جب وہ ترکی میں تھا تب بھی دادا نے اسے یہ لیٹر باکس ایک رات دکھایا تھا اور اسے دینے کی کوشش کی تھی اور تب اس نے نہ لیٹر باکس کو ہاتھ لگایا تھا نہ خطوں کو...... یوں جیسے وہ ان کو چھوتا تو

پتھر کا ہو جاتا۔

"تمہارے خط اور تمہارا لیٹر باکس ہے قلب مومن!" دادا کو لگا تھا شاید اسے یاد نہیں رہا۔

"جانتا ہوں دادا!" مومن نے بے تاثر چہرے کے ساتھ ان سے کہا تھا۔ "بے وقوف تھا تب میں...... سمجھتا تھا خط لکھوں گا تو اللہ جواب دے گا۔" اس نے دادا کے سامنے جیسے اپنا ہی مذاق اڑایا تھا۔

"کیا نہیں دیا اللہ نے جواب؟ ان خطوں کے بعد ہی تو میں تم سے مل پایا تھا۔" دادا نے بے حد محبت سے اسے ٹوکا تھا۔

"اور میں سمجھا تھا، اللہ واقعی آپ کو کہہ رہا تھا کہ مجھے جواب دیں۔" مومن نے گہرا سانس لے کر تب ان سے کہا، جیسے خود پر افسوس کیا تھا۔

"تم بڑے معصوم تھے مومن! پر کتنی بڑی نیکی کی تھی تم نے یہ خط لکھ کر۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہوگا، تمہارے خط حسن جہاں نے مجھے بھیجے تو مجھے لگا اللہ نے تمہارے ذریعے سے میرے سوالوں کے جواب دے کر میرے دل کی گرہیں کھولی تھیں۔"

وہ رونے لگے تھے اور قلب مومن کی سمجھ میں ان کے یہ آنسو آئے نہ وہ احسان جو وہ اس کو یاد دلا رہے تھے۔

"آپ رو کیوں رہے ہیں؟" وہ عبدالعلی کے آنسو دیکھ کر بے چین ضرور ہوا تھا۔

"یہ تمہارے لیے رکھا ہے میں نے، شاید تمہارے دل کی گرہیں بھی اسی طرح کھول دے جیسی میری کھول دیں۔"

انہوں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ لیٹر باکس اسے تھمانے کی کوشش کی تھی مگر مومن نے ان کے ہاتھ پرے کر دیے تھے۔

"اب کوئی سوال نہیں ہیں میرے اللہ سے...... سب جواب زندگی اور دنیا نے دے دیے ہیں مجھے۔"

وہ کہہ کر ان کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تھا مگر اب جب وہ اس لیٹر باکس اور خطوں کو سامنے رکھے بیٹھا تھا تو اسے لگا دادا نے ٹھیک کہا تھا اور وہ بالکل صحیح وقت پر اس کے پاس آیا تھا جو سوال اللہ ذہن میں ڈالتا ہے، اس کا جواب اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں ہوتا، کسی دنیا، کسی زندگی کے لمحے کے پاس نہیں۔

قلب مومن نے پہلا خط اٹھایا۔ اس لفافے پر پھول اور ستارے بنے ہوئے تھے، بہت سے رنگوں کی پینسلوں سے جن کا رنگ اب پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آئی۔ وہ پھول اس نے حسن جہاں سے بنانے سیکھے تھے اور ستارے ٹیڑھے تھے اور لفافے پر وہ ہمیشہ پھول ایک کونے میں بناتا تھا، ستارے دوسرے کونے میں اور درمیان میں ڈھیر سا فاصلہ...... وہ جیسے اپنے ماں باپ کی تقدیر اور زندگی کاغذ پر کھینچ کر اللہ کے نام بھیجتا رہا تھا۔

"میرے پیارے اللہ!

میرا نام قلب مومن ہے۔ میں آٹھ سال کا ہوں اور اپنی ممی کے ساتھ رہتا ہوں۔"

وہ اس سے آگے نہیں پڑھ پایا اس کی آنکھیں اب بھیگنے لگی تھیں، کوئی فلم تھی جو آنکھوں کے سامنے چلنے لگی تھی۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارا ہوا بچپن، وہ خوب صورت زندگی اور پھر وہ سانحہ......

قلب مومن نے دوسرا خط اٹھایا اس میں اس کی تصویر لگی ہوئی تھی جسے گوند کے ساتھ کاغذ پر چپکایا ہوا تھا۔ یہ وہ تصویر تھی جو اس نے اللہ تعالیٰ کو بھیجی تھی تاکہ وہ اسے پہچان لے۔

قلب مومن تصویر میں نظر آنے والے اس آٹھ سالہ بچے کو یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اسے پہچان ہی نہ پا رہا

WOMENSKILLS GROUP

ہو۔ کیا وہ وہی تھا...... کیا وہ ایمان، یقین اس کا تھا، کیا وہ تحریر اس کی تھی۔ کیا وہ زندگی اس نے گزاری تھی، کیا وہ سارے لفظ، جملے، باتیں اسی قلب مومن کی تھیں۔

کچھ ٹوٹ رہا تھا اس کے اندر، جو بت تھا، طلسم تھا، فریب تھا...... اس کی اپنی ذات، اپنی خودنمائی، خودستائشی، کامیابی کا...... کچھ جڑ رہا تھا اس کے اندر جو وہی ایمان و یقین تھا جو اس کا خاصا تھا، اس کا اثاثہ تھا۔

یہ وہی تعلق تھا جسے وہ کھوئے بیٹھا تھا، اللہ سے بندے کا تعلق...... کیا تھا اللہ سے بندے کا تعلق...... کیا تھا اللہ سے قلب مومن کا تعلق......؟ اور کیوں ٹوٹا تھا؟؟ اس کے پاس اس سوال کا جواب تھا۔ وہ تعلق جس کی وجہ سے جڑا تھا، اسی کی وجہ سے ٹوٹا تھا۔ اس کی ماں حسن جہاں کی وجہ سے۔ اس کی پارسائی نے اسے مومن کیا تھا اس کے گناہ نے اسے کافر۔

اور اس کا وہ گناہ قلب مومن، اللہ اور حسن جہاں کے علاوہ اگر کسی چوتھے اور پانچویں شخص کو پتا تھا تو وہ طٰہٰ تھا یا سلطان یا پھر عبدالعلی۔

☆☆☆

عبدالعلی کیاری میں ایک چھوٹا سا پودا لگا رہے تھے۔ اتنے انہماک اور احتیاط سے کہ انہیں قلب مومن کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ ان کے عقب میں کھڑا ان ننھے ننھے پودوں کو دیکھتا رہا جو انہوں نے کیاری میں لگائے ہوئے تھے۔ کیلی گرافی ان کی پہلی محبت تھی، باغبانی دوسری۔

"اس بار آپ کو میرے آنے کا پتا نہیں چلا۔" بہت دیر خاموشی سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد قلب مومن نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ وہ بری طرح ہڑبڑا کر پلٹے تھے اور پھر جیسے اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

"دروازہ کھلا تھا کیا؟" وہ اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"آپ کا دروازہ تو ہمیشہ ہی کھلا رہتا ہے۔"

مومن نے جواباً مسکراتے ہوئے ان سے الگ ہو کر کہا تھا۔ وہ عجیب سی خوشی سے ہنسے۔

"ہاں، اس بار مجھے تمہارے آنے کا علم نہیں ہو سکا۔ تم ترکی میں شوٹنگ کرنے آئے ہو؟"

انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ جیسے اسے سامنے دیکھ کر باغبانی بھول گئے تھے۔

"نہیں...... لیٹر باکس ملا تھا، اپنے خط پڑھ کر آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

اس نے جواباً دادا سے کہا تھا۔ عبدالعلی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میں اب سارا سامان سنبھالتے سنبھالتے تھکنے لگا ہوں، سوچا جو جس کا اثاثہ ہے، اسے سونپ دوں۔ بہت کچھ اور بھی ہے جو تمہیں سونپنا ہے۔"

انہوں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تھا۔ قلب مومن کا چہرہ انہیں کچھ عجیب لگا تھا، کچھ بدلا ہوا تھا ان نقش و نگار میں۔

"آپ سے جس فلم کا وعدہ کیا تھا، وہ فلم اناؤنس کر آیا ہوں۔" مومن نے انہیں بتایا۔

"مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔" وہ حیران ہوئے۔

وہ دادا کے جملے پر خفا نہیں ہوا تھا، مسکرا دیا تھا۔

"مجھ سے آپ کی توقعات نہ ہونے کے برابر ہیں بس...... آپ ٹھیک کہتے تھے دادا۔"

اس نے عجیب اعترافی سے انداز میں کہا۔

"کیا؟" عبدالعلی حیران ہوئے۔

"مجھے اللہ اور اس کے تعلق کے بارے میں کچھ پتا ہے نہ ہی میں روحانیت کو سمجھتا ہوں۔ کیا مسئلہ ہو گیا

ہے میرے ساتھ۔ آپ کی باتیں میرے ذہن سے نکلی نہیں ہیں۔ آپ نے کبھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں کی تھیں جیسی اب کرنے لگے تھے۔ کیوں دادا؟"

وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔

"میری غلطی تھی۔" عبدالعلی نے جیسے اپنی ندامت کا اظہار کیا۔

"آپ کو پتا ہے اللہ سے میرا تعلق کب ٹوٹا؟"

اس نے رنج کے عالم میں دادا سے کہا تھا۔ "جب مجھے یہ پتا چلا کہ اللہ معاف نہیں کرتا، جواب نہیں دیتا۔ میں اتنے خط لکھتا تھا اللہ کو، اتنے خط...... اتنے خط...... کچھ بدلا ہی نہیں میری زندگی میں۔ سب کچھ برے سے برا ہوتا گیا۔"

وہ رنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"وہ رب تھا اسے قلب مومن کی کچھ تو پروا کرنی چاہیے تھی، ایک انسان کی غلطی تھی اور ہم سب تباہ ہو گئے۔" وہ غم سے کہہ رہا تھا۔

"اللہ معاف کرتا ہے مومن! ہم انسان نہیں کرتے۔ یہ سارے گڑھے جس میں ہم گرتے ہیں، یہ اللہ نے نہیں کھودے، ہمارے کھودے ہوئے ہیں۔ اللہ تو عیب پر پردہ ڈالنے والا ہے، بخشنے والا ہے۔ اس کی سب سے بڑی صفت ہی بندے سے اس کی محبت ہے۔" عبدالعلی اسے سمجھا رہے تھے۔

"پھر میری ماں کو کیوں معاف نہیں کیا اللہ نے؟ میں نے تڑپتے ہوئے دیکھا انہیں۔ معافی مانگتے دیکھا، کیوں اللہ نے میرے باپ کے دل میں رحم نہیں ڈالا میری ماں کے لیے۔ کیا اتنا بڑا گناہ تھا وہ جس کی سزا ہم نسلوں نے کاٹی۔" وہ عجیب تکلیف کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"جانتا ہوں تمہاری ماں گناہ گار نہیں تھی۔ تمہیں پتا ہے معاف کس نے نہیں کیا تھا؟ میں نے...... ضد باندھی تھی اور وہ میری ہی اولاد کو کھا گئی۔ تم سب کی زندگیوں کو برباد کرنے والا میں تھا۔"

عبدالعلی نم آنکھوں کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

"دادا۔"

مومن کی جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ کیا کہہ رہے تھے...... کس طرف اشارہ تھا ان کا...... عبدالعلی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے عقبی لان سے گھر کے اندرونی حصے میں لے گئے تھے۔ اپنے کمرے میں لے جا کر انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اپنی الماری کھول کر وہ لکڑی کی ایک مرصع صندوقچی نکال کر لائے تھے اور اسے ایک میز پر رکھ کر انہوں نے مومن سے کہا۔

"اسے کھولو۔"

مومن نے الجھے ہوئے انداز میں ان کا چہرہ دیکھا ان کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اس نے صندوقچی کا ڈھکن اٹھایا۔ وہ خطوں سے بھری ہوئی تھی اور ان لفافوں کے اوپر لکھا نام دیکھ کر قلب مومن کے دل کی حرکت جیسے ایک لمحہ کے لیے رکی تھی۔ وہ اس کے باپ کی لکھائی تھی اور ان کے نام تھی۔ وہ اتنے سالوں بعد بھی پہلی نظر میں اسے پہچان گیا تھا۔ وہ عبدالعلی کے نام لکھے ہوئے طٰہٰ کے خط تھے۔ ایک لفافہ اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے عبدالعلی کو دیکھا پھر کھلے ہوئے اس لفافے کے اندر سے وہ خط نکالا۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر اس کے باپ کی لکھائی میں ایک مختصر تحریر تھی۔

بابا!

آج قلب مومن پیدا ہوا ہے...... آپ کا پوتا، مجھے قلب مومن کے لیے معاف کر دیں۔

WOMEN SKILLS GROUP

☆☆☆

''اتنا بڑا دھوکا کیا ہے فیصل نے ہمارے اور ہماری بیٹی کے ساتھ...... اگر شادی نہیں کرسکتا تھا تو یہ سب ڈھونگ کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔''

ثریا روئے جا رہی تھی مگر سلطان گم صم بیٹھا تھا۔ وہ دونوں فیصل کے گھر کے دروازے سے ہی لوٹ آئے تھے۔ غم سے نڈھال...... گھر میں داخل ہوتے ہی ثریا وہ دوپٹہ پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جس پر مومنہ کے نکاح کے لیے خود کام بنا رہی تھی۔ سلمیٰ ستارہ اور گوٹا کناری کے ساتھ۔

''ابھی تو اچھے دنوں کا سوچا ہی تھا اور میری بیٹی تو......''

سلطان نے مدھم آواز میں ثریا کی بات کاٹ دی تھی۔

''وہ جانتی ہے یہ سب ثریا...... میرا دل کہتا ہے، وہ جانتی ہے۔''

ثریا اس کی بات پر جیسے روتے روتے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''یہ کیسے ممکن ہے سلطان! کہ وہ یہ سب جانتی ہو اور ہم سے جھوٹ بولے۔'' اسے یقین نہیں آیا۔ ''اور ہم سے چھپائے گی کیوں؟ اتنا بڑا غم کیوں جھیلے گی اکیلے''

سلطان نے عجیب سے انداز میں اس سے کہا۔ ''مومنہ ہے نا اس لیے۔''

☆☆☆

تھکن گہری تھی مگر نیند تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور خاموشی تھی کہ جانے کا نام نہیں لے رہی تھی اور اس سب کے بیچوں بیچ رات کے اس پچھلے پہر شوٹنگ سے واپسی پر مومنہ سلطان اپنے کمرے کے وسط میں قالین پر چوکڑی مارے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے میک اپ کے سامان کا وہ پاؤچ تھا جس میں لپ پینسلز تھیں۔ ہوٹل کے اس کمرے میں پڑے ڈیسک پر موجود ڈرائنگ پیڈ کے A4 کاغذ کو قالین پر رکھے میک اپ کی ان پینسلز کو بکھرائے وہ اس کاغذ پر خطاطی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ایک نام لکھ رہی تھی اور اس میں محو تھی۔ امریکہ میں کام کے دباؤ، گھر سے دوری کی اداسی اور تنہائی کے اس احساس کو ختم کردینے کے لیے اس کے پاس یہ واحد علاج تھا جو وہ کر رہی تھی۔ میک اپ کے سامان سے خطاطی اور ڈرائنگ کرنا اس کی بچپن کی عادات میں شامل تھا اور وہ عادت اب تک چلی آ رہی تھی۔

آج تنہائی کچھ سوا تھی اور دماغ جسم کے تھک کر ٹوٹنے کے باوجود سونے پر تیار نہیں تھا اور یہ کیفیت امریکہ میں اس کی روٹین بن گئی تھی اور پھر وہ اسی طرح رنگ اپنے گرد بکھرائے اللہ کا کوئی نام لکھنے لگتی۔ آج اس نے امریکہ میں ہی ہالی ووڈ کی ایک اور فلم سائن کرلی تھی۔ ایک ورلڈ سینما فلم...... اپنی ایجنٹ کے ساتھ کانٹریکٹ کیا تھا۔ ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں پبلک آگہی کی ایک مہم کے لیے اقوام متحدہ کی ایک ذیلی تنظیم کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور یہ سب اس کی پہلی فلم کی ریلیز اور شوٹنگ ختم ہونے سے پہلے ہو رہا تھا۔ اس کا اگلا پورا سال کام کے حوالے سے ٹائم لائنز میں بٹا ہوا تھا اور اس کے پاس فی الحال کچھ نیا سائن کرنے اور ڈیٹس دینے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں اب پیسہ بغیر کسی جتن کے آنے لگا تھا اور ٹھہرنے لگا تھا اور اس سب کے بیچوں بیچ مومنہ سلطان خوشی سے محروم تھی۔ اس رات کاغذ پر ایک لپ پینسل سے اللہ کا نام لکھتے ہوئے اسے حسن جہاں یاد آئی تھی۔ وہ کئی بار اس کے پرس کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس کے میک اپ کا سامان بھی اسی طرح کھول کر بیٹھ جاتی تھی جب سلطان اس کا میک اپ کر رہا ہوتا۔ سلطان اسے ٹوکتا اور حسن جہاں سلطان کو روک دیتی۔

اسے یاد آیا تھا۔ پہلی بار اس کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کے نام کی خطاطی کروانے والی حسن جہاں ہی تھی۔ وہ اسی کا شوق تھا جو مومنہ سلطان کے اندر پنپنے لگا تھا اور وہ اس کے میک اپ کے سامان کے ساتھ خطاطی کرنا شروع ہوئی

اور حسن جہاں ہنسنے لگتی۔ سلطان سے کہتی۔

''تمہاری بیٹی کس چیز سے کیا لکھ رہی ہے...... کیا بنا رہی ہے۔''

''بے وقوف ہے۔''

سلطان مدافعانہ انداز میں کہتا اور اسے ڈانٹتا۔

''بے وقوف نہیں ہے سلطان! عقل مند ہے بس اللہ اسے نصیب والا کرے۔''

سلطان بے اختیار آمین کہتا۔

''اور اسے کبھی اداکارہ نہ بنائے۔''

حسن جہاں کہتی اور سلطان اس پر بھی آمین کہتا۔

وہ اس کم عمری میں بھی حسن جہاں کا چہرہ دیکھتی اسے جانچنے کی کوشش کرتی رہتی کہ وہ اس کے بارے میں کیا کہہ رہی تھی۔ اور اب وہ اداکارہ کا نصیب لیے بیٹھی حسن جہاں کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کے ہر دوسرے جملے میں اس نے زوال کا لفظ سنا تھا اور اس نے ہمیشہ حیران ہو کر سوچا تھا کہ وہ زوال کیا چیز تھی جس سے اس کا باپ ڈرتا تھا۔ اور جو حسن جہاں پر آ گیا تھا اور اب جب وہ عروج کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ رہی تھی تو اسے پہلی بار کسی بازگشت کی طرح حسن جہاں کی کہی گئی بات یاد آئی تھی۔

''جھرّیاں نہیں زوال ہے سلطان...... چہرے سے پہلے لوگوں کے دلوں اور آنکھوں میں آتا ہے۔''

یک دم مومنہ سلطان کو باپ کی یاد آئی تھی۔ فون اٹھا کر اس نے سلطان کو کال کی تھی، اس بات سے بے خبر کہ وہ اب وہ راز جانتے تھے جو وہ چھپائے پھر رہی تھی۔

''مومنہ کیسی ہو بیٹا......؟''

پہلی گھنٹی کے بعد ہی سلطان نے فون اٹھا لیا تھا اور اس سے پوچھا تھا۔ کچھ دیر دونوں گھر، ثریا اور کام کے حوالے سے بات کرتے رہے۔ سلطان چاہنے کے باوجود اس سے فیصل کی بات نہیں کرسکا مگر اس کے لہجے میں اس نے فیصل کے حوالے سے کچھ کھوجنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔

''ابا! آپ نے مجھے کبھی حسن جہاں کے بارے میں نہیں بتایا۔''

چند لمحوں کی گفتگو کے بعد جب سلطان اس سے فیصل کے بارے میں پوچھنے کی ہمت پیدا کر رہا تھا، اس نے خلاف توقع حسن جہاں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا۔

''کیا نہیں بتایا مومنہ...... سب کچھ تو بتایا ہے۔''

''صرف اس کے عروج کا بتایا ہے۔ زوال کا تو نہیں بتایا...... کیسے آیا تھا زوال اس پر...... کیوں آیا تھا؟''

وہ کرید رہی تھی۔

''پیار مار گیا تھا اسے...... ورنہ حسن جہاں کے سامنے ٹھہرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا تھا۔''

سلطان نے ایک گہرا سانس لیا۔

''بے وفائی کی ہوگی۔ اس نے جس سے اس نے پیار کیا۔''

مومنہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''بے وفائی کرتا تو سہہ جاتی حسن جہاں...... اس کی وفا نہیں سہہ سکی...... بس غلطی کر بیٹھی ایک۔''

اس نے آہ بھر کر کہا تھا۔

''کیا غلطی ابا؟'' مومنہ نے پوچھا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

WOMEN SKILLS GROUP

ابی کی بٹیا

میمونہ صدف

"زر...... مین...... ب...... ب...... بٹیا......"

ابا کی فالج زدہ زبان سے بمشکل یہ لفظ ادا ہوئے تھے۔ انہیں سوپ پلاتے، ساتھ ساتھ ٹشو سے ان کا منہ صاف کرتے ہوئے وہ وہیں گنگ ہو گئی تھی۔ بت بنی وہ یک ٹک اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ وقت ٹھہر گیا تھا یا نہیں لیکن وہ اور اس کا دل بے ترتیب ہو گئے تھے۔

"کیا کہا ابا...... کیا کہا ابھی آپ نے...... بیٹی کہا......"

اس کا حلق آنسوؤں سے بھر گیا تھا۔ الفاظ کو یکجا کر کے ادا کرنے میں اسے بہت وقت لگا تھا۔ زندگی کے ان چالیس سالوں میں کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہوگا کہ انھوں نے اسے کبھی بیٹی، بیٹا یا بٹیا جیسے کسی کلمۂ محبت سے نوازا ہوگا...... ساری حیاتی کی کھنگال میں اسے کوئی ایک پل بھی ایسا یاد نہیں آیا تھا جب انہوں نے اسے بیٹی کہا ہو۔ آتا بھی تو کیسے، ایسا کوئی پل گزرا ہی کہاں تھا۔ نہ اس کے بچپن میں، نہ لڑکپن اور نہ جوانی میں......

سوپ کے پیالے کو کپکپاتے ہاتھوں سے ایک طرف رکھ کر وہ باہر چلی گئی۔ سن کر بھی اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اماں کو بتانا چاہتی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ اس کی زندگی بھر کی اداسی اب ختم ہونے والی تھی، اس خوشی میں وہ تھوڑا اور اداس ہونا چاہتی تھی۔

"زمین...... بٹیا......"

ابا کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

ابا جو اس کے لاڈ کے ابی تھے، وہ اسے اپنی بیٹی ہی نہیں مانتے تھے۔ وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ وہ تو اسے بہت پیارے تھے لیکن وہ انہیں کبھی بھی پیاری نہیں رہی تھی۔ وہ ان کی طرف سے ہر طرح کے لاڈ سے ہمیشہ محروم ہی رہی تھی۔ لیکن آج...... اس پل...... چالیس سالہ طوبیٰ کو ستر سالہ معین چشتی نے اپنی بیٹی کہا تھا تب جب وہ خود مفلوج ہو چکے تھے اور اسے مفلوک کر چکے تھے۔

اسے دیکھ دیکھ کر اماں کتنا تڑپ تڑپ کر رویا کرتی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کو چوم کر، اس کے ماتھے کے بوسے لے کر، اس کے بالوں کی خوشبو سونگھ کر...... میری بٹیا، میری لاڈلی کہہ کہہ کر تھکتی نہیں تھیں۔

وہ ان ہی کی تو بٹیا تھی۔ ان ہی کی لاڈلی، گڑیا، برفی کی ڈلی، روئی کا گالا۔ محبت کا وہ اکلوتا استعارہ جو ان کی جملہ زندگی کا پورا باب تھا۔

اور ابا کی تو وہ دور دور تک کچھ لگتی ہی نہیں تھی۔

تب ہی وہ اسے دیکھتے تک نہیں تھے۔ لیکن وہ چھپ چھپ کر انہیں دیکھا کرتی تھی۔ ان کے لباس کی باس اپنے اندر اتارا کرتی تھی۔ منڈیر چڑھی ان کے لوٹ آنے کا انتظار کیا کرتی تھی۔ چوری چھپے ان کے جوتے پالش کرتی، ان کے وضو کے لوٹے کو پانی سے بھر بھر رکھا کرتی تھی۔ ان کی جرابیں، بنیان اماں کو بتائے بغیر دھو ڈالتی تھی۔ ان کی کتابوں پر سے گرد جھاڑتی۔

ان کا بستر سونے سے پہلے تیار کرتے وہ ان کی لمبی زندگی کی کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی۔ وہ ان کی وہی بیٹی تھی جو کسی بھی پیار کرنے والے، ناز نخرے اٹھانے والے باپ کی ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ اس کے وہ والے ابا نہیں تھے، جو اچھی بری، ایسی ویسی ہر طرح کی اولاد کے لیے دل کو کشادہ اور بانہوں کو وار کھتے ہیں۔ اس کی باپ کے لیے ایسی محبت پہ اماں کا دل کٹ جاتا تھا۔ وہ منہ چھپائے اسے بنا بتائے رویا کرتی تھیں۔ وہ ابا کی بٹیا بھلے نہ تھی، وہ تو اس کے ابی تھے۔

"بٹیا" لفظ —— کو پورے چالیس سال لگے تھے ادا ہونے میں۔ ابا کو اسے بیٹی مان لینے میں۔ وہ اماں کی تصویر کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ آنسو ابھی تک اس کی آنکھیں بھگو رہے تھے۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ ان کا شوہر آج اس کا باپ بن گیا ہے۔ وہ آج ابی کی بٹیا بن گئی ہے لیکن اماں نہ یہ منظر دیکھ سکتی تھیں نہ ابا کے منہ سے نکلی بات سن سکتی تھیں۔

☆☆☆

بہنوں کا اپنا ماہنامہ شعاع

شعاع جنوری 2019 کا شمارہ شائع ہو گیا

- "آس پاس" نبیلہ ابر راجا/ نیلم ناز سلطانہ کا مکمل ناول،
- "گماں سے یقین تک" صدف ریحان گیلانی کا مکمل ناول،
- "شہزاد" صائمہ اکرم چوہدری کا ناول،
- "شام کی حویلی میں" رخسانہ نگار عدنان کا ناول،
- "ہمارا آشیانہ" تحریم وٹو کا ناولٹ،
- "محبت معجزہ ہے" نشاء محسن علی کا ناولٹ،
- افشین فہیم، حنا بشری، زرقا سکندر، اور نادیہ جہانگیر کے افسانے،
- "فاطمہ نجیب اور ڈاکٹر نجیب الرحمان" کا "بندھن"
- "دستک" معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے قارئین سے سروے،
- "گزرے سال کی بات" سال نو پر قارئین سے سروے،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع جنوری 2019 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

اماں کی ابا سے شادی صرف اور صرف دادا کی ضد تھی۔ اماں، دادا کی اکلوتی یتیم بھانجی تھیں اور ابا، دادا کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یتیم بھانجی کو سہارا دینے کے لیے دادا نے زبردستی ابا کا رشتہ اماں سے طے کر دیا تھا۔

"اگر تم نے رابعہ سے شادی نہیں کی تو میں بھول جاؤں گا کہ میرا کوئی بیٹا بھی تھا۔"

"وہ تو آپ اب بھی بھول گئے ہیں۔ آپ کو بھانجی اتنی عزیز ہو گئی ہے کہ آپ نے بیٹے کی قربانی کا سوچ لیا ہے۔" ابا کسی طور دادا کے فیصلے سے خوش نہیں تھے۔

"مجھے بیٹا اس سے زیادہ عزیز ہے تبھی میں نے بھانجی کو قربان کرنے کا سوچا ہے۔"

دادا، ابا کے مزاج سے واقف تھے۔ ان کے ساتھ کسی صابر عورت کا گزارا ہی ممکن تھا اور اماں سے زیادہ صابر لڑکی ان کی نظروں میں کوئی نہیں تھی۔ ابا کا غصہ ابا کے ہی سر چڑھ کر بولا کرتا تھا۔ ان کی عداوت اور غصے کا خاندان بھر میں شہرہ تھا۔ یہاں بھرے اور وہاں سب برباد کر ڈالا۔ برباد تو ابا نے اماں کی زندگی بھی کر ڈالی تھی۔ دادا اتنے ضدی نہ ہوتے تو اماں کی زندگی ایسے بے مول نہ ہوتی۔ اس صابر عورت کو اپنی زندگی صبر کے گھونٹ بھر بھر کر نہ گزارنی پڑتی۔

اماں شادی شدہ زندگی کی ان تیس بہاروں میں کبھی ابا کی نظروں میں بیوی کا مقام حاصل نہ کر سکیں۔ دکھ انھیں اس بات کا نہیں تھا کہ وہ بیوی نہ بن سکیں، دکھ تو اس بات کا تھا کہ ابا نے ان کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد کو بھی کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اماں نے زمین کے وجود کی اپنی کوکھ میں موجودگی کو اکیلے ہی سہا تھا۔ اکیلے ہی خوشی منائی، اکیلی روئیں، اکیلی ہنسیں، سارا درد اکیلے ہی سہا تھا۔ وہ خالصتاً ان کی اولاد ٹھہرائی گئی تھی جس سے ابا کا قریب کا ہو کر بھی دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔

☆☆☆

جب زمین پیدا ہوئی تو ابا کو ایک خصوصی تو کیا عموی سی بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے بیٹی کی طرف نظر بھر کر تو کیا ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر اس جگہ سے اٹھ کر چلے جاتے تھے جہاں اماں، زمین کو لے کر بیٹھتیں ـــ اسی لیے زمین کی پیدائش سے ہی انھوں نے اپنا کمرہ الگ کر لیا تھا۔ وہ اس کے وجود سے بالکل اسی طرح بھاگتے تھے جیسے اماں کے وجود سے۔ اتنا سب قابل قبول ہو جاتا اگر اس روز ابا، اماں کو وہ سب نہ کہہ دیتے جو شریف تو کیا کوئی بدکردار عورت بھی سننا گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ کہیں سے بھی میری اولاد نہیں ہے۔ نجانے کس کی نشانی تم میرے سر ڈال رہی ہو۔"

اماں کے لیے شادی شدہ زندگی کے دو سالوں کی تذلیل ایک طرف تھی اور یہ تذلیل ایک طرف تھی...... ابا نے ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں بدکردار نہیں کہا تھا۔ صاف صاف کہا تھا۔ بدکردار ہونے کی گالی نہیں دی تھی، طمانچہ دے مارا تھا۔ تہمت ایسا ناسور ہے جو کردار والوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ اماں نے ایک نظر زمین کو دیکھا اور دوسری نظر معین الدین چشتی کو۔ زمین جو بنی بنائی ابا کی پرچھائی تھی لیکن وہ نصیب اپنی ماں کا چرا لائی تھی۔ وہ ماں جو اس کے باپ کے ہاتھوں خود ٹھکرا دی گئی تھی تو وہ کیسے اپنائی جاتی......؟

"یہ خون تو آپ کا ہی ہے معین الدین صاحب! دعا کرتی ہوں آپ کے خون میں آپ کا اثر نہ ہو۔ ورنہ آپ کا بڑھاپا کون دیکھے گا۔" اماں اولاد کو ملنے والی گالی پر بلبلا اٹھی تھیں۔ دعا تھی یا بددعا، وہ خود کو دینے سے روک نہیں سکی تھیں۔

پھر ابا بھری محفل میں اسے ٹھکرانے لگے اور ساری زندگی ٹھکراتے ہی رہے۔

"کہاں سے لگتی ہے یہ میری اولاد......؟ میں تو اسے اپنی بیٹی مانتا ہی نہیں۔"

دادا تو رہے نہیں تھے۔ خاندان کے باقی بزرگ ابا کی زبان بندی کے لیے ہاتھ جوڑ جوڑ کر، منتیں کر کر کے تھک چکے تھے لیکن ابا کہاں کسی کی مان سکتے تھے۔ پتا نہیں وہ اماں سے بدلہ لے رہے تھے یا دادا ابا سے۔ ہم سب کی زندگیاں جہنم بنا کر وہ اپنی جنت میں خوش تھے۔ اماں سے ان کی شادی ہو جانا ایسا گناہ تھا، جس کی معافی دینے کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔

زمین کی سہیلیاں ابا کو دیکھ کر کہتیں......

"تمہاری مونچھیں لگا دو تو تم اپنے ابا کا روپ دھار لوگی۔ ہو بہو ان کی تصویر ہو۔"

اور اداسی اس کے اندر اور بھی گھر کر لیتی تھی اور وہ اماں سے چھپ کر رویا کرتی تھی۔ لیکن اماں کو بھی نجانے کون سا طلسم تھا کہ فوراً جان جاتیں کہ وہ روئی ہے۔

"بیویوں کو تو لاکھوں مرد پاؤں میں رگیدتے ہیں لیکن اولاد تو آنکھوں کا نور ہوتی ہے۔ کیسا باپ ہے جس نے اولاد کو بھی کچھ نہ جانا۔ پورے حق سے تسلیم نہ کرتا، آدھی زبان سے ہی کر لیتا۔" خاندان کے بزرگ اظہار خیال کرتے رہتے تھے۔

اماں بھرائی آنکھوں کو چادر کے پلو سے پونچھ کر دیتیں۔ اس کی شادی بھی اماں نے خود طے کی تھی۔ ابا نے تو صاف کہہ دیا تھا۔

"مجھ سے کیا صلاح کیا مشورہ۔ جب میں اسے بیٹی مانتا ہی نہیں ہوں تو......"

اور وہ بابل کی دہلیز سے باپ کی دعاؤں کے بغیر رخصت کر دی گئی تھی۔ اماں تو جیسے اس کی رخصتی کے انتظار میں تھیں کہ خود ایک دن بھی نہ لگایا رخصت ہونے میں۔ اور اس نے پہلی بار ابا کو خاموش دیکھا تھا۔ اماں کے وجود میں اتری موت کی ٹھنڈ جیسے ابا کے آر پار بھی ہوئی تھی کہ ان کا وجود منجمد کر ڈالا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ اکیلے اور بیمار پڑ گئے تھے۔

"کیا ہم ابا کے پاس جا کر نہیں رہ سکتے......؟"

اس نے اپنے شوہر سے پوچھا تھا۔

"تم ایسے باپ کی بات کر رہی ہو جس کی تم بیٹی نہیں ہو۔" وہ حیران ہوا تھا۔

"ان کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے، ہوں تو میں ان کی بیٹی ہی......" کیسے پیارے دل کی تھی وہ

ماہنامہ کرن
جنوری 2019ء کا شمارہ شائع ہو گیا
کرن کتاب
معاشرتی اور معلوماتی موضوعات کے ساتھ
❁ "نیا سال......آج اور کل" شعبہ ہائے زندگی کی مشہور شخصیات سے سال نو پر شاہین رشید کا سروے،
❁ معروف شیف "مہوش اختر" سے شاہین رشید کی ملاقات،
❁ اداکارہ "کرن تعبیر" کہتی ہیں میری بھی سنیے،
❁ "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول،
❁ "شب نم کی سحر" رخ چوہدری کا سلسلہ وار ناول،
❁ "محبت کیمیا گر" قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
❁ "ساگر کنارے" ام طیفور کا مکمل ناول،
❁ "شام رنگ سیاہ" ایمل رضا کا ناولٹ،
❁ "آس گل" فشا محسن علی کا ناولٹ،
❁ "صرف تم" انعم خان کا ناولٹ،
❁ صدف آصف، منعم ملک، اور حنا اشرف کے افسانے اور مستقل سلسلے۔

WOMENSKILLSGROUP

لڑکی۔

پھر وہ ابا کی تنہائی کے خیال سے ان سے اجازت لے کر ان کے پاس رہنے لگی تھی۔ وہ اس سے مخاطب ہونے لگے تھے چاہے ضرورت کے تحت ہی سہی۔ اسے بلا لیتے تھے، بھلے کام کروانے کے لیے ہی سہی۔ زمین کے لیے تو جیسے یہ بھی بہت تھا۔ وہ ابا کے کہے بنا ان کے سارے کام کر دیتی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کی ماں کیا کرتی تھی۔ ابا یہ دیکھ کر اور بھی خاموش ہو جاتے تھے۔

وہ ان کے سامنے کھانا رکھتی تو کھانا ٹھنڈا پڑ جاتا تھا مگر ان کی سوچ جیسے کسی مقام پہ نہ رکتی تھی۔ وہ ان کے کپڑے استری کر کے دینے جاتی تو وہ ہاتھ بڑھانا بھول جاتے تھے بس کپڑوں کو اور اسے دیکھے جاتے۔

"تمہارے ابا اپنی ساری زندگی کی زیادتیوں پر پچھتا رہے ہیں۔" مونس نے جیسے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

"تو کہہ کیوں نہیں دیتے..... بس ایک بار کہہ دیں، میں سب بھول کر ان کے گلے سے لگ جاؤں گی۔"

"کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا زمین! اور کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ انا، مرد کی ہو یا عورت کی، مٹی سے بنی صراحی نہیں ہوتی کہ ایک جھٹکے سے ٹوٹ جائے۔ اتنے سالوں کا خلا ہے، اتنی جلدی پار نہیں ہوگا۔ ان کی انا آڑے آ رہی ہے۔"

اس نے آہ سی بھری۔ وہ سسکنے لگی تھی۔ "میری خواہش ہے کہ ابا مجھے ایک بار بیٹی کہہ دیں۔"

پہلی بار، آخری بار..... ابا نے اتنے سال ایسے ہی گزار دیے لیکن کبھی کچھ نہیں کہا۔ کوئی حرف ندامت یا اظہار محبت..... کچھ بھی نہیں۔ کیا باپ کا دل ایسا پتھر بھی ہو سکتا ہے جس پر اولاد کی محبت قطرہ قطرہ گرے اور پھر بھی وہ موم نہ ہو۔ کیا میری محبت میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ وہ میرے باپ کے دل کو میرے لیے کشادہ کر سکے۔ وہ آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیں۔" وہ اپنے حقیقی باپ کو حقیقی طور پر پانے کے لیے تڑپ ہی تو رہی تھی۔

پھر انہیں فالج کا اٹیک ہوا تو وہ بستر سے لگ گئے۔ ان کا دایاں حصہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ زمین اب پہلے سے بھی زیادہ ان کا خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ نم آنکھوں سے بس اس خدمت گزار ماں کی خدمت گزار بیٹی کو تکتے رہتے مگر کہتے کچھ نہیں تھے۔ زمین ان کی آنکھوں کی نمی سے سمجھ جاتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بس وہ ایک بار ان کے منہ سے اپنے لیے ان کی بیٹی ہونے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتی تھی۔

وہ اعزاز اسے مل چکا تھا..... اس نے اماں کی تصویر کے سامنے آنسو بہاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ابا نے آج اتنے برسوں میں پہلی بار مجھے بیٹی مانا ہے۔ بیٹی کہا ہے۔ آپ ٹھیک کہتی تھیں اماں! خون میں بہت کشش ہوتی ہے۔ یہ خونی رشتوں کو کھینچ کھانچ کر سینے سے لگا دیتی ہے۔ یہ موتیوں کی وہ لڑی ہوتی ہے جو ٹوٹ کر بھی نہیں بکھرتی۔ بکھرتی ہے تو پھر سے جڑ جاتی ہے۔ والدین سے محبت کرنا اور ان کی خدمت کرنا ہم پر فرض ہے۔ وہ چاہے کیسا بھی سلوک کریں ہمارے ساتھ ہمیں بدلے میں اف بھی نہیں کرنا۔ باپ کا دل بھی ماں کے دل کی طرح موم ہی ہوتا ہے اماں! بس کبھی کبھی انا اس موم کو پتھر بنا دیتی ہے۔ میری قطرہ قطرہ محبت نے ابی کے دل کو پگھلا دیا ہے۔ اب میں ان کے سینے پر سر رکھ کر اپنے سارے غم کہہ دوں گی۔ وہ میری پیشانی چوم لیں گے۔ اور میں بھول جاؤں گی کہ میرا اور ان کا ماضی کیا رہا ہے۔ یاد رکھوں گی تو بس اتنا کہ وہ "میرے پیارے ابی ہیں اور میں ابی کی بٹیا۔"

میرے ہاتھ میں میری رپورٹ ہے، ہاتھ لرز رہے ہیں جس کی وجہ سے کاغذ کے چاروں کونے بھی تھرتھرا رہے ہیں۔ سرکاری اسپتال کی کرخت چہرے والی مس سے لے کر پرائیویٹ مہربان ڈاکٹر صاحبہ تک سب کا ایک ہی جواب ہے۔

میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ میں بنجر ہوں، بے کار

شازیہ الطاف ہاشمی

سُونا آنگن

WOMEN SKILLS GROUP

ہوں میں ناکارہ ہوں میرے اندر اتنے آنسو جمع ہیں مگر میں رضا کے سامنے کبھی ایک آنسو تک نہیں بہا سکی۔ رضا جو رب کی رضا میں راضی رہنا جانتا ہے۔ اسے بچوں سے بہت ساری چاہ ہے محبت ہے بہت مگر وہ کہہ کر میرا دل دکھانا نہیں چاہتا اور میں بھی اپنا دل ٹوٹتے دیکھ نہیں سکتی۔

وہ مہربان محبت کرنے والا شوہر ہے۔

اماں رات رات بھر کھانستی رہتی ہیں ان کی کھانسی بھی روتی ہے انہیں بیٹے اکلوتے بیٹے کے بچوں کی شدت سے چاہ ہے۔ مرتے مرتے وہ کسی ایک کو گود لینے کی آرزومند ہیں۔

"بنجر کوکھ ہے تیری۔ کیکر کی طرح لمبی سیدھی عورت کیا ماں بنے گی پتا نہیں رضا کب سمجھے گا۔" ان کی آنکھیں جس گہرے کنویں سے جھانکتی ہیں وہ یوں ہی نہیں ہیں ایک عمر کا تجربہ ہے ان میں۔

"اماں! میں گئی تھی ڈاکٹرنی کے پاس اللہ خیر کردے گا بس تم دعا کرو۔"

میں انہیں پاپے دودھ کبھی گرم چائے میں ڈبو کر کھلاتی ان کی بوڑھی باچھوں سے دودھ کے قطرے بے یقین سے گرتے تھے جیسے وہ جانتی ہوں کہ میرے جھوٹ کو پکڑ چکی ہوں، ایک ایسا جھوٹ جو ہر ایک سے بولا گیا تھا۔ سچ کو تو میں نے خود سے بھی چھپالیا تھا مگر اس ایک کمرے کی مکین جو اٹھتے بیٹھتے کو بھی میری محتاج تھی۔

وہ روز میرا جھوٹ پکڑ کر دکھاتی تھی۔ اس کی نگاہیں کھینچ کھینچ کے میرے جھوٹ کو میرے اندر بے نقاب کرتی تھیں۔ رضا کی محبت صرف میرے لیے ہے رضا صرف میرے لیے بنا ہے، میں اسی کو چاہوں گی، میرا ایک ہی قول ایک ہی تکرار تھی۔

میں کچ چھپائی ہوئی تھی جو مجھ میں تھا۔ اس میں نہیں۔ وہ روز انتظار کرتا تھا، اس کی نگاہیں بھی اپنی ماں جیسی تھیں طلب گار مگر میں اس طالب میں اپنا مطلب تلاش کرلیا کرتی تھی۔ اسے "میری چاہ ہے اور تو کچھ نہیں۔"

"رضا حسین! تو شادی کرلے میں سچ کہتی ہوں اس کے تو قدم بھی ماؤں والے نہیں میں اب اور انتظار شاید نہ کرسکوں۔"

[illegible] ادن بے بس چھت تکتی عورت پوری قوت سے اس کے سامنے دیوار بن جاتی تھی مگر ریت کی دیوار اسے ڈھانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی۔

"اماں! اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں، بس تم دعا کیا کرو ہمارے لیے۔"

رضا حسین کو پکا یقین تھا اللہ اس کی گود لازمی بھردے گا۔ یہ بھروسا اس کے چہرے پر ٹھاٹھیں مارتے سمندر جیسا تھا۔

"تم دل چھوٹا مت کرنا اللہ ہماری گود ضرور بھرے گا۔"

میں جو اندر سے جھوٹی تھی، میں نے دل کیا چھوٹا کرنا تھا میں جھوٹی تھی جھوٹی تسلیاں دے دے کر تھپک کر اسے سلانا اب میرے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

"ڈاکٹر عنیزہ نے امید دلائی ہے اس دفعہ" نیم گرم دودھ گھونٹ گھونٹ اپنے بنجر وجود میں اتارتے بھی میں بہت تھک گئی تھی۔ اماں نہیں اپنا آپ تھکا تا تھا مگر رضا کی محبت کی وراثت مجھے تھکنے نہیں دیتی۔ رات دھیرے دھیرے پھیل رہی ہے پانی میں کالی سیاہی کی طرح

☆☆☆

"کوئی آرہا ہے۔" رضا بائیک کی چابی اٹھانے آیا تو سیدھا کچن میں ہی چلا آیا تھا۔

"ہاں نجمہ آپا آرہی ہیں بچوں کے ساتھ۔ سمیر بھائی ملتان گئے ہیں تب انہیں کچھ فارغ وقت ملا ہے جب ہی میری طرف کا پروگرام بن گیا، واپسی میں نان لانا مت بھولنا۔ قورمہ میں بنالوں گی۔"

چکن دھوتے ہوئے میں نے دیکھا وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"کڑاہی بنالیتیں۔ تمہیں پتا ہے ناں نجمہ آپا کے بچے شوق سے کھاتے ہیں۔"

رضا کی محبت زندہ باد تو تھی ہی مگر دل بھی ایسا کسی کسی کا ہی ہوتا ہے۔

"جو حکم جناب کا، کڑاہی ہی بن جائے گی۔" مجھے اس کی خیال رکھنے والی عادت یونہی سرشار کردیا کرتی تھی۔

☆☆☆

آپا! آپ یہاں بیٹھیں ناں، بچوں کو میں نے کارٹون لگادیے ہیں اب آرام سے بیٹھے ہیں۔ آپ سنائیں کیسی ہیں؟"

اگرچہ ان کے چہرے پر ساری داستان رقم تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ اور شوہر کی ٹک کے کہیں کام نہ کرنے کی عادت انہیں بچوں سمیت بہت اذیت میں مبتلا رکھتی تھی۔

آپا کی زندگی بہت مشکل تھی، میری ہر سانس سکھ سے بھری تھی پرسکون آج کل کہیں نہیں تھا۔ عمر کیا تھی۔ بیس سال پر اٹکا تھا دو سو بیس سال بیت گئے ہوں۔ میں ناقابل برداشت بوجھ میں بدل چکی ہوں۔ مگر یہ میرا بوجھ تو نہیں تھا اس جھوٹ کا بوجھ تھا جو میرے کندھوں پر سوار ہو گیا تھا۔ رضا تو مجھ سے بھی سال بھر چھوٹا تھا میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

"یہ اظفر بہت شرارتی ہے آپا! دیکھو تھکا ہوا ہے پھر بھی کھیلنے میں لگا ہوا ہے۔"

رضا اظفر کو صحن میں بھاگتے دوڑتے اپنے دوسروں بہن بھائیوں کا پیچھا کرتے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو صبح بھی بہت سویرے جاگ جاتا ہے اور پھر ایک ایک سے گلے ملتا ہے جیسے کہیں گیا ہوا ہو۔"

نجمہ آپا پھیکی سی ہنسی ہنس دیں جہاں کہیں کہیں ماں کی مامتا بھی جھانکتی تھی۔ رضا کی نگاہیں اظفر کے ساتھ ساتھ بھٹک رہی تھیں۔

آپا چلی گئیں اور میں اماں کو کھانا کھلانے ان کے کمرے میں چلی آئی، آج وہ بالکل خاموش تھیں کسی روٹھے بچے کی طرح، بوڑھے گال پھلائے نہ جانے کب سو بھی گئیں بھوکی۔

"کیوں نہ ہم اظفر کو گود لے لیں، نجمہ آپا کبھی انکار نہیں کریں گی مجھے اور سمیر بھائی کو آپا خود منالیں گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔"

میں نے بیٹھے بیٹھے سارا پلان ترتیب دے دیا تھا جس طرح اظفر نے اُدھم مچائی تھی میرا ابھی دل مچلا جاتا تھا۔

"ہوں آئیڈیا تو اچھا ہے تم بات کرکے دیکھو بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ اظفر اس گھر کے سارے گملے توڑ دے۔" رضا خیالوں میں اسے گملوں کا ستیاناس کرتے دیکھ رہا تھا۔

"اگلے دانت تڑوائے گا اپنے۔" میں شبینہ حسین اس کی بات کرتے کرتے یوں معمول پر آگئی تھی کہ جیسے کہ وہ میرا ہی بچہ ہو۔ صرف میرا۔

☆☆☆

"آپا میں چاہتی ہوں کہ آپ اظفر مجھے۔"

دوسرے روز سہ پہر کے وقت میں نجمہ آپا کے ہاں گئی تھی اور آپا اظفر کو کھیر کھلا رہی تھیں۔

"میرا بہت دل چاہتا ہے کہ۔"

میری بات پوری نہ ہوسکی تھی کہ گلے میں آنسوؤں کا پھندا کسا جانے لگا تھا ایسا ہی بے اولادی کا پھندا بھی تھا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں پر سمیر شاید راضی نہ ہو۔ اصل میں اظفر سے اسے بھی بہت لگاؤ ہے گھر میں سب سے چھوٹا ہے تو۔"

آپا کچھ اٹک سی گئی تھیں اور میں جو ان کے اندرونی حالات خراب دیکھ کر آس لگائے چلی آئی تھی۔ [illegible] سی رہ گئی تھی۔

"ہاں مگر تم لے جاؤ اسے، رکھو اپنے پاس جب سمیر لوٹے گا میں لے آؤں گی۔ تم دل چھوٹا مت کرو شبینہ! اللہ ایک دن تمہیں ضرور نوازے گا بس حوصلے بلند رکھو اور دل بڑا کرلو، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اظفر میرے پاس

WOMEN SKILLS GROUP

رہے یا تمہارے، کوئی فرق نہیں ہے۔"

آپا نے مجھے تسلی دی اور گلے سے لگالیا۔

دو ڈھائی سال کے اظفر کی آنکھیں کتنی گول تھیں اور ان میں چھپی شرارتیں، مجھے سارا دن اسے دیکھنا اٹھانا اچھا لگتا رہا۔ مگر وہ مجھ سے مانوس ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہی مجھے دیکھتا رہا اور کبھی اردگرد بھی جھانک لیتا مصروف جو تھا اس دن پتوں کا ڈھیر اظفر نے نوچ پھینکا تھا۔

رات اتنی گہری نہیں تھی۔ جتنی رضا اور میری آنکھوں میں نیند گہری تھی۔ آپا نے فون کر کے اسے سلانے کا ٹائم بتادیا تھا مگر وہ سونے کے بجائے بری طرح رو رہا تھا۔ مٹھیاں بھینچے اور گلا پھاڑ کر روتے ہوئے وہ کسی فیڈر نوڈل کو نہیں مان رہا تھا۔

ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ بچوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ شاید اسے پیٹ میں درد ہو بھوک لگی ہو میں سمجھ نہیں سکی۔ صبح صبح رضا بغیر ناشتے کے چلا گیا تھا اور میں بڑی مشکل سے اماں کو دلیہ کھلا رہی تھی۔

"ماں کو یاد کرتا ہے یہ۔ کیوں لے آئی تو۔ ماں کے بغیر کیسے چپ ہوتا پر تجھے کیا خبر۔"

نرم رومال سے اماں کا منہ صاف کر کے اٹھی ہی تھی کہ نجمہ آپا اظفر کو سینے سے چمٹائے کھڑی تھیں رضا کے نکلنے کے بعد میں گیٹ بند کرنا بھی بھول گئی تھی۔

"وہ میں نے کہا کہ مل آؤں۔"

"اتنی صبح صبح ملنا تو نہیں رتجگا لاتا ہے۔"

میں نے بغور انہیں دیکھا اور سوچا۔

"ماں کے بغیر کیسے رہے گا ٹھیک کہتی ہیں اماں۔"

☆☆☆

یوں بھی نہیں کہ پاس ہے میرے وہ ہم نفس
یہ بھی غلط کہ جدا ہوگیا وہ شخص

رضا اور میری آنکھیں کسی انجانے نکتے پر مرکوز تھیں مگر میں نے وہ نکتہ نہ صرف ڈھونڈ لیا بلکہ پکڑ کر رضا کے سامنے لا رکھا۔

"رضا میں تمہاری شادی کروں گی ہم کسی کے نہیں اپنے بچے پالیں گے۔"

میں ایک عزم سے بولی۔

"مگر میں"۔

اگر مگر کچھ نہیں۔" اور میں نے اگر مگر کی بھی نہیں ایک بار جو سوچ لیا کر دکھایا۔

اگلے دو ماہ بعد چار ستمبر کو رضا کے کمرے میں ہی نے اس کی دلہن فہمینہ لا بٹھائی۔ آج ہماری اٹھارہ سالہ رفاقت میں پہلی دراڑ پڑنے والی تھی مگر میں نے محبت کو تقسیم نہیں ضرب دینے کا سوچا تھا بڑھے گی۔ کم نہیں ہوگی مگر دل کو دھڑکا سا بھی آن چمٹا تھا۔

میرے عروج کی لکھی تھی داستاں جس میں
مرے زوال کا حصہ بھی اسی کتاب میں تھا

میں ماں نہیں بن سکتی تھی مگر رضا کو باپ تو بنا سکتی تھی۔ رضا حسین نے میرے ٹھنڈے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیے تھے اور میں مسکرا بھی نہ سکی۔ ایک بوجھ سے نجات تو پالی تھی مگر اگلا مرحلہ میری سوچ سے بڑھ کر کٹھن تھا۔

"رضا تم جاؤ فہمینہ تمہارا انتظار کرتی ہوگی۔"

چاند دھیرے دھیرے سرکتا رہا نہیں معلوم کہ رات بھر میں کیا سوچتی رہی فہمینہ مجھ سے ڈری ہوئی تھی اور میں اس سے۔

اس سے اگلی صبح ہم دونوں نے اپنے ڈر کے رنگ کو ملا کر ایک نیا رنگ تخلیق دے دیا محبت کا رنگ۔

میرا دل اتنا بڑا کبھی نہیں رہا تھا مگر جب دل بڑا کیا تھا تو قدرت کو میری قربانی بھا گئی تھی۔ سارے ڈاکٹرز حیران ہیں مگر میں حیران نہیں ہوں اللہ تعالیٰ نے میری اور فہمینہ کی گود ساتھ ہی بھر دی تھی ارمغان اور صوفیہ ہم تینوں کے بچے ہیں۔ میری، رضا اور فہمینہ کی دیوار گیر تصویر میں ایک مکمل گھر کی تصویر ہے رضا، بچے فہمینہ ہمارے آنگن میں پھر کوئی سونی شام نہیں اتری۔

سویرا فلک

جدید دور کی قدیم عورت

بات اتنی بڑی تھی نہیں، جتنی بن گئی تھی کہ ثنا کو اپنا آپ اس صورت حال سے نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ بظاہر بیٹی کہنے والی ساس، بہن ماننے والی نند اور جان نثار کرنے والا شوہر یوں منہ پھیرے ہوئے تھے جیسے الیکشن کے بعد سیاست دان اپنے منشور سے پھر جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ثنا اس گتھی کو سلجھانے کی جتنی کوشش کر رہی تھی، وہ ریشم کے دھاگوں کی طرح اسی قدر الجھتی جا رہی تھی۔ کوئی اس کی سننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ معاملہ رائی کے پہاڑ کی مانند ہوا جا رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سب کی من چاہی تھی۔

☆☆☆

صادقہ پھوپھو نے کتنے مان سے اسے مانگا تھا۔ اپنی سب بھتیجیوں میں ثنا انہیں سب سے پیاری تھی اس کی وجہ محض اس کی موہنی صورت نہیں بلکہ صاف شفاف دل تھا اور پھوپھو کے اس تجزیے اور رائے سے ان کے تمام گھر والے متفق تھے۔ سو وہ سب کی دلی مراد بن کر ان کے من آنگن میں اتری تھی۔ سب کچھ صحیح بھی چل رہا تھا۔ صادقہ پھوپھو کی ملن ساری اور رکھ رکھاؤ والی عادت ساس بن کر بھی برقرار تھی۔ مگر اب ساڑھے تین سال بعد اس کی ازدواجی زندگی میں آئے اس جھٹکے نے دلوں میں ایسی دراڑیں پیدا کر دی تھیں جیسے شدت کا زلزلہ قائم کھڑی عمارت کی دیواروں میں نمایاں دراڑیں ڈال دیتا ہے۔

بظاہر تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں اس دن اس کے ستارے گردش میں تھے یا اس کی خوشی تھی کہ ستارے نے الٹی چال چلنا شروع کر دی تھی۔ وہ روز کی طرح صبح بچے کو اسکول اور میاں کو آفس بھیج کر کچن سمیٹ کر دوپہر کا کھانا چڑھانے کا سوچ رہی تھی کہ صادقہ پھوپھو چلی آئیں۔

"ثنا! آج دوپہر کے کھانے میں ذرا اہتمام کر لینا۔ میری ایک پرانی دوست ملی تھی کل اتوار بازار میں۔ تو میں نے اسے انوائٹ کر لیا کہ ذرا بیٹھ کر تفصیل سے باتیں کریں گے لنچ کے بعد۔"

"اچھا کیا پھوپھو...... آپ بتائیے کیا بناؤں؟"

ثناء کافی پھرتیلی اور سلیقہ مند قسم کی لڑکی تھی۔ اس لیے اس طرح کے اچانک مہمانوں کی آمد سے گھبرایا نہیں کرتی تھی۔ کچھ اسے صادقہ پھوپھو کی عادت کا بھی پتا تھا۔ وہ خاصی سوشل خاتون تھیں۔ اکثر وہ خود کہیں مدعو ہوتیں یا پھر کوئی نہ کوئی مہمان خاتون لنچ، ڈنر یا ہائی ٹی پر مدعو ہوتی تھیں۔

مہمانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی اس لیے کبھی کسی کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا تھا۔ اور صادقہ بھی اہتمام کے نام پر ایک یا دو ڈشیں اور ساتھ میں میٹھا

WOMEN SKILLS GROUP

ہوتی تھیں۔ ثنا فریزر میں کباب بنا کر رکھتی یا چکن کو روسٹ مسالا لگا کر رکھتی۔ کھلانے والوں نے مہمانوں کے لیے دسترخوان سجا کر رکھا تھا۔ تو اللہ نے بھی اپنی رحمت کا دامن نعمتوں پر وسیع کر رکھا تھا سو کبھی رزق کی تنگی بھی محسوس نہ ہوئی۔

دل بھی تنگ نہ ہوتے اگر اس دن وہ صادقہ پھوپھو کے آرڈر کو معمول کے مطابق اتنا ہلکا نہ لیتی۔ اس نے بریانی کے لیے قورمہ بنانے رکھا اور نند کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ امتحانات سے فارغ ہو کر پریکٹیکل کی تیاری کر رہی تھی۔

"ماریہ! اسکول میں آج پیرنٹس ٹیچر میٹنگ ہے۔ میں بس دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ بریانی کا قورمہ میں نے چڑھا دیا ہے۔ روسٹ بھی لنچ کے قریب اوون میں رکھوں گی اور میٹھے میں شاہی سویاں بنیں گی تو وہ بھی گرما گرم بنالوں گی۔ تم ذرا برتن نکال لو اور سلاد رائتہ بنالینا۔"

"نو پرابلم بھابھی! آپ جائیں۔ یہ چھوٹے موٹے کام تو میں دیکھ ہی لوں گی ابھی تو نو بجے ہیں۔ لنچ تو تین بجے تک ہوگا آپ بارہ بجے تک تو آ ہی جائیں گی۔

اب کیا کریں آپ کی ساس کو میٹھا آپ کے ہاتھ کا ہی پسند ہے۔ اور بریانی کے چاول تو ہمیشہ بیٹھ جاتے ہیں مجھ سے۔ اور امی کو قطعاً نہیں پسند کہ

مہمانوں کے سامنے ان کی میری وجہ سے بے عزتی ہو۔" ماریہ نے آخری جملہ منہ بنا کر کہا تو ثنا ہنس دی۔

"فکر نہ کرو۔ وقت آنے پر سب سیکھ جاؤ گی اچھا اب میں نکل رہی ہوں۔ اللہ حافظ۔"

☆☆☆

ثنا اسکول روانہ ہوئی تو ماریہ کمرہ سمیٹنے لگی۔ اتنے میں صادقہ آگئیں۔

"ماریہ تم ذرا اچھا سا ڈریس نکال لو اور سنو ذرا خاص قسم کے گیسٹ ہیں۔ اچھی طرح سے تیار ہو کر آنا اور نہانے سے پہلے ماسی سے سر پر کھڑے ہو کر صفائی کروانا۔"

"خاص مہمان.....؟ مگر امی! بھابھی تو کہہ رہی تھیں وہ آپ کی پرانے محلے کی دوست شمسہ آنٹی آرہی ہیں۔"

"ہاں وہی آرہی ہے۔ اب تم زیادہ سوال جواب مت کرو۔ جو کہہ رہی ہوں بس وہ کرو۔ اس کے اچھے [illegible] بعد آنے کی وجہ مجھے ہماری مشترکہ دوست [illegible] نے بتائی ہے مگر کیوں کہ میں ابھی خود کنفرم نہیں ہوں تو میں نہیں چاہتی کہ بلاوجہ کی خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ تم بس خیال رکھنا سب چیزیں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میں شاور لینے جارہی ہوں۔"

ماریہ اس قدر بچی نہ تھی کہ ماں کی ہدایت کی وجہ نہ جانتی مگر وہ ماں کی عادت سے بھی خوب واقف تھی۔ وہ جب تک خود کسی بات کی تصدیق نہ کر لیتیں آگے نہ بڑھاتیں اور یقیناً یہ ان کی اچھائی تھی سو کبھی کوئی معترض بھی نہ ہوا۔ ماریہ بھی سر جھٹک کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

پونے دو ہو رہے تھے۔ ثنا گھر نہیں پہنچ پائی تھی۔ واپسی میں ٹریفک جام تھا۔ اوپر سے موبائل کی بیٹری ڈاؤن تھی۔ ادھر ماریہ پریشان تھی کہ وہ کھانے کا کیا کرے، ثنا کا آخری میسج یہ ہی تھا کہ وہ ٹریفک جام میں پھنس گئی ہے۔ آخر تھک ہار کر اس نے ڈیڑھ بجے ماں کو بتایا۔

صادقہ جوڑوں کے درد کی مریضہ تھیں۔ ان سے ڈھنگ سے پتیلی میں چمچ تک نہ چلایا جاتا تھا۔ بہرحال جیسے تیسے انہوں نے ماریہ سے ہی چاول دم پر لگوائے جو حسب توقع تھوڑا [illegible] گئے۔ سویوں کا تو اکڑ کر ضائع ہونے کا ڈر تھا سو اس کا خیال نکال دیا گیا۔

شمسہ آچکی تھیں۔ ڈھائی بجے ثنا ہانپتی کانپتی گھر پہنچی۔ شمسہ کو کہیں اور بھی جانا تھا۔ اس لیے فوری طور پر کھانا لگا دیا گیا۔ شمسہ گئیں تو صادقہ نے پہلی بار ثنا کو

آڑے ہاتھوں لیا۔

"اتنی غیر ذمہ داری۔ تم نے میری بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ تم اگر ذمہ داری سے وقت پر آجاتیں تو آج جو سبکی مجھے محسوس ہوئی' میں اس سے بچ جاتی۔"

"پھوپھو یقین مانیں میں صحیح وقت پر نکل گئی تھی مگر راستے میں ایک جگہ دھرنا تھا اور ٹریفک بہت جام تھا۔ اور پھر میں ماریہ سے کہہ کر گئی تھی کہ وہ دیکھ لے۔"

"کیا مطلب ہے بھابھی! میں نے کیا کیا ہے؟ آپ نے جو کہا' وہ تو میں نے کر دیا تھا۔ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ آپ باقی چیزیں خود دیکھیں گی۔"

ماریہ جو پہلے ہی ماں سے سخت سست سن کر بھری بیٹھی تھی۔ بھڑک اٹھی۔

"ثنا اپنی غلطی ماننا سیکھو' نہ کہ دوسروں پر ڈالنا۔ تم نے آج بتا دیا کہ تم اس گھر کی بہو ہو۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تم میٹنگ چھوڑ دیتیں۔ ایسا کون سا طوفان آجاتا مگر تمہیں لگتا ہے کہ بس تم جو کچھ کر رہی ہو [illegible]۔ میری ہی غلطی ہے کہ میں نے تمہیں سارا [illegible] سونپ دیا اور تمہیں بااختیار کر کے خود بے اختیار ہو گئی۔"

صادقہ بیگم [illegible] تن فن کرتی کمرے سے چلی گئیں۔ ماریہ نے بھی ان کی تقلید کی اور ثنا حیران پریشان کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

شام میں ایان کی دفتر سے واپسی پر صادقہ پھوپھو نے سارا معاملہ ان کے سامنے پیش کیا۔ ثنا کچن سے چائے بنا کر لائی تو ایان کے بدلے لب و لہجے نے اسے اندر تک لرزا دیا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں ثنا۔"

"ایان پلیز' آپ تو میری بات سنیں۔ میں نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا۔ وہ تو....." ثنا نے بڑی امید سے اپنا مقدمہ لڑنا چاہا۔

"بلاوجہ کی بحث مت کرو۔ تمہاری سنوں؟ کیا مطلب اس بات کا کہ تم صحیح ہو اور میری ماں بہن غلط ہیں۔ بجائے اس کے کہ تم اپنی لاپروائی اور غلطی کی معافی مانگو' تم الٹا بحث مباحثے پر اتر آئی ہو۔ اور تو اور مجھے بدگمان کرنے میں لگی ہو۔ کان کھول کر سن لو میں ان مردوں میں سے نہیں جو بیوی کے کہنے میں آ کر ماں بہنوں سے بددل ہو جاتے ہیں۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی غلطی مانو، معافی مانگو اور آئندہ محتاط رہو۔"

ایان دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے ٹی وی پر چلتے ٹاک شو کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"پھوپھو! میں معافی چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو خفت کا سامنا کرنا پڑا۔" روہانسی آواز میں کہہ کر ثنا نے چائے کی ٹرے اٹھائی اور رات کی ہنڈیا دیکھنے کچن میں واپس آگئی۔ صادقہ بیگم نے شفقت سے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ تم جیسے بیٹے' ماؤں کا مان رکھتے ہیں۔"

پھر انہوں نے ماریہ کو آواز لگائی۔

"ارے ماریہ! ذرا اپنی خالہ کو لندن کال تو ملاؤ وہ واٹس ایپ پر۔"

اور کچن میں موجود اپنی پلکوں کے گیلے گوشے ٹشو سے خشک کرتی ثنا کے لبوں پر ایک دم پھیکی مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ زیر لب بڑبڑا دی۔

"زمانہ بے شک جدید ہو گیا مگر عورت آج بھی اسی قدیم سوچ کی قیدی ہے کہ تخت پر حکمرانی صرف اس کی ہو۔" اس نے کہیں پڑھا تھا' آج مان بھی لیا تھا کہ "ساس کبھی ماں نہیں بن سکتی اور بہو بیٹی کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

WOMEN SKILLS GROUP

راشدہ رفعت

حُور

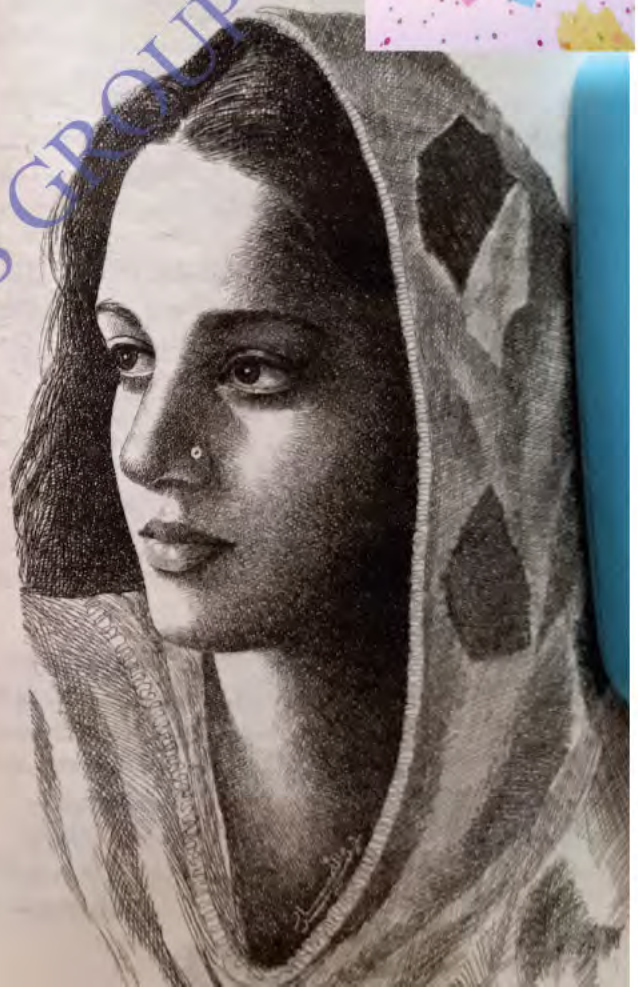

تھکا دینے والی طویل ڈیوٹی دے کر وہ گھر لوٹا تو حسب توقع ڈرائنگ روم میں ابا نے بہت سے مریض اس کے انتظار میں بٹھا رکھے تھے۔ مریضوں میں کچھ ابا کے دوست ہوتے تھے، کچھ دوستوں کے دوست جو پہلی ملاقات میں ہی ابا کے بھی بہت اچھے دوست بن جاتے تھے اور اگلی ملاقات میں وہ اپنے مزید دوستوں کو ابا سے ملوانے اور معاذ سے معائنہ کروانے لے آتے۔ معاذ ابا سے تو رکھائی، بدتہذیبی اور بے مروتی سے پیش آ سکتا تھا لیکن دنیا کے سامنے وہ ابا اور اپنے تعلقات کا بھرم قائم رکھتا تھا۔

اسے ان مفت خورے مریضوں کا معائنہ بھی کرنا پڑتا اور نسخہ بھی لکھ کر دینا پڑتا۔ چونکہ اکثر مریض ابا کے ہی ہم عمر ہوتے اور بڑھاپے میں بندے کو بولنے کا بس بہانا ہی چاہیے ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیماریوں کی تفصیل سنا سنا کر معاذ کو عاجز کر دیتے۔ معاذ کو نسخہ لکھنے کے ساتھ ساتھ تشفی آمیز کلمات بھی ادا کرنے پڑتے۔ ابا اس ساری کارروائی کے دوران بہت محبت اور فخر سے بیٹے کو تکتے رہتے۔ جب آخری مریض بھی رخصت ہو جاتا تب اس کی باری آتی ابا پر بگڑنے کی اور ان سے خفا ہونے کی لیکن ابا کو اس کی خفگی کی کوئی پروانہ تھی۔

''نزاکت نے آج آلو گوشت بہت مزے کا بنایا ہے۔ کھانا کھا کر ہانڈی کا باقی سالن ڈونگے میں نکال دینا اور یاد سے فریج میں رکھ دینا۔ بھی کل کی طرح بلی منہ مار جائے۔ مجھے بہت نیند آ رہی ہے، سونے جا رہا ہوں۔ کب سے تمہارے انتظار میں بیٹھا تھا، اب میری عمر تو نہیں ہے آدھی آدھی رات تک جاگ کر تمہارا انتظار کرنے کی۔ بہتر ہے اب شادی کر کے اپنا گھر بسا لو۔''

ابا روٹین کی نصیحت دہراتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلے جاتے۔ معاذ بس ان کی پشت کو گھورتا رہ جاتا۔ اپنے غصے کا اظہار کا فقط یہ طریقہ سمجھ میں آتا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد سالن کی ہانڈی کچن میں چھوڑ کر کچن کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیتا۔

صبح بگڑنے کی باری ابا کی ہوتی۔ وہ ہنستا مسکراتا ناشتا کرتا اور پھر ہاسپٹل کی راہ لیتا۔ بڑے صاحب کی بڑبڑاہٹیں سننے کے لیے نزاکت رہ جاتا لیکن اب وہ بھی اس تماشے کا عادی ہو گیا تھا۔ آج کل تو اسے بھی کام نمٹا کر جلد از جلد اپنے گھر جانے کی پڑی رہتی۔ کم بخت کی نئی نئی شادی جو ہوئی تھی۔ بمشکل تئیس برس عمر تھی اس کی۔ عید کی چھٹیوں پر گاؤں گیا تو گھر والوں

ناولٹ

WOMEN SKILLS GROUP

نے نکاح پڑھوا کر بیوی کو بھی اس کے ساتھ شہر بھیج دیا۔

پہلے نزاکت یہیں ابا اور معاذ کے ساتھ رہتا تھا۔ شادی کے بعد معاذ نے اس کی تنخواہ بڑھا دی، اس نے قریبی آبادی میں چھوٹا سا کچا پکا گھر کرائے پر لے کر وہیں رہائش اختیار کر لی۔ چوبیس گھنٹے کا ملازم دن میں اب آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی بھگتا کر گھر بھاگنے کی کرتا تو ابا کو اس پر غصہ آتا سو آتا، معاذ پر سخت تپ چڑھتی۔

”اس لاٹ صاحب کی تنخواہ ڈبل کر دی تم نے۔ مغرب کی اذانوں کے ساتھ ہی گھر بھاگنے کی کرتا ہے۔ میرے سارے دوست مغرب اور عشاء کے بعد مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ اب انہیں چائے، پانی کا بھی نہیں پوچھ سکتا۔ رات کا کھانا بھی خود گرم کر کے کھانا پڑتا ہے۔ جتنی تنخواہ اس کم بخت کی ہے، مرزا صاحب کے گھر اس سے آدھی تنخواہ میں کل وقتی ملازمہ کام کر رہی ہے۔“ ابا اپنے دوست کا حوالہ دیتے۔

”مرزا صاحب کے گھر میں ان کی بیگم کے علاوہ دو عدد بہوئیں بھی ہوتی ہیں۔ کل وقتی ملازمہ رکھ سکتے ہیں وہ۔ آپ کو اور مجھے کل وقتی تو کیا جز وقتی ملازمہ بھی نہیں مل سکتی۔ ہر وقت نزاکت کے پیچھے مت پڑا کریں! اگر یہ بھی نوکری چھوڑ گیا تو کیا بنے گا ہمارا۔“ اپنی عادت کے برخلاف وہ بہت تحمل اور رسانیت سے ابا کو سمجھاتا۔

”تو شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ مجھے تو لگتا ہے تمہاری شادی کی حسرت لیے ہی میں دنیا سے گزر جاؤں گا۔“ وہ معاذ کو جذباتی بلیک میل کرنا چاہتے۔

معاذ کچھ کہے بنا ان پر ایک نگاہ ڈالتا۔

”ارے بابا! معاف کر دو مجھے۔ ایک بار غلطی ہو گئی اب جس کو بھی پسند کرو گے، بنا چوں چرا اس کے تمہارا رشتہ پکا کر دوں گا۔“ ابا عاجز آ کر اسے یقین دلاتے۔ معاذ استہزائیہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر وہاں سے پلٹ جاتا۔

ابا بیٹے کی پشت پر بے بس نگاہ ڈال کر رہ جاتے۔ اپنے فیصلے کی درستی پر انہیں آج بھی کوئی شک، شبہ نہ تھا لیکن بیٹے کا رویہ انہیں پچھتاوے میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کیا تھا جو وہ اس کی پسند کو شرف قبولیت بخش دیتے، اس کی بیوی جیسی مرضی ہوتی، کم از کم آج گھر میں بچوں کی چہکاریں تو ہوتیں۔

میڈیکل کے تھرڈ ائیر میں صاحب زادے اپنی کلاس فیلو کو دل دے بیٹھے تھے۔ دل دینے کی حد تک تو خیر تھی، موصوف رشتہ بھی بھیجنا چاہ رہے تھے۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے صاحب زادے اپنی عمر دیکھو اور اپنے کرتوت دیکھو۔ میڈیکل کالج پڑھنے بھیجا تھا یا عشق لڑانے۔“ ابا نے سخت ترین زبان استعمال کی۔ معاذ کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ بیٹے کی شکل دیکھ کر ابا کو بھی اس پر کچھ ترس آیا۔

”پہلے اپنا کیریر تو بنا لو میرے بچے! ڈھائی سال کی پڑھائی باقی ہے، اس کے بعد ہاؤس جاب پھر نوکری، اس کے بعد اسپیشلائزیشن۔ بجائے اس کے تم اپنی پڑھائی اور کیریر پر فوکس کرو، یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے۔“

”آپ ابھی صرف ازکی کے گھر رشتہ لے جائیں، میں کون سا ابھی شادی کرنے جا رہا ہوں۔ صرف منگنی ہو جائے تو اسٹڈیز پر فوکس کر پاؤں گا۔ ازکی بہت خوب صورت ہے۔ میں نے پہل نہ کی تو میرا کوئی اور کورس میٹ سبقت لے جائے گا۔“

”تم صرف لڑکی کی خوب صورتی پر لٹو ہوئے ہو برخوردار!“ ابا نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”خوب صورتی کس کو بری لگتی ہے ابا؟“ اس نے عجیب چبھتے ہوئے انداز میں انہیں کچھ باور کروانا چاہا تھا۔ ایک لمحے کو تو وہ چپ بھی ہو گئے۔

”وہ اچھی لڑکی ہے ابا! ذہین بھی اور خوب صورت بھی۔ پھر میرے پروفیشن کی ہے۔ ہمارے درمیان اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ شادی کے بعد یہ

انڈر اسٹینڈنگ مزید بڑھ جائے گی۔“

اپنے اکیس سالہ بیٹے کے منہ سے شادی، بیاہ اور انڈر اسٹینڈنگ وغیرہ ٹائپ کی باتیں سن کر ابا باقاعدہ صدمے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہرکیف بیٹے کی خواہش پر ازکی کے گھر چلے گئے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ لڑکی اور لڑکی کے گھر والوں سے مل لیں اور اگر ان کے بے وقوف بیٹے کی پسند کچھ ان کے جی کو بھی لگی تو پھر پرپوزل دینے اور منگنی وغیرہ کرنے پر بھی غور کیا جا سکتا تھا۔

ازکی کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کو بے وقوف کہتے تھے تو کتنا درست کہتے تھے۔ وہ عین اسی حماقت کا ارتکاب کرنے جا رہا تھا جو بیتے برسوں میں ان سے بھی سرزد ہو گئی تھی۔

بلاشبہ ان کی غلطی زیادہ سنگین اور ناقابل معافی تھی۔ ایک وفا شعار، پاک باز بیوی اور پیارے سے بیٹے کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کی زلف کے اسیر ہوئے۔ چند مہینوں میں ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نادم ہو کر واپس پلٹ آئے۔ جنت مکانی بیوی نے معاف بھی کر دیا لیکن بیٹا آج تک ان کا وہ قصور بخشنے پر تیار نہ تھا اور اپنا وقت آنے پر اس نے عین ویسی ہی لڑکی پسند کی تھی جیسی کبھی باپ نے کی تھی۔

ازکی کو دیکھ کر ابا سخت صدمے میں مبتلا ہوئے۔ بے باکی کی حدوں کو چھوتا فیشن، وہ الٹرا ماڈرن خوب صورت لڑکی ان کے جی کو قطعی نہ بھائی تھی۔ معاذ ہمیشہ کو ایجوکیشن میں پڑھا تھا، اس کے دوستوں میں لڑکے، لڑکیاں دونوں شامل ہوتے تھے لیکن وہ سب بہت تمیز دار اور مہذب بچے، بچیاں ہوتے تھے نہ جانے ازکی جیسی لڑکی اس کے دوستوں کے حلقے میں کیسے شامل ہو گئی تھی اور بات دوستی تک رہتی تو غنیمت تھا۔ معاذ تو اسے لائف پارٹنر بنانا چاہ رہے تھے۔

ازکی سے مل کر ابا کی مایوسی فطری تھی لیکن جب ازکی کے والد محترم ابا کو شرف ملاقات بخشنے ڈرائنگ روم میں تشریف لائے تو ابا کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ شاید ایسا ہی جھٹکا ازکی کے والد کو بھی لگا ہو گا، دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ابا جس سرکاری محکمے میں باعزت ریٹائر ہوئے تھے، ازکی کے والد اسی محکمے سے کرپشن کے الزام میں بے عزت طریقے سے نکالے گئے تھے۔

اپنے اس بدعنوان اور بدنام کولیگ کو دیکھ کر ابا کو ان کا ماضی جزئیات سمیت یاد آ گیا۔ وہ بظاہر ازکی کے والد سے گرم جوشی سے ملے لیکن دوران گفتگو اپنی معلومات میں اضافے کی خاطر ان سے پوچھتے رہے کہ نوکری سے برطرفی کے بعد انہوں نے کیسے گزر بسر کی اور بغیر وسائل کے ایسا کون سا کاروبار شروع کیا جس کی وجہ سے آج ان کے پاس دولت کی اتنی ریل پیل اور یہ عالی شان سی کوٹھی ہے۔ بظاہر خوش گوار ماحول میں اختتام پذیر ہونے والی اس ملاقات کا نتیجہ کچھ اتنا خوش گوار نہ تھا۔ اگلے دن کالج میں پہلی کلاس شروع ہونے سے پہلے ہی ازکی نے معاذ کی کلاس لی تھی۔

”مانا معاذ! تمہارے ابا بہت نیک نام اور ایمان دار سرکاری افسر رہے ہیں، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ میرے ڈیڈی کے ماضی کا بار بار حوالہ دیتے ہوئے انہیں اس طرح شرمندہ کریں اور مالی معاملات میں ایمان داری، نیک نامی اور کھرے پن کو ایک سائیڈ پر رکھ دیں تو ماضی تو تمہارے ابا کا بھی اتنا تابناک نہیں۔ ڈیڈی بتا رہے تھے کہ تمہارے ابا نے اپنی ایک ماتحت سے دھواں دار عشق لڑایا تھا۔ اس عورت کی شہرت بھی کچھ خاص اچھی نہ تھی، تمہارے ابا کو ایک عرصے بعد عقل آئی تو اس عورت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ کل وہ جس طرح میرے ڈیڈی کو ماضی کا حوالہ دے کر بار بار شرمندہ کر رہے تھے اگر میرے ڈیڈی انہیں ان کا ماضی یاد دلاتے تو کیسا لگتا انہیں۔“ ازکی چبا چبا کر بول رہی تھی اور اس انداز میں بولتے ہوئے اس کے چہرے کے خوب صورت

WOMEN SKILLS GROUP

نقوش کتنے خوف ناک لگ رہے تھے۔

معاذ کو ابا پر غصہ تھا سو تھا لیکن ازکی کا یہ روپ دیکھ کر اسے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو پسند کرنے میں جلد بازی اور حماقت سے کام لیا ہے۔ اس روز تو اس نے ازکی سے شائستگی سے معذرت کر لی تھی لیکن آہستہ آہستہ خود ہی اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔

ازکی تعلقات کی تجدید چاہتی تھی کہ وہ کالج کا ہینڈسم ترین اور ذہین ترین لڑکا تھا۔ اس کے بنائے نوٹس کی پورے کالج میں دھوم تھی۔

معاذ کا مستقل گریز بھرا رویہ دیکھ کر ازکی کو بھی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ وہ معاذ کے دوستوں کے گروپ میں صرف معاذ کی وجہ سے شامل ہوئی تھی۔ معاذ نے اسے چھوڑا تو اس نے دوستوں کا گروپ چھوڑ کر دوسرے گروپ میں شمولیت اختیار کر لی۔

تھرڈ پروف کے اختتام تک وہ سفیان کی بہترین دوست بن چکی تھی۔ میڈیکل کالج کے چوتھے سال رجب اس کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ آخری سال اس نے خالد کو شرف دوستی بخشا۔ ہاؤس جاب میں کسی کولیگ سے دوستی گانٹھنے کے بجائے اس نے ایک ایم او (میڈیکل آفیسر) کو پھانس لیا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے شادی اس ایم او سے بھی نہ کی۔ اپنے والدین کے منتخب کردہ لڑکے سے شادی کر کے اس نے مشرقی بیٹی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

معاذ کو اپنی حماقت کا احساس زمانہ طالب علمی میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ ازکی کی خوب صورتی اور معصومیت (جس کو وہ بہت جتن کر کے خود پر طاری کرتی تھی) پر فدا ہو کر کیا احمقانہ قدم اٹھانے چلا تھا۔ اگر خدانخواستہ دونوں کا رشتہ طے ہو جاتا تو کیا بنتا اس کا۔ معاذ کو سوچ کر ہی جھرجھری آ جاتی۔ یہ ابا تھے جن کی وجہ سے اس کا مستقبل محفوظ ہو گیا تھا لیکن معاذ نے کبھی ان کا احسان مان کر نہ دیا بلکہ اس نے ان کے سامنے ہمیشہ یہ ظاہر کیا جیسے وہ اس کے دل کی خوشی پوری نہ کرنے کے قصوروار ہوں۔

ابا سے اس کے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی ہی تھی۔ کسی بھی معاملے پر انہیں موردالزام ٹھہرانے کے لیے اسے کوئی بہانا درکار ہوتا تھا اور فی الحال تو یہ ہی مستقل بہانا اس کے ہاتھ آیا ہوا تھا۔ ابا سمجھتے تھے وہ ماضی کی بات اب تک فراموش نہیں کر پایا، اسی لیے شادی کی ہامی نہیں بھر رہا۔ انہیں معاذ کے دل کے حال کی کیا خبر تھی۔

ازکی والے معاملے کے بعد معاذ نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنا کریئر بنانے اور ذہنی طور پر میچور ہونے تک کسی لڑکی کو ایسی ویسی نظر سے دیکھے گا بھی نہیں۔ جو حماقت ایک بار کر چکا تھا وہ دوبارہ بھی تو سرزد ہو سکتی تھی سو اس نے تمام تر توجہ اپنی پڑھائی پر مبذول کر لی تھی۔ شان دار نمبروں سے ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد وہ اب باوقار طریقے سے جاب کر رہا تھا۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ذہنی پختگی بھی نصیب ہو گئی تھی۔ ابا اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ کسی سلجھی ہوئی لڑکی کو شریک سفر منتخب کر لے، تعلق اسی کے پروفیشن سے ہوتا تو یہ اور بھی اچھی بات ہوتی لیکن وہ جب اپنے اردگرد نظر دوڑاتا تو احساس ہوتا کہ لائف پارٹنر کے انتخاب میں ماضی میں جس جلد بازی کا ارتکاب کر بیٹھا تھا، اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

اب منیر نیازی والی مشہور زمانہ دیر ہو چکی تھی۔ اس کی جان پہچان کی ساری اچھی اچھی لڑکیاں یا تو انگلیوں میں منگنی کی انگوٹھیاں پہن چکی تھیں یا گودوں میں ایک ایک بچہ اٹھائے گھوم رہی تھیں۔ یعنی سب کی سب منگنی شدہ یا شادی شدہ ہو چکی تھیں۔ کسی اچھی سی سلجھی ہوئی لڑکی کے لیے معاذ کی تلاش ہنوز جاری تھی اور اس کا دل کہتا تھا کہ قدرت اس کا ساتھ دے گی اور اسے من پسند جیون ساتھی مل کر رہے گا۔ مگر ابا کو وہ یہ ہی تاثر دیتا تھا کہ اسے شادی کی کوئی جلدی نہیں۔

بے چارے ابا کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے، ہاں دل ان کا بھی یہ ہی کہتا تھا کہ انہیں اچھی سی بہو مل کر رہے گی۔ بیٹے کی طرح ان کی دنیا بھی امید پر قائم تھی۔

☆☆☆

معاذ کے آخری کنوارے دوست حیدر کی شادی تھی۔ حیدر کا تعلق ملتان سے تھا۔ پہلے پڑھائی اور پھر نوکری کی وجہ سے وہ لاہور میں ہی رہتا تھا لیکن شادی اس کے آبائی شہر ملتان میں ہی ہونا تھی۔

باقی دوستوں نے تو اس کے ولیمے میں ہی شرکت کرنا تھی لیکن چونکہ وہ حیدر کا جگری یار تھا۔ اس لیے اسے مجبوراً بارات میں بھی شرکت کرنا پڑ رہی تھی۔ حیدر کی شادی اپنے چچا کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ دلہن والے بھی ملتان میں ہی رہائش پذیر تھے، بارات کے ساتھ کسی دوسرے شہر کا سفر تو درپیش نہ تھا لیکن بارات اور ولیمے میں شرکت کے لیے اسے لاہور سے ملتان کا سفر طے کرنا پڑا تھا۔

ملتان شہر سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کی اکلوتی خالہ کا سسرال ملتان میں تھا۔ ماضی میں جب ابا اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکی کے چکر میں پڑے تھے تو امی روٹھ کر معاذ کو ساتھ لیے بڑی بہن کے گھر ملتان آ گئی تھیں۔ والدین کے انتقال کے بعد میکے کے نام پر ان کے پاس بڑی بہن ہی تھیں اور خالہ نے بھی اس مشکل وقت میں امی کا خوب ساتھ نبھایا۔ ان کے سسرال والے بھی بھلے مانس لوگ تھے بلکہ ان کی ساس امی اور خالہ کی رشتے میں بھی دور پار کی خالہ ہی لگتی تھیں۔

شفیق چہرے والی وہ مہربان سی خاتون معاذ کو اب بھی یاد تھیں حالانکہ ان سے ملے کتنے برس گزر چکے تھے۔ معاذ اس وقت بمشکل دس برس کا تھا، ذہانت اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کی بے پناہ حساس طبیعت بھی شاید اسی ذہانت کی مرہونِ منت تھی۔ وہ ماں باپ کے جھگڑے کے پس منظر اور اس

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت۔/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف۔/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- /350 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- /500 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- /1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

WOMEN SKILLS GROUP

جھگڑے کی نوعیت سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔
اسی زمانے سے وہ باپ سے چڑنے لگا تھا۔ مدتوں بعد بھی وہ چڑ اسی طرح قائم تھی۔ خالہ، خالو اور ان کے ساس، سسر امی اور اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان سب کی مشترکہ کاوشوں سے ہی امی، ابا کی صلح ممکن ہو پائی تھی۔

ابا اپنے کیے پر شرمندہ تھے۔ اس لڑکی کی اصلیت چند ماہ میں ہی ان پر کھل کر سامنے آگئی تھی۔ وہ بے تحاشا خوب صورت لڑکی خود کو بہت مجبور اور بے سہارا بتاتی تھی۔ اس کے حسن اور نام نہاد معصومیت پر فریفتہ ابا اس بے سہارا عورت کو سہارا دینے کی خاطر اس سے عقد ثانی کا ارادہ رکھتے تھے۔ چند مخلص دوستوں اور خیر خواہوں کی کوششوں کی بدولت ابا اس خاتون کی اصلیت سے واقف ہو پائے تھے۔ وہ نازو انداز دکھا کر ابا جیسے کم عقلوں کو بڑی خوبی سے بے وقوف بناتی تھی۔ چند ماہ میں ابا اس بے سہارا لڑکی کے چھوٹے بہن بھائیوں کی گزراوقات کے لیے بے دریغ رقم لٹا چکے تھے۔

پیسہ تو واپس نہ آیا لیکن ابا کو عقل ضرور آگئی۔ انہوں نے وفاشعار بیوی سے ہاتھ جوڑ کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگی۔ امی نے انہیں معاف کرنے میں ٹائم تو لیا لیکن آخرکار انہیں معاف کر ہی دیا اور جب معاف کر دیا تو اپنا دل بھی صاف کر لیا۔ امی کی زندگی کے آخری چند برس امی، ابا کے تعلقات مثالی رہے تھے۔ بیوی کی بیماری میں ابا نے ان کا بھرپور ساتھ نبھایا لیکن وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ابا تب با آسانی دوسری شادی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ماضی کی بے وفائی کا کفارہ یوں ادا کیا کہ جواز ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کا نام زبان پر نہ لائے۔

انہوں نے زندگی معاذ کے لیے وقف کر دی تھی۔ معاذ کے دل کا ایک گوشہ ابا کی قربانی کا معترف تھا تو اسی دل کے ایک گوشے میں ابا کی ماضی والی بے وفائی کی یاد ابھی تک تازہ تھی۔ عملی طور پر وہ ابا کا فرماں بردار بیٹا تھا لیکن لفظی طور پر وہ فرماں برداری کا قطعاً کوئی تاثر نہ دیتا تھا۔

☆☆☆

ابا کو اس کے ملتان جانے کی خبر ہوئی تو انہوں نے اسے تاکید کی کہ وہ مرحومہ خالہ کی سسرال کا بھی ضرور چکر لگائے۔ امی کی زندگی کے آخری برسوں میں خالہ، خالو امریکہ شفٹ ہو گئے تھے۔ خالو کو تو روزگار کی خاطر دیار غیر جانا پڑا تھا لیکن شاید خالہ کے نصیب میں ان کی مٹی میں دفن ہونا لکھا تھا۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں وہ زندگی کی بازی ہار گئیں۔ خالو اور ان کے دو بیٹے اب بھی وہیں مقیم تھے۔ وہاں کی تیز رفتار، مشینی زندگی میں دور پار کے رشتہ داروں کو یاد کرنے کی کس کو فرصت تھی۔ ابا ہی کبھی عید تہوار پر انہیں مبارک باد کا فون کر لیتے تھے۔ اب معاذ ملتان جا رہا تھا تو ابا نے ہی اسے خالو کے آبائی گھر جانے کی تاکید کی تھی۔

"بہت بھلی مانس خاتون ہیں تمہاری خالہ کی ساس! اب تو بہت ضعیف بھی ہو گئی ہوں گی۔ ملتان جا ہی رہے ہو تو انہیں میرا اسلام ضرور پہنچانا۔ تمہاری امی کی زندگی میں تو ہم سال، چھ مہینوں میں ملتان کا چکر ضرور لگاتے تھے۔ اب کتنے برسوں سے ان سے کوئی رابطہ ہی نہ رکھا حالانکہ وہ صرف تمہاری خالہ کی ساس ہی نہیں تمہاری ماں کی بھی رشتے میں خالہ لگتی ہیں۔" ابا نے بہت بار کی بتائی ہوئی بات اسے نئے سرے سے بتائی تھی۔

"شادی میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں ابا! مجھے اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ میں ان کا گھر ڈھونڈتا پھروں گا۔" اس نے ابا کی تاکید پر ذرا کوفت زدہ ہو کر جواب دیا۔

"علاقہ تو تمہیں پتا ہی ہے اور شاید یاد بھی ہو اور اس کالونی میں جا کر کسی سے بھی اپنے خالو کا نام لے کے گھر پوچھ لینا۔ وہ ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے تھے اور اپنے علاقے کی بہت معتبر اور معزز شخصیت تھے اس علاقے کی پہلی مسجد بھی انہوں نے ہی تعمیر کروائی تھی اور ان ہی کے نام سے مشہور ہے۔" ابا نے اسے مزید جزئیات سے آگاہ کیا۔

"فرصت ملی تو چکر لگا لوں گا۔" اس نے اب بھی ہامی نہ بھری تھی لیکن حیدر کی بارات بھگتانے کے بعد وہ اگلی صبح ہی خالہ کا سسرالی گھر ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔

ولیمے کی تقریب رات کو ہونی تھی اور شادی والے گھر کی روایتی گہما گہمی میں وہ سخت بے آرام ہو رہا تھا۔ حیدر کے کزنز اسے کمپنی دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس نے ان کی مصروفیات میں مخل ہونا مناسب نہ جانا۔ شام تک اس کے دوسرے کولیگز بھی پہنچ جاتے تب تک وہ واپس آجاتا۔ خالہ کی سسرال میں رسمی سی حاضری دینے کے بعد اس کا تنہا ہی سیر سپاٹے کا ارادہ تھا۔

☆☆☆

گھر ڈھونڈنے میں اسے زیادہ دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس نے ایک جنرل اسٹور والے سے گھر کا پتا پوچھا تھا اور اس نے اپنے ملازم کو اس کے ساتھ کر دیا۔ بچپن کی دھندلی دھندلی یادیں معاذ کی یادداشت پر دستک دینے لگیں۔ امی کے ساتھ خالہ کے گھر وہ پورے تین ماہ رہا تھا۔ اس وقت ماں کے ساتھ ماں جیسی مہربان خالہ بھی شدت سے یاد آرہی تھیں۔ دکان کا ملازم اسے گھر کے سامنے چھوڑ کر رخصت ہوا، اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد ایک مرد نے دروازہ کھولا تھا۔ معاذ نے مختصر اپنا تعارف کروایا تھا۔

"ارے یار! اپنے ابا، اماں کا نام لے کر کیا تعارف کروا رہے ہو۔ صرف اپنا پورا نام بتاتے تو میں تمہیں تب بھی پہچان جاتا۔" بندہ اس سے بہت تپاک اور بے تکلفی سے ملا تھا۔

"لگتا ہے، تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ توصیف ہوں میں۔ ایک زمانے میں تم مجھے اپنا گرو مانتے تھے، تمہیں پتنگ اڑانا اور کنچے کھیلنا میں نے ہی تو سکھایا تھا۔"

معاذ اس شخص کی معیت میں گھر کے اندر داخل ہوا تو اس نے مسکراتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا۔ معاذ کو بھی فوراً یاد آگیا۔ وہ خالہ کا سب سے چھوٹا دیور تھا۔ عمر میں معاذ سے پانچ، چھ سال بڑا ہی تھا لیکن وہ تین ماہ جو اس نے یہاں گزارے تھے۔ توصیف کی اس سے خوب دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت توصیف بھائی کی پتنگ بازی سے واقعی بہت متاثر رہتا تھا لیکن توصیف کی بہت کوششوں کے باوجود وہ پتنگ اڑانا نہ سیکھ سکا تھا، اب توصیف ہنستے ہوئے اسے وہ ہی وقت یاد دلا رہا تھا۔

"اماں بہت خوش ہوں گی تم سے مل کر، جب بھی بھابھی کو یاد کرتی ہیں تو اکثر تمہاری امی کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ رشتے میں تو وہ بھی ان کی بھانجی ہی تھیں نا۔"

توصیف بول رہا تھا اور اس بندے کی اپنائیت معاذ کو آج بھی بہت متاثر کر رہی تھی۔ وہ معاذ کو لے کر سیدھا ماں کے پاس آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی سامنے بیڈ پر فاطمہ بیگم تکیوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔ کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔

دروازے کی جانب لڑکی کی پشت تھی اس لیے وہ توصیف کے ساتھ آتے معاذ کو نہ دیکھ پائی تھی۔ اس لیے جب توصیف نے با آواز بلند "دیکھیے تو کون آیا ہے اماں!" کہا تھا تو اس نے جھنجھلا کر توصیف کو ٹوکا تھا۔

"افوہ چاچو! ایک منٹ کے لیے خاموش ہو جائیں۔ اتنی مشکل سے دادی کی دھڑکن سنائی دیتی ہے، بیچ میں کوئی نہ کوئی بول پڑتا ہے۔" اس نے بنا پیچھے مڑے توصیف کو مخاطب کیا۔ بلڈ پریشر چیک ہونے کے احترام میں توصیف کو خاموش ہونا پڑا۔ فاطمہ بیگم بھی خاموشی سے توصیف کے ساتھ کھڑے لڑکے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ساٹھ اور نوے ہے۔ میں ابھی آپ کو انڈا بوائل کر کے کھلاتی ہوں۔ اتنی مشکل سے دھڑکن سنائی

WOMEN SKILLS GROUP

دیتی ہے۔ چاچو! آپ آج ہی مجھے ڈیجیٹل بی پی آپریٹس لاکر دیں۔" لڑکی کان سے اسٹیتھو اسکوپ اتارتے ہوئے پیچھے مڑی۔ چاچو کے ساتھ ایک اجنبی کو کھڑا دیکھ کر قدرے سٹپٹائی تھی۔ توصیف معاذ کو لے کر ماں کے قریب آیا۔

"معاذ آیا ہے اماں! فہمیدہ بھابھی کا بھانجا۔ تہمینہ باجی کا بیٹا۔" اس نے تعارف کروایا تھا۔

فاطمہ بیگم کی یادداشت اس ضعیفی میں بھی غضب کی تھی۔ وہ پلک جھپکنے میں اسے پہچان کر اس سے بہت تپاک اور محبت سے ملی تھیں۔ ابا کا حال احوال دریافت کیا پھر گفتگو امی اور خالہ کے ذکر کی طرف مڑ گئی۔ فاطمہ بیگم آبدیدہ ہوگئی تھیں۔

"یہ لیں دادی! آپ پہلے انڈا کھالیں۔" لڑکی جو چند منٹوں کے لیے کمرے سے غائب ہوئی تھی، جھٹ پٹ انڈا ابال کر پھر کمرے میں داخل ہوئی۔

"حد کرتی ہو بیٹا! بجائے اس کے تم مہمان کی کوئی خاطر کرو۔ تم مجھے انڈا کھلانے کے درپے ہوگئیں۔" فاطمہ بیگم پوتی پر خفا ہوئی تھیں۔

"تو مہمان نے ابلا انڈا تھوڑی کھانا تھا۔ چائے چڑھا کر آئی ہوں، ابھی ٹرے تیار کر کے لے آؤں گی۔ آپ تو انڈا کھائیں۔" وہ نمک، کالی مرچ چھڑک کر دادی کو انڈا اپیش کرنے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ پوری دنیا میں اس کے لیے دادی سے اہم کوئی ہستی نہیں۔

اگرچہ اس نے دادی سے یہ بات بہت دھیمے لہجے میں کی اور معاذ کی سماعت قابل رشک حد تک اچھی نہ ہوتی تو وہ شاید اس لڑکی کا یہ بڑبڑاہٹ نما جملہ سن بھی نہ پاتا۔ لیکن اسے جملہ سمجھ میں آ گیا تھا اور ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ بھی آ گئی تھی۔

"چاچو پلیز، آپ آئیں گے۔ کچھ سامان منگوانا ہے آپ سے۔" کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے توصیف کو مخاطب کیا۔ توصیف نے سر ہلا دیا تھا۔

"توصیف بھائی! کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔" توصیف کو اٹھتا دیکھ کر وہ بول اٹھا تھا۔

توصیف نے ہنستے ہوئے اس کا شانہ تھپکا اور کمرے سے چلا گیا۔

فاطمہ بیگم اس سے تفصیلی حال احوال دریافت کرنے لگی تھیں، یہ جان کر کہ وہ ڈاکٹر ہے، انہیں بہت خوشی ہوئی۔

"میری پوتی بھی ڈاکٹر بن رہی ہے، بڑی مشکل پڑھائی ہے بھئی۔ بچی کا پڑھ پڑھ کر اتنا (اتنا) سا منہ نکل آیا ہے۔" وہ بولیں۔ معاذ کو اپنے اندازے کی درستی پر خوشی ہوئی۔ لڑکی کو دیکھ کر اس نے یہ ہی سوچا تھا کہ شاید اس کا تعلق بھی میڈیکل کے پروفیشن سے ہے۔

"آج اتفاق ایسا ہے کہ تم آئے ہو تو گھر کے سب لوگ ہی گھر پر موجود نہیں۔ میری منجھلی بہو کے میکے میں کوئی فنکشن ہے، اظہار بال بچوں سمیت سسرال گیا ہے۔ توصیف کی بیوی بھی اپنے میکے گئی ہے۔" فاطمہ بیگم نے بتایا۔

"اظہار بھائی تو آرمی میں ہوتے تھے نا۔" معاذ کی یادداشت نے کام کیا۔

ظہیر خالو چار بھائی تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی تو عین جوانی میں ہی امریکہ سدھار گئے تھے۔ انہوں نے ہی خالو کو اپنے پاس بلوایا تھا۔ خالو کے تیسرے بھائی فوج میں تھے۔ توصیف کا نمبر آخری تھا۔

"ہاں تو فوج سے ریٹائر ہوکر اپنے گھر ہی واپس آنا تھا۔ ماشاء اللہ چار بچیاں ہیں اس کی۔ توصیف کے خیر سے دو بچے ہیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔" انہوں نے تفصیلی تعارف کروایا۔ معاذ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم بتاؤ بیٹا! کتنے بچے ہیں تمہارے؟" اس بار شفقت بھرے انداز میں اس سے پوچھا گیا۔ معاذ کچھ جھینپ گیا تھا۔

"ابھی شادی نہیں ہوئی میری۔" اس نے ذرا شرمندہ ہوکر بتایا۔

"اے لو، بتاؤ میاں! اب تک کنوارے ہو۔

میرا توصیف تم سے چار، پانچ برس ہی بڑا ہوگا اور آٹھ برس ہوگئے ہیں اس کی شادی کو۔ ماں تمہاری اللہ کو پیاری ہوگئی، باوا نے تمہاری خاطر دوسری شادی نہ کی۔ بغیر عورت کے تمہارے گھر کا نظام چل کیسے رہا ہے؟" وہ حیران تھیں۔

معاذ اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ تب ہی اس کے سیل فون کی گھنٹی نے اسے اس مشکل صورت حال سے نکالا۔ ابا کا فون تھا، اس نے کال اٹینڈ کی مگر فریقین کو ایک دوسرے کی آواز سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ابا نے ہی کال منقطع کر کے دوبارہ ملائی تھی مگر رابطہ اب بھی ممکن نہ ہو پایا۔

"یہاں سگنلز کا مسئلہ رہتا ہے بیٹا! پچھلے صحن میں چلے جاؤ، آواز آ جائے گی۔" فاطمہ بیگم نے اسے مخاطب کیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ قدیم طرز کے بنے اس وسیع و عریض مکان کا نقشہ معاذ کو بچپن میں بھی بہت بھلا لگتا تھا۔ ساز و سامان کی حد تک تو گھر میں خاصی جدت آ گئی تھی لیکن طرز تعمیر میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا تھا۔

وہ گھوم کر عقبی صحن میں چلا گیا۔ ابا کا نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن اب ان کا نمبر بزی جا رہا تھا۔ معاذ جانتا تھا کہ وہ اب حیدر کو فون کر رہے ہوں گے حالانکہ وہ انہیں ملتان پہنچ کر اپنی خیریت سے آگاہ کر چکا تھا لیکن وہ ہر چند گھنٹوں بعد فون کر کے اس کی خیریت دوبارہ جاننا چاہتے تھے۔ ہمیشہ سے ان کی یہ ہی روٹین تھی' معاذ چڑنے کے باوجود سخت سے سخت مصروفیت میں بھی ان سے جوابی رابطہ کیے بنا نہ رہ پاتا۔

چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ نمبر ملایا تھا مگر اب بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ وہ مایوس ہو کر واپس پلٹ رہا تھا کہ پچھلے صحن میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے توصیف بھائی کی آواز سنائی دی۔

"ہاں بھئی۔ یہ آ گئے ہیں گرم گرم سموسے، چکن رول بسکٹ اور نمکو۔ اب فٹافٹ سامان نکال کر کمرے میں لے آؤ۔"

"دیکھ لیجیے چاچو! اتنی خاطر کے باوجود دادی اس مہمان کو کھانے پر بھی ضرور روکیں گی۔ کل میرا پیپر ہے اور ابھی تک ایک لفظ نہیں پڑھا۔"

لڑکی کی روہانسی آواز معاذ کے کانوں میں پڑی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا واپس زہرہ بیگم کے کمرے میں آ گیا۔ ذرا سی دیر میں وہ من موہنی سی لڑکی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے آن موجود ہوئی۔ توصیف بھی آ گیا تھا اور اسے بار بار تکلف نہ برتنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ ذرا سی دیر بیٹھ کر معاذ نے رخصت چاہی تھی۔

"ارے ایسے کیسے جانے دوں۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔"

فاطمہ بیگم نے اسے جانے سے روکا تھا۔ ان کی پوتی اس وقت چائے کے برتن سمیٹ رہی تھی، اس نے بے ساختہ شکوہ کناں نظروں سے چاچو کو دیکھا گویا کہہ رہی ہو، دیکھا میں نے کہا تھا نا۔ معاذ جی ہی جی میں شرمندہ ہوا۔ میڈیکل کی پڑھائی کتنی مشکل ہوتی ہے، اس سے بہتر یہ کون جانتا تھا۔ اس لڑکی کا کل پیپر تھا لیکن دادی کو پوتی کے پرچے کی کوئی فکر ہی نہ تھی۔ وہ اسے بصد اصرار روک رہی تھیں، معاذ کی بار بار کی معذرت پر کچھ خفا ہوگئیں۔ معاذ کو مجبوراً رکنا ہی پڑا تھا۔

"چائے کے ساتھ اتنا کچھ لے لیا ہے، کھانے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ جو بھی گھر میں سادہ سا بنا ہوگا، میں وہی کھالوں گا۔ اہتمام مت کیجیے گا۔"

اس نے زہرہ بیگم کو بصد احترام مخاطب کیا۔ ان کی خفا خفا سی پوتی نے کچن پر پھر بھی خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ مٹر پلاؤ، شامی کباب، آلو قیمہ، رائتہ، سلاد، میٹھے میں رس ملائی تھی۔ وہ شاید بازار سے منگوائی گئی تھی۔ کھانا لذیذ تھا، معاذ بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی کافی کھا گیا۔

کھانے پر اتنا اہتمام اسے متاثر کر رہا تھا جب کہ زہرہ بیگم کو قلق ستا رہا تھا کہ اس کی خاطر مدارت ٹھیک سے نہیں ہوئی۔

WOMENSKILLS GROUP

"اتفاق ایسا ہے بیٹا کہ میری دونوں ہی بہویں گھر پر نہیں۔ میری پوتی نے اپنی سمجھ کے مطابق کھانا بنالیا۔ اگر تم آنے سے پہلے اطلاع دے دیتے تو میں کھانے پر کچھ اہتمام تو کر لیتی۔" وہ شرمندہ سی ہو رہی تھیں۔

معاذ کو یاد تھا کہ بچپن میں خالہ کے گھر دستر خوان بہت وسیع ہوتا تھا۔ کئی طرح کے کھانے ایک وقت میں دستر خوان کی زینت بنتے۔

فاطمہ بیگم بہت وضع دار خاتون تھیں۔ ان کا دل اور ہاتھ دونوں ہی بہت کھلا تھا۔ بہویں بھی ان ہی کے رنگ میں رنگی تھیں۔ ہاں پوتیاں ساری کی ساری نکمی تھیں اور وہ ان کے نکمے پن کڑھتی رہتی تھیں۔

دوسری طرف معاذ یہ سوچ رہا تھا کہ میڈیکل کی ٹف پڑھائی کے ساتھ اس لڑکی میں گھر داری کا بھی کتنا سلیقہ ہے۔ لذیذ ترین کھانا بہت نفاست سے سرو کیا گیا تھا۔ معاذ کے حلقہ احباب میں جتنی بھی لڑکیاں تھیں، ان میں اکثریت کو گھر داری سے نہ شغف تھا، نہ ہی اس کی سوجھ بوجھ تھی۔ اپنے پھوہڑ پن کو نہایت فخریہ انداز میں بیان کرتیں اور ایک یہ لڑکی تھی جو ذہین بھی تھی (ذہانت تھی تب ہی ڈاکٹر بن رہی تھی نا)۔ خوب صورت بھی اور سلیقہ مند بھی۔ طبیعت میں بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ معاذ جیسے ہینڈسم لڑکے کو اس نے نظر بھر کر دیکھا تک نہیں۔ وہ اس کے لیے صرف اس کی دادی کا مہمان تھا، جس کی خاطر اسے مارے باندھے کرنی پڑی تھی۔

معاذ نے اس گھر میں محض چند گھنٹے گزارے تھے لیکن چند گھنٹوں کا تصور اس کے دماغ پر حاوی ہو گیا۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اسی من موہنی صورت والی لڑکی کو سوچے گیا۔

☆☆☆

پہلی نگاہ کی محبت والی بات کو تو خیر بے وقوفی گردانتا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اس لڑکی کے خیال سے جان نہ چھڑا پا رہا تھا۔ آخر اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ لڑکی اس کے متوقع لائف پارٹنر کے خاکے پر سو فیصد پوری اتری ہے اور اب مزید دیر کرنا حماقت ہوگی۔ اس لیے جب وہ شادی اٹینڈ کر کے واپس لاہور پہنچا اور ابا نے نہایت اشتیاق سے دریافت کیا کہ کیا حیدر کی شادی میں کوئی لڑکی اس کے جی کو لگی ہے تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔

ابا ہر شادی میں اسے اس تاکید کے ساتھ بھیجتے تھے کہ وہ تقریب میں شامل لڑکیوں پر ایک نظر ضرور ڈالے۔ ابا کو خوش فہمی تھی کہ کوئی سجی سنوری لڑکی کھٹاک سے ان کے بیٹے کے دل میں اتر جائے گی۔ انہیں کیا پتا تھا کہ ان کے بیٹے کے دل میں تو ایک لاپروا سے حلیے والی لڑکی گھر کر گئی ہے۔ اس نے ابا کو اپنے جذبات کی شدت سے آگاہ کرنا تو مناسب نہ جانا، بس سرسری سے انداز میں انہیں بتا دیا تھا۔

"فاطمہ نانی کی پوتی ہے۔ ڈاکٹر بن رہی ہے۔ میرا خیال ہے، آپ وہاں بات چلا کر دیکھیں۔ وہ لوگ بہت وضع دار اور ملنسار ہیں۔ رشتہ داری جوڑنے کے لیے مجھے وہ گھرانہ بہت مناسب لگا ہے۔"

معاذ نے بردبار سے لہجے میں ابا کو مخاطب کیا۔ لڑکی کی پسندیدگی کو دل میں چھپا کر اس نے گھرانے کی معقولیت پر زیادہ زور دیا تھا اور ابا تو اس کی بات سن کر خوشی سے نہال ہو گئے۔

"کتنی حیرت کی بات ہے۔ یہ بات کبھی میرے دماغ میں کیوں نہ آئی۔ ایسے سلجھے ہوئے، مہذب لوگ ہیں پھر تمہاری امی کے رشتہ دار بھی ہیں۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ صرف تمہاری خالہ کو ہی اللہ نے اولاد نرینہ سے نوازا تھا۔ نواز اور اظہار کی بچیاں ہی تھیں۔ چھوٹے توصیف کی اولاد کا مجھے علم نہیں۔ میں نے کبھی سوچا تک نہیں کہ فاطمہ خالہ کی پوتیوں میں سے کسی ایک کو تمہارے لیے دیکھوں۔ حیرت ہے، اتنے سامنے کی بات میرے دماغ میں نہ سمائی۔"

ابا بے تحاشا خوش ہو کر اپنی حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ معاذ بس خاموشی سے مسکراتا رہا۔

"میں پہلی فرصت میں ملتان جا کر تمہارے رشتے کی بات چلاتا ہوں۔" انہوں نے ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے ابا؟" اس نے اوپرے دل سے کہا۔ خواہش اس کی یہ ہی تھی کہ پلک جھپکتے میں معاملہ طے ہو جائے۔ وہ لڑکی اچھی اتنی لگی تھی۔

"کمال کرتے ہو میاں! تمہاری عمر تیس کا ہندسہ عبور کر چکی ہے۔ خیر سے اس دسمبر میں تم اپنی اکتیسویں سالگرہ مناؤ گے اور کہہ رہے ہو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" ابا نے بیٹے کو خفگی سے گھورا تھا۔

☆☆☆

اپنے کہے کے عین مطابق انہوں نے اگلے ہی ہفتے ملتان کے لیے رخت سفر باندھ لیا تھا۔ چار دن وہاں قیام کر کے وہ پانچویں دن اس خوش خبری کے ساتھ لوٹے تھے کہ انہوں نے نہ صرف معاذ کی بات پکی کر دی ہے بلکہ دو ماہ بعد اس کی شادی ہے۔

"ان لوگوں نے فوراً ہامی بھر لی؟" معاذ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ارے تو کاہے کو انکار۔ ایسا خوبرو، لائق، فائق میرا بیٹا۔ اتنا قابل ڈاکٹر ہے۔" ابا نے اسے فخر سے دیکھا۔ آج کل دونوں باپ بیٹے کے مثالی تعلقات تھے۔ ابا کی بات سن کر معاذ مسکرا دیا۔

"ڈاکٹر تو وہ بھی ہے ابا۔" اس نے مسکرا کر انہیں مخاطب کیا۔ ابا کی مسکراہٹ یک لخت سمٹی۔ انہوں نے فوری طور پر بیٹے کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

"نہیں بیٹا! میں نے تمہاری بات فاطمہ خالہ کی ڈاکٹر پوتی سے طے نہیں کی۔ جو بچی ڈاکٹر بن رہی ہے وہ تو اظہار احمد کی بیٹی ہے۔ میں نے نواز احمد کی بیٹی سے تمہارا رشتہ طے کیا ہے حورالعین نام ہے بچی کا۔"

ابا نے معاذ کی سماعتوں پر جیسے بم گرایا تھا۔ وہ بے یقینی سے باپ کو تکنے لگا۔ اس کی نگاہوں سے خائف ہو کر ابا نے ذرا مزید وضاحت کی۔

"جو بچی ڈاکٹر بن رہی ہے، وہ تمہارے جوڑ کی نہیں۔ بہت کم عمر ہے، لاابالی سی بھی لگتی ہے اور باتوں باتوں میں فاطمہ خالہ نے بتایا تھا کہ اظہار احمد کی بیوی اپنی اس بیٹی کا رشتہ اپنے بھائی کے ہاں کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ وہ لڑکا خود ڈاکٹر بن رہا ہے، اظہار احمد کی بڑی بیٹی کا نکاح تو پہلے ہی ہو چکا۔ دو ماہ بعد اس کی رخصتی ہے، ان کی باقی دو بچیاں تو ابھی اسکول میں ہی پڑھ رہی ہیں۔ آٹھویں، نویں جماعت میں ہوں گی۔ ہاں نواز احمد کی ایک ہی بیٹی ہے، وہ خود تو امریکہ سیٹل ہیں، بچی یہاں ددھیال میں رہتی ہے۔ بہت پیاری بچی ہے۔ باادب، بااخلاق، سلیقہ مند، بس یوں سمجھو کہ تم اور میں دونوں مل کر بھی جوتیاں گھساتے تو ایسی پیاری لڑکی نہ ڈھونڈ پاتے۔ خوب جچے گی تمہارے ساتھ۔ میں نے فاطمہ خالہ کی رضامندی پا کر بچی کے ہاتھ پر شگن کا روپیہ رکھ دیا اور ان سے یہ بات بھی منوالی کہ دو ماہ بعد جب وہ اپنی بڑی پوتی کو رخصت کریں گی تو ساتھ ہی حور کو بھی تمہارے سنگ رخصت کر دیں۔"

ابا نے بیٹے کو اپنی تفصیلی کارکردگی سے آگاہ کیا لیکن معاذ جس طرح لب بھینچے انہیں دیکھ رہا تھا، انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔

"کیا ہوا ہے؟ مصر کی ممی کی طرح بے حس و حرکت کیوں بیٹھے ہو۔" انہوں نے جھلا کر پوچھا۔

"میں نے آپ کو کہہ کر بھیجا تھا کہ آپ فاطمہ نانی کی ڈاکٹر پوتی کے لیے میرا رشتہ دیں گے۔ یہ نہیں کہا تھا کہ وہاں جا کر کسی بھی لڑکی کا رشتہ مانگ لیں گے۔" وہ پھٹ پڑا تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ جو بچی ڈاکٹر بن رہی ہے، وہ تمہارے جوڑ کی نہیں۔ کم عمر لگتی ہے۔" ابا نے خفا ہو کر اسے دوبارہ بتایا۔

"آپ میرا پروپوزل دے کر تو دیکھتے اگر وہ لوگ انکار ہو جاتا تو خاموشی سے واپس آ جاتے۔ ضروری تھا کہ وہیں اسی گھر میں میری قسمت پھوڑی جاتی۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"تم نے ہی کہا تھا کہ وضع دار اور ملنسار گھرانہ ہے اور رشتہ جوڑنے کے لیے بہت معقول فیملی ہے۔" ابا اس کے ردعمل پر حیران ہوتے ہوئے اس کی بات

WOMEN SKILLS GROUP

یاد دلانے لگے۔

"بھاڑ میں گئی وضع دار اور ملنسار فیملی۔ آپ کم از کم بات پکی کرنے سے پہلے مجھ سے فون پر ہی میری رائے پوچھ لیتے۔ ویسے تو دن میں چھتیس بار مجھے فون کرتے ہیں اور اتنی اہم بات مجھے بتائی تک نہیں کہ ڈاکٹر لڑکی کے بجائے کسی دوسری لڑکی کو منتخب کر آئے ہیں۔"

"کیا ڈاکٹر، ڈاکٹر لگا رکھی ہے۔ شادی کر کے گھر بسانا ہے یا بیوی کے ساتھ مل کر ہسپتال بنانے کا ارادہ ہے۔" ابا کی برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔ بیٹے کی مسلسل بدلحاظی پر وہ اس پر چڑھ دوڑے۔

"بہرحال ابا! میں کسی ان دیکھی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔" اس نے قطعی انداز میں باپ کو باور کروایا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو معاذ! میں زبان دے آیا ہوں اور پھر کہاں سے ڈھونڈتا میں تمہارے لیے ایسا رشتہ۔ بہت اچھی بچی ہے۔ میں چار دن وہاں رہ کر آیا ہوں۔ اس بچی کی عادتیں اور مزاج بہت بھلا ہے، اپنے باپ کی بات کا اعتبار کرو۔ چاند، سورج کی جوڑی لگے گی تم دونوں کی۔ بہت خوش رہو گے تم اس کے ساتھ۔"

ابا اب اسے پچکار رہے تھے۔ معاذ غصے اور بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

معاذ کی عقل ماؤف ہو چکی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابا اس کے ساتھ ایسی واردات کر سکتے ہیں۔ کسی ان دیکھی لڑکی سے شادی کرنے کو اس کا دل قطعی راضی نہ ہو رہا تھا لیکن انکار کرنے کی سب راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اگلے ہی ہفتے فاطمہ بیگم، اپنے بیٹے اظہار احمد کے ساتھ لاہور آن موجود ہوئیں۔

"طبیعت اتنی مضمحل تھی کہ چند گھنٹوں کے سفر کی بھی ہمت نہیں تھی، بس یہ سوچ کر ہمت پکڑی کہ حور یہ نہ سمجھ لے کہ دادی نے سر پر سے بوجھ کی طرح اتار پھینکا ہے۔ بات تو ہمارے تمہارے درمیان طے ہو ہی گئی ہے۔ نجیب میاں! بس میں تو رسمی طور پر معاذ سے ملنے آئی ہوں۔"

فاطمہ بیگم نے محبت بھری نگاہ معاذ پر ڈالی اور کرارے کرارے نوٹ اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمائے۔ ابا بہت مسرور اور مطمئن تھے جب کہ معاذ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

معزز مہمانوں سے بدتہذیبی برتنے کا تو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن ابا کے لیے دل میں طیش بڑھتا جا رہا تھا۔ ہاسپٹل میں ایمرجنسی کا بہانا کر کے وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ موبائل بھی آف کر دیا۔ رات کی بھی ڈیوٹی لگوالی۔ اگلے دن جب گھر پہنچا تو ابا کا خفگی سے برا حال تھا۔

"تمہارا انتظار کر کے ابھی نکلے ہیں وہ لوگ۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے تمہاری غیر موجودگی کے کیا کیا بہانے تراشے ہیں۔ وہ تو تمہارا پروفیشن ایسا ہے کہ ہاسپٹل میں ایمرجنسی کا کہہ کر بھرم رکھ لیا۔ تمہاری فرض شناسی سے الٹا متاثر ہی ہو رہے تھے۔ اصل صورت حال کا تو مجھے علم تھا نا۔ خفت اور شرمندگی سے میرا برا حال تھا۔"

ابا اس پر بگڑ رہے تھے۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ انہیں سنتا رہا۔

☆☆☆

بعد میں آنے والے دن کچھ اسی انداز سے گزرے تھے۔ کبھی وہ اپنی فرسٹریشن ابا پر نکالتا۔ کبھی وہ بیٹے کو بے بھاؤ کی سناتے۔ معاذ کی ناشکری اور کفرانِ نعمت پر انہیں سخت تاؤ چڑھتا۔ آخر کار ابا نے بیٹے سے الجھنا اور اسے سمجھانا ترک کر دیا تھا۔

شادی کے دن قریب آ چکے تھے، انہوں نے شادی کے انتظام اور تیاریوں کے لیے کمر کس لی۔ ان کے وہ سارے دوست جو معاذ سے ماضی میں مفت علاج معالجہ کراتے تھے، وقت آنے پر اس کی شادی کی تیاریوں میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ مرزا صاحب کی بیگم اور بہوویں بری کے ملبوسات تیار کروا رہی تھیں۔ ہاشمی صاحب کی بیٹی کو جیولری بنوانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ہال کی بکنگ اور اس کی نوعیت کے دوسرے انتظامات اکبر صاحب کے بیٹے دیکھ رہے تھے اور معاذ جو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ اس کے تعاون کے بغیر ابا اس مرحلے سے اکیلے کیسے نمٹیں گے۔ ابا کا انتظامی نیٹ ورک دیکھ کر حیران بھی تھا اور غصے کا گراف بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

ابا تو ایسے بے نیاز ہو گئے تھے گویا اس کی ناراضی اور خفگی سے انہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔

"آپ دیکھ لیجیے گا، میں عین بارات والے روز گھر سے بھاگ جاؤں گا۔" وہ ابا کو دھمکاتا۔

دھمکانے کے بعد اندازہ ہوتا کہ کچھ "زنانہ" قسم کی دھمکی دے دی ہے۔ ابا پر دھمکی کا مطلق اثر نہ ہوتا۔ وہ کاغذ، قلم تھامے مہمانوں کی فہرست فائنل کرتے رہتے۔

"میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گا ابا۔" اس بار مردانہ انداز میں للکارا۔

ابا ہاتھ ہلا کر بظاہر کان پر بیٹھی مکھی اڑاتے اور پھر سے کاغذ پر قلم گھسیٹنے لگتے۔ معاذ دانت پیسنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا۔

نزاکت دونوں باپ بیٹے کے درمیان چھڑی سرد جنگ کے پس منظر سے آگاہ ہو چکا تھا اور معاذ بھائی کی ہمدردی میں وہ بڑے صاحب کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔

"جب معاذ بھیا شادی کے لیے راضی ہی نہیں ہیں بڑے صاحب! تو آپ کیوں زبردستی کر رہے ہیں۔ شادی تو دل کی خوشی کا نام ہے، یہ کوئی زبردستی کا سودا تھوڑی ہے۔"

نزاکت نے کل رات نشر ہونے والے ڈرامے کے ڈائیلاگز دہراتے ہوئے بردبار سے لہجے میں ابا کو سمجھایا۔ معاذ کمرے کے باہر سے گزر رہا تھا۔ نزاکت کی بات کان میں پڑی تو اس بے وقوف سے لڑکے پر پیار آیا۔ ابا کو کیا سمجھ داری کی بات بتا رہا تھا لیکن ابا نزاکت کی بات سن کر ہنس پڑے تھے۔

"ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں نزاکت میاں! اور دکھانے کے اور۔ یہ جو تمہارے معاذ بھیا ہیں نا، انہیں مجھ سے خفا ہونے اور مجھ پر بگڑنے کے لیے کوئی جھوٹا سچا بہانا چاہیے ہوتا تھا۔ یہ صرف مجھے پریشان کرنے کے لیے ناراضی کا ڈرامہ رچا رہے ہیں ورنہ دل میں تو اندر سے لڈو پھوٹ رہے ہوں گے اور دیکھ لیجیے گا، شادی کے بعد کیسے بیوی کو پیارے ہو جائیں گے۔ پھر ہمیں تمہیں خاطر میں بھی نہ لائیں گے۔" ابا نے بھرپور وثوق سے پیش گوئی کی تھی۔

"تو معاذ بھائی کی دھمکیاں؟" نزاکت اب بھی فکرمند تھا۔

"ارے وہ دھمکیاں نہیں گیدڑ بھبکیاں ہیں۔" ابا کے اطمینان میں فرق نہ آیا اور اس اطمینان کو تہس نہس کرنے کے لیے معاذ کی سمجھ میں کوئی طریقہ نہ آیا۔

☆☆☆

پیشن گوئی ابا کی ہی پوری ہوئی۔ اس کی دھمکیاں گیدڑ بھبکیاں ہی ثابت ہوئیں۔ وہ مقررہ تاریخ پر بارات لے کر ملتان روانہ ہوا اور دلہن رخصت کروا کر واپس لاہور آن پہنچا۔

ابا کی نصف پیش گوئی پوری اس لیے ہوئی کہ معاذ ایک معزز گھرانے کی عزت کی خاطر بے اختیار ہو گیا تھا لیکن وہ ابا کی باقی کی نصف پیش گوئی غلط ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ابا سوچے بیٹھے تھے کہ اپنی منتخب کردہ لڑکی سے زبردستی اس کی شادی کروا دیں گے اور وہ اپنی دلہن کے سنگ ہنسی خوشی زندگی کے دن بسر کرنا شروع کر دے گا۔ پھر راوی چین ہی چین لکھے گا۔ وہ راوی اور ابا کے چین کو بے چینی میں بدلنے کا بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔

سہاگ رات جب وہ بیڈروم میں داخل ہوا تو ابا کے ایک نسبتاً جوان دوست کی زیر نگرانی تیار کی ہوئی سیج کی لڑیوں میں سے صرف دلہن کا جھلملاتا لباس نظر آ رہا تھا۔ معاذ نے اپنے دوستوں کو شادی میں مدعو کرنا تو دور کی بات انہیں اطلاع دینا بھی مناسب نہ

WOMEN SKILLS GROUP

جاتا۔ اس کی بارات بھی اس لحاظ سے انوکھی تھی کہ دولہا کے ایک بھی دوست کے بجائے باراتیوں کی اکثریت ابا کے دوستوں پر مشتمل تھی۔

معاذ نے پیچ کی لڑیاں ہٹا کر دلہن کا گھونگھٹ ہٹانے کا تکلف نہ کیا تھا۔ اس نے دور صوفے پر بیٹھ کر خنک لہجے میں نئی نویلی دلہن کو مخاطب کیا تھا۔

"یہ شادی صرف اور صرف میرے ابا کی زبردستی کی وجہ سے ممکن ہو پائی ہے۔ میں فی الحال اس رشتے کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہا۔ آپ یہ بھاری بھرکم لباس بدل کر سکون سے سو جائیں۔"

اس نے سپاٹ انداز میں دلہن کو مخاطب کیا۔ دل کا ایک گوشہ ملامت بھی کر رہا تھا۔ جو کچھ ہوا، اس میں اس بے چاری لڑکی کا کیا قصور لیکن پھر اس نے دل کو خود ہی ڈپٹ دیا۔

"ابا کو ان کے کیے کی تھوڑی بہت سزا ملنی چاہیے۔ جب میری ازدواجی زندگی کی ناخوش گواری کا پتا چلے گا تو پھر اپنے اندازے غلطی پر کفِ افسوس ملیں گے۔"

وہ لڑکی جو پہلی ہی نگاہ میں اس کے دل میں کھب گئی تھی اور آج تک جس کے تصور سے وہ پیچھا نہ چھڑا پایا۔ ابا نے اس کا رشتہ مانگنے کی سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی۔ اگر رشتہ مانگنے کے بعد وہاں سے انکار ہوتا تو معاذ اپنے دل کو سمجھا بھی لیتا۔ معاذ کیسے اس لڑکی کی ان دیکھی کزن کو جیون ساتھی کے روپ میں قبول کر لیتا۔ دماغ بھی سمجھانے کی کوشش بھی کرتا تو دل سمجھنے سے انکار کر دیتا۔

اپنی ساری فرسٹریشن اس نے سپاٹ سے لہجے میں اس نئی نویلی دلہن کی طرف منتقل کر دی۔ نکاح کے چند گھنٹوں بعد ہی جس کو یہ مژدہ سننے کو ملا کہ شادی اس کے شوہر کی مرضی سے نہیں ہوئی ہے۔ وہ کچھ لمحوں تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ معاذ نے جیب سے موبائل نکال کر کینڈی کرش کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

وہ آہستہ روی سے اٹھی، پہلے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے زیورات اتارے تھے پھر اپنے ہیئر اسٹائل سے نبرد آزما ہوئی تھی۔ معاذ نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں، پھر وہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔

جب آرام دہ لباس پہن کر واپس آئی تو ڈریسنگ ٹیبل پر بکھری جیولری سمیٹنے لگی تھی اور تب معاذ کی غیر ارادی نگاہ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر پڑی تھی۔ اسے لگا، اس کی بصارت کو دھوکا ہوا ہے، لڑکی کا عکس اس معاذ کا الوژن ہے جو لڑکی اتنے دنوں سے بلاناغہ اس کے خوابوں میں آ رہی تھی، وہ مجسم ہو کر اس کے سامنے کیسے موجود تھی۔

"تم... میرا مطلب ہے آپ۔" وہ بے ساختگی سے بولے بنا نہ رہ سکا۔ حور نے مڑ کر اسے دیکھا۔

وہ تو وہی تھی، سو فیصد وہی۔ معاذ بنا پلکیں جھپکے اسے تک رہا تھا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" خشک لہجے میں اس نے معاذ کو مخاطب کیا۔

"آپ تو ڈاکٹر تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ..." معاذ نے بات ادھوری چھوڑی۔ اسے خود اندازہ ہو گیا کہ جملہ بے ربط سا ہے اس کی سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ اپنا مافی الضمیر کیسے واضح کرے۔

"آپ ڈاکٹر ہیں نا۔" اس بار سوال مختلف انداز میں دہرایا۔ حور نے نفی میں گردن ہلا دی لیکن آنکھوں میں استعجاب آمیز تاثر تھا۔

"آپ کو یہ بتا کر شادی کی گئی ہے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔" اس نے الجھ کر پوچھا۔ معاذ نے نفی میں گردن ہلا دی، اب وہ جملہ نئے ڈھب سے ترتیب دینا چاہ رہا تھا۔

"جب میں چند ماہ پہلے آپ لوگوں کے ہاں آیا تھا تو فاطمہ نانی نے بتایا تھا کہ آپ ڈاکٹر بن رہی ہیں۔" معاذ نے جملہ ترتیب دے ہی لیا تھا۔

"دادی جان نے میرے متعلق بتایا تھا کہ میں ڈاکٹر بن رہی ہوں۔" وہ بے یقینی سے پوچھنے لگی۔

معاذ نے یادداشت کو ٹٹولا۔ قابل رشک سماعت کی طرح اس کی یادداشت بھی قابل رشک

تھی۔ اسے یاد آیا کہ فاطمہ بیگم نے پوتی کی غیر موجودگی میں بتایا تھا کہ میری پوتی بھی ڈاکٹر بن رہی ہے، اوہ تو گویا یہ وہ والی پوتی نہ تھی۔ معاذ نے خود بخود یہ کیسے سوچ لیا کہ انہوں نے اسی پوتی کا ذکر کیا ہے۔ وہ تو چھ عدد پوتیوں کی دادی کے رتبے پر فائز تھیں اور اس روز ان کی پانچ پوتیاں غیر حاضر تھیں۔ یہ بات ان میں سے بھی تو کسی کے متعلق ہو سکتی تھی پھر اس نے کیوں سوچا کہ وہ ہی ڈاکٹر ہے۔ معاذ دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے پوچھ رہا تھا پھر جیسے اسے کچھ اور یاد آیا۔

"لیکن آپ اپنی دادی کا بلڈ پریشر بھی تو چیک کر رہی تھیں۔" اس نے پوچھا۔

"بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے ایم بی بی ایس کی ڈگری لینا ضروری ہے کیا؟" حور العین نے تیکھے تیوروں سے پوچھا۔ معاذ گڑبڑا کر رہ گیا۔

"بائی داوے، دادی کا بلڈ پریشر تو میرے اظہار چاچو کی سب سے چھوٹی بیٹی بجی بھی چیک کر لیتی ہے اور وہ ابھی نائنتھ کلاس میں پڑھتی ہے۔" حور العین نے اسے جتانے والے انداز میں باور کروایا۔

معاذ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اب ایسا کون سا فقرہ بولے جو آدھے گھنٹے پہلے کہی گئی بات کا اثر زائل کر دے لیکن اب حور العین کے بولنے کی باری تھی۔

"آپ ذرا مجھے اپنا سیل فون دیں گے۔" اس نے قریب آ کر معاذ کو مخاطب کیا۔ معاذ نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ایکچوئلی میرے سیل کی چارجنگ ختم ہو گئی ہے۔ شادی کی افراتفری میں چارجنگ پر لگانا یاد ہی نہیں رہا۔ مجھے دادی جان سے بات کرنی ہے۔" وہ سپاٹ سے انداز میں بولی اور معاذ جو ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے اپنا موبائل تھمانے ہی لگا تھا یک لخت اپنا ہاتھ پیچھے ہٹایا۔

"وہ دراصل چارجنگ تو میرے موبائل کی بھی ختم ہو گئی ہے۔" معاذ کو بروقت بہانا سوجھا تھا۔

"جس طرح آپ شادی پر زبردستی راضی ہوئے ہیں، بالکل ویسے ہی میں بھی اس شادی پر تیار نہ تھی۔ میں کسی ڈاکٹر سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دادی نے مجھے زبردستی اس رشتے پر راضی کیا۔" وہ بولی تھی۔

"آپ کسی ڈاکٹر سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی تھیں؟" معاذ نے کچھ خفا کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

"دیکھیے میں جانتی ہوں، اسٹوڈنٹ لائف میں ہر ڈاکٹر دو، تین ناکام عشق بھگتا چکا ہوتا ہے۔ وہ عشق اس کے دماغ سے کبھی نہیں نکلتے اور اپنی بیوی میں وہ اپنی سابقہ محبوبہ کی پرچھائیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ میں ایسی زندگی نہیں جینا چاہتی تھی اور دیکھیے، میرا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ آپ بھی پسند کسی اور کو کرتے ہوں گے اور شادی کسی اور سے کرنا پڑی۔ میں دادی جان کو بتاؤں گی، اپنے خدشے اور اندازے کی درستی کے بارے میں۔"

وہ نروٹھے پن سے بول رہی تھی۔ معاذ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح نئی نویلی دلہن کی غلط فہمی دور کرے لیکن نئی نویلی کچھ سننے کے موڈ میں نہ لگ رہی تھی۔ وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

"پھر مجھے آپ کی شخصیت بھی متاثر کن نہ لگی تھی۔ جب چند مہینے پہلے آپ ہمارے ہاں آئے تھے تو میں نے ویسے تو آپ پر ایک سرسری نگاہ ہی ڈالی تھی لیکن جب بعد میں دادی نے بتایا کہ آپ ڈاکٹر ہیں تو مجھے یقین نہ آیا۔ شکل سے تو آپ مجھے واجبی سے پڑھے لکھے کوئی دکان دار لگے تھے۔"

حور نے انکشاف کیا۔ معاذ کو یک دم طیش آ گیا۔ اسٹوڈنٹ لائف اور پھر پروفیشنل لائف میں لڑکیاں اس پر ہمہ وقت نثار ہونے کو تیار رہتی تھیں۔ کوئی اس کی وجاہت پر فریفتہ تھی تو کوئی اس کی شان دار شخصیت کے گن گاتی تھی اور موصوفہ فرما رہی تھیں کہ وہ اسے کوئی واجبی سا پڑھا لکھا دکان دار بھی لگا تھا۔

"دادی نے بہت سمجھا بجھا کر مجھے اس رشتے

WOMEN SKILLS GROUP

کے لیے راضی کیا تھا۔ آپ کی مرحومہ والدہ کی وجہ سے دادی کو آپ سے بھی بہت پیار تھا۔ اب میں انہیں بتاؤں گی ان کے اس پیارے نے ان کی پیاری پوتی کو کیا کچھ کہہ سنایا ہے۔"

وہ چھٹانک بھر کی لڑکی اسے دھمکا رہی تھی اور معاذ سوچ رہا تھا کہ اس نے تو بامشکل ڈیڑھ فقرہ بولا تھا۔ سب کچھ تو دادی کی پیاری پوتی ہی سنا رہی ہے۔ اس لڑکی نے معاذ کی مردانہ انا کو بہت برے طریقے سے ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ بھول گیا کہ یہ وہ ہی لڑکی ہے جس سے شادی نہ ہونے کے سوگ میں وہ کچھ دیر پہلے تک مبتلا تھا۔ اسے نئے سرے سے ابا پر ہی طیش چڑھا۔ کیا زبان دراز قسم کی بہو پسند کی تھی انہوں نے یعنی کہ سہاگ رات شوہر کو تڑی لگا رہی ہے کہ وہ اپنی دادی سے فون کرکے اس کی شکایت لگائے گی اور دیدہ دلیری کی انتہا تھی کہ شکایت لگانے کے لیے فون بھی اسی کا مانگا جا رہا تھا۔

"تم بھی اس رشتے پر راضی نہ تھیں اور میرے ساتھ بھی زبردستی ہوئی ہے لیکن فیکٹ یہ ہے کہ اب ہم دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کچھ ٹائم لینا چاہیے، بصورت دیگر کسی اور آپشن پر غور کریں گے۔ ہاں اگر تم ابھی اسی وقت معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے اپنی دادی سے بات کرنا چاہتی ہو تو لو کرلو بات۔ اتنی چارجنگ تو ہے کہ تمہاری بات ہوجائے۔"

معاذ نے موبائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے خشک لہجے میں اسے مخاطب کیا، گویا بال اس کے کورٹ میں لڑھکا دی۔ اس نے کچھ لمحوں کے لیے سوچا تھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ولیمے کے فنکشن میں معاذ کے سب سسرالی پہنچے تھے صرف دادی ساتھ نہ آئی تھیں اور معاذ نے ان کے نہ آنے پر شکر کیا تھا۔ وہ سب سسرالیوں سے خندہ پیشانی سے ملا تھا۔ کن اکھیوں سے حورالعین کو بھی دیکھتا رہا، کہیں وہ کسی اپنے سے اس کی شکایت تو نہیں جڑ رہی لیکن شکر تھا سب خیریت رہی۔

رسم و رواج کے مطابق وہ حورالعین کو اپنے ساتھ لے گئے۔ معاذ نے دو دن بعد اسے واپس لینے جانا تھا لیکن یہاں بھی معاذ کی پروفیشنل مصروفیت کا بہانہ آڑے آیا، اس نے ابا سے صاف کہہ دیا کہ وہ دلہن کو لینے نہیں جا رہا۔ اگر ابا جانا چاہتے ہیں تو شوق سے جاکر بہو کو لے آئیں۔ ابا کو بتائے بغیر اس نے توصیف کو فون کرکے معذرت ضرور کرلی تھی۔

"ہمارے وارڈ میں آل ریڈی تین ڈاکٹر چھٹی پر ہیں توصیف بھائی! ان کی مجبوری زیادہ سنگین ہے بس اسی لیے انہیں چھٹی مل گئی اور میری چھٹی کینسل کردی گئی۔ فاطمہ نانی سے میری طرف سے معذرت ضرور کرلیجیے گا۔ حور کو لینے کے لیے میں ابا کو بھیج رہا ہوں۔" اس نے توصیف کو آگاہ کیا۔

توصیف نے خندہ پیشانی سے اس کی معذرت قبول کرلی۔ ابا البتہ اس کی ہٹ دھرمی پر پریشان ہو رہے تھے۔ سمدھیانے جاکر یقیناً انہوں نے بھی معاذ کے نہ آنے پر معذرت کرلی تھی لیکن معاذ کو ان کی پریشانی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

ابا بہو کو لے کر واپس آ گئے تو معاذ کے خدشات سے دھڑکتے دل کو کچھ قرار آیا لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ ابا کی بہو ابا کے بیٹے کو لفٹ کروانے پر قطعی تیار نہ تھی۔ ہاں گھر کا انتظام و انصرام اس نے بخوبی سنبھال لیا تھا۔ ابا سے بھی اس کی خوب دوستی ہوگئی۔ سسر، بہو ناشتے کی میز پر اخبار کی سرخیوں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے۔ ادارتی صفحے پر چھپے اپنے پسندیدہ کالم ایک دوسرے کو پڑھ کر سناتے۔ وہ معاذ کو مخاطب کرتی بھی تو "آج کیا پکائیں" ٹائپ کا سوال پوچھنے کے لیے کرتی۔

"ہاں معاذ! بتاؤ بہو کو۔ آج کیا کھانے کا جی چاہ رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے آج کوفتے بنا لیتے ہیں۔" ابا اس سے سوال تو کرتے مگر جواب دینے کی زحمت سے بھی بچا لیتے۔ وہ بس ابا کو گھور کر رہ جاتا۔

شام کو ابا کے دوستوں کی آمد کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری رہتا۔ اب ان دوستوں کی بھرپور خاطر مدارت ہوتی تھی۔ حورالعین کا ہاتھ بٹانے کے لیے اب نزاکت کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہوتی تھی۔ اب یہ چھڑے چھانٹ بندوں کا گھر تھوڑی رہا تھا۔ پڑوس کی خواتین نے بھی آنا جانا شروع کردیا تھا۔ ابا اپنے گھر کی رونق دیکھ دیکھ کر خوب خوش ہوتے۔ انہیں بہشتن بیوی یاد آتی جب بھی یہ گھر اسی طرح آباد تھا۔ معاذ اس چہل پہل سے بری طرح چڑ رہا تھا۔

اس روز بھی وہ ہاسپٹل سے گھر آیا تو ابا کے ایک جاننے والے اپنے کسی عزیز کا چیک اپ کروانے آئے بیٹھے تھے۔

وہ سلام دعا کرکے بیڈ روم میں گھس گیا۔ حور ابا کے مہمانوں کی خاطر کے لیے کچن میں تھی۔ جب وہ کافی دیر تک کمرے سے نہ نکلا تو ابا اسے بلانے گئے تھے۔

"بھئی خلیق صاحب بہت دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔ اپنے دوست کے ہمراہ آئے ہیں۔ کھانسی بے چارے بندے کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی۔ تم ذرا آ کر معائنہ کرلو۔"

"خلیق صاحب کو جاکر کہیں کہ اگر کھانسی ان کے دوست کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تو وہ اس دوست کو ہی چھوڑ دیں۔ شکل سے ہی ٹی بی کا مریض لگ رہا ہے۔ آپ کیسے کیسے لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا لیتے ہیں ابا۔"

وہ باپ پر بگڑا۔ اسی لمحے حور بھی کسی کام سے بیڈ روم میں آئی۔ معاذ کا فقرہ اس کے کانوں میں پڑ گیا تھا۔ ابا تو خفگی سے بڑبڑاتے واپس پلٹ گئے تھے، اس نے تیکھی نگاہوں سے معاذ کو دیکھا۔

"کیسے کٹھور اور سنگ دل ڈاکٹر ہیں آپ۔ اگر کسی مریض کا چیک اپ کرلیں گے تو دعائیں ہی ملیں گی نا۔" حور کے کہنے پر معاذ نے اسے گھورا۔

"میں سرکاری ہسپتال میں کام کرتا ہوں محترمہ! میرے مریضوں میں اکثریت غریبوں اور مڈل کلاس لوگوں کی ہوتی ہے۔ میں اپنا فرض بطریق احسن پورا کرتا ہوں اور بدلے میں مجھے سرکار سے تنخواہ ملتی ہے سو ملتی ہے۔ ان غریبوں کی اتنی دعائیں ملتی ہیں کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ میں دوسرے ڈاکٹرز کی طرح پرائیوٹ پریکٹس نہیں کرتا۔ میرے بہت سے مریض مجھ سے میرے نجی کلینک کا پتا پوچھتے ہیں لیکن مجھے سرکاری نوکری کے ساتھ پرائیوٹ پریکٹس کرنا بددیانتی لگتا ہے۔ میں اپنی تمام تر توانائیاں اپنے ہسپتال میں ہی خرچ کرکے گھر لوٹتا ہوں اور یہاں ابا نے مزید مریض میرے انتظار میں بٹھا رکھے ہوتے ہیں۔ ان سب کی مالی حیثیت اتنی اچھی ہے کہ یہ کسی اچھے سے اسپیشلسٹ کو فیس دے کر بھی دکھا سکتے ہیں مگر نہیں، ایک مفت کا الو کا پٹھا ملا ہوا ہے نا سب کو۔"

وہ بکتا جھکتا پاؤں میں سلیپر ڈال کر ابا کے دوست کا معائنہ کرنے چلا گیا۔ حورالعین چپ رہ گئی تھی۔

☆☆☆

حورالعین نے اکیلے میں ابا کو سمجھایا تھا۔

"ہاسپٹل سے تھکے ہارے آتے ہیں یہ۔ آپ یوں کیجیے ابا! کہ ہفتے کا ایک دن مخصوص کرلیں اور اپنی جان پہچان کے لوگوں کو کہہ دیں کہ معاذ صرف اس دن مریضوں کو چیک کریں گے۔"

حورالعین کو اس روز سے "بے چارے" ڈاکٹر پر واقعی ترس آ رہا تھا، اسی لیے اس نے ابا کو تجویز دی تھی۔ جواباً نے خوش دلی سے قبول کرلی۔

معاذ کو اگلے دو، تین دن تک مریضوں کے جمگھٹے سے واسطہ نہ پڑا تو وہ جی ہی جی میں حیران ہوا۔

"کیا ابا کے سب جاننے والے اکٹھے صحت یاب ہوگئے ہیں۔ کوئی چیک کروانے ہی نہیں آ رہا۔" اس نے نزاکت سے پوچھا۔

نزاکت نے چپکے سے اسے حور باجی کی کارگزاری سے آگاہ کیا تھا۔ معاذ حور کی ہمدردی پر جی

WOMEN SKILLS GROUP

ہی جی میں حیران تو ہوا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

"معاذ بھائی! آپ حور باجی کی قدر کیا کریں۔ آپ کے جو اعمال ہیں، جنت میں تو آپ جائیں گے نہیں جو وہاں کسی حور کا ساتھ ملے۔ دنیا میں آپ کو حور باجی مل گئی ہیں، اسی پر اللہ کا شکر منایا کریں۔" نزاکت نے اسے بردباری سے سمجھایا تھا۔

"کیسے ہیں میرے اعمال؟" اس نے دانت کچکچا کر دریافت کیا۔

"وہ جی آپ بڑے صاحب سے کتنی بدتمیزی کرتے ہیں۔ ماں، باپ کا نافرمان تو جنت میں جا ہی نہیں سکتا معاذ بھائی۔" نزاکت بغیر جھجکے ترنت بولا تھا۔ معاذ اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ابا معاذ سے سخت خفا تھے، وہ ہفتے میں ایک دن بھی مریضوں کو ڈھنگ سے چیک نہ کر رہا تھا۔ اس روز ابا کے ایک بہت معزز دوست اپنے پوتے کے ہمراہ آئے۔ بچے کی عمر تقریباً پانچ سال تھی اور اس کا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مسلسل اس کے منہ میں تھا۔

"ریان کی اس عادت سے ہم بہت پریشان ہیں بیٹا! اس کا کوئی علاج تجویز کرو۔" اشفاق صاحب مصر تھے۔

"میں سائیکاٹرسٹ نہیں ہوں انکل! میڈیسن میں اسپیشلائزیشن کی ہے میں نے، اس عادت سے نجات دلوانے کے لیے میرے پاس کوئی نسخہ نہیں۔" وہ بے زاری سے بولا تھا۔

"کچھ تو ایڈوائس کرو بیٹا! ہم بہت پریشان ہیں۔" معاذ کی بات سمجھے بغیر ان کی تان وہیں ٹوٹی تھی۔ معاذ نے گہری سانس کھینچی پھر بچے کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا تھا۔ ابا خوشی سے کھل اٹھے۔ ان کا ہونہار بیٹا مسئلے کا کوئی حل نکالنے والا تھا۔ جیسے ہی بچہ معاذ کے قریب پہنچا، معاذ نے اس کی پتلون ذرا سی کھینچی۔ بچے نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے پینٹ تھامی۔

"اس کا واحد یہی علاج ہے انکل! اس کے پاجامے میں ڈھیلا الاسٹک ڈالیں۔ ہر وقت پاجامہ پکڑنے کی فکر میں رہے گا۔ انگوٹھا چوسنے کی طرف دھیان ہی نہ جائے گا۔"

معاذ نے مسئلے کا کیا خوب حل نکالا تھا۔ اشفاق صاحب حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی بات کی معقولیت جانچنے لگے۔

"میں جاؤں اب یا کوئی اور بھی مسئلہ ہے؟" اس نے بے زاری سے دریافت کیا۔

"ہاں بیٹا! ایک مسئلہ اور ہے۔ سینے کی جلن پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ پیاس بھی بہت لگتی ہے۔ ساری، ساری رات تمہاری آنٹی کو جگا کر پانی مانگتا رہتا ہوں مگر پیاس بجھنے کا نام نہیں لیتی۔"

"پانی کا جگ اپنی طرف رکھا کریں نا۔ خواہ مخواہ آنٹی کو بھی پریشان کرتے ہیں۔" معاذ نے نسخہ لکھنے کے ساتھ ساتھ انہیں سپاٹ سے انداز میں نصیحت بھی کی تھی، وہ ذرا خجل ہو گئے۔

"پندرہ دن تک یہ دوائیں استعمال کریں۔ شوگر ٹیسٹ کروائیں۔ سینے کی جلنے سے بچنے کے لیے مرغن کھانے، چائے، کافی، کولڈ ڈرنک سے پرہیز کریں۔ آپ تو یہیں بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹے میں دو کپ چائے پی جاتے ہیں۔" معاذ انہیں نسخہ تھماتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

بعد میں ابا اس کی بدلحاظی پر خوب بگڑے تھے۔ معاذ بھی خاموش نہ رہا، جواب میں کچھ نہ کچھ بولتا ہی رہا۔

"آپ ابا سے اتنی بدتمیزی کیوں کرتے ہیں۔ وہ باپ ہیں آپ کے۔" حور کہے بنا نہ رہ پائی۔

"اطلاع دینے کا شکریہ۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ اس انداز پر وہ چپ ہو گئی۔

"آپ اتنی پرانی بات یاد رکھے ہوئے ہیں معاذ!" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ اس کے لبوں سے اپنا نام معاذ کو کتنا بھلا لگا تھا۔

دونوں کے درمیان روز اول والی کشیدگی برقرار تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو کسی کام سے ہی مخاطب

کرتے تھے۔ آج جانے کیسے حور نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن گفتگو اب بھی ابا پر ہی ہو رہی تھی۔ وہ کلس کر رہ گیا۔

"ابا نے اپنی ساری زندگی آپ کے لیے وقف کر دی۔ ان کی ماضی کی چھوٹی سی غلطی کو معاف کر دیں۔ غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔" وہ خلوص دل سے سمجھا رہی تھی۔ معاذ جواب میں کچھ نہ بولا، بس اسے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔

"آپ کو کچھ سمجھانے کا مطلب تو بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔" زچ ہو کر وہ چلی گئی تھی۔

معاذ نے گہری سانس اندر کھینچی۔ وہ موصوفہ کو قدرے رومانٹک انداز میں دیکھ کر انہیں اپنی نگاہوں کی تپش سے بوکھلانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اسے بھینس سے تشبیہ دے کر چلی گئیں۔ لیکن سچ یہ تھا کہ وہ اسے خالصتاً بیویوں والے نک چڑھے سے روپ میں بھی کتنی حسین لگی تھی۔

"انا کے جھنڈے کو سرنگوں کرنا ہی پڑے گا معاذ میاں! اتنی حسین بیوی کے ہوتے ہوئے لنڈوروں کی طرح زندگی بسر کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سوچا تھا۔

اب وہ سنجیدگی سے اپنے اور حور کے مابین فاصلوں کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش میں تھا۔ سہاگ رات حور العین کے جذبات کو ٹھیس لگانے میں پہل اس نے کی تھی۔ دوسری طرف حور کو بھی اپنی انا بہت عزیز تھی اس نے بھی حساب بے باق کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی اور فوراً جتا دیا کہ اس رشتے میں اس کی رضامندی شامل نہیں ہے۔ معاذ گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے غیر محسوس طریقے سے ابا کے ساتھ تعلقات خوش گوار کر لیے۔ دل میں تہیہ بھی کر لیا کہ وہ اب ایک فرماں بردار بیٹا بن کر رہے گا۔ اب حور سے معافی مانگنے اور اسے اپنی محبت کی شدت کا یقین دلانے والا مرحلہ درپیش تھا لیکن ابھی اس مرحلے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ ملتان سے فاطمہ بیگم کی طبیعت خرابی کی اطلاع آ گئی تھی۔

☆☆☆

معاذ ہاسپٹل میں تھا کہ ابا کا فون آیا۔

"فاطمہ خالہ کی طبیعت خاصی خراب ہو گئی ہے۔ میں اور حور العین ملتان کے لیے نکل رہے ہیں۔" ابا نے سنجیدگی بھرے انداز میں اسے مطلع کیا تھا۔

"میں پندرہ منٹ میں گھر پہنچ رہا ہوں ابا! آپ کو تو ویسے ہی رات سے بخار ہے۔ آپ یہیں رکیں، حور کے ساتھ میں جاؤں گا۔"

اس نے فوری فیصلہ کیا اور اگلے چار دن کی چھٹی لے کر فوراً گھر پہنچا تھا۔ حور کی متورم آنکھیں دیکھ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ گلابی آنکھیں اور سرخ ہوتی ناک بتا رہی تھی کہ وہ بہت دیر سے رو رہی ہے۔

"ان شاء اللہ فاطمہ نانی ٹھیک ہو جائیں گی۔ حوصلے سے کام لو حور!" اس نے اسے تسلی دی تھی اور پھر دوران سفر اسے یہ تسلی بار بار دینا پڑی تھی۔ حور کے آنسو خشک ہونے کا نام نہ لے رہے تھے۔

"دادی میرے لیے صرف دادی نہیں ہیں معاذ! انہوں نے ماں بن کر مجھے پالا ہے تو باپ بن کر زمانے کے سرد و گرم سے بچایا ہے۔ وہ دادی سے بڑھ کر میری سہیلی ہیں۔ وہ میرا سب کچھ ہیں۔ انہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہ رہ پاؤں گی۔"

وہ بلک رہی تھی۔ معاذ نے اس بار اسے رونے دیا شاید اسی طرح اس کے جی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

"وہ صبح فجر کے وقت سے آئی سی یو میں ہیں اور گھر والوں نے مجھے اتنی دیر بعد اطلاع دی۔ کسی کو خیال ہی نہ آیا کہ حور کو اطلاع دی جائے۔ یہ تو دادی تھیں جن کو ہر گھڑی میرا خیال رہتا تھا۔"

وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے معاذ اسے خاموشی سے سن رہا تھا۔

"میں کلاس ٹو میں تھی جب پاپا امریکہ گئے۔ کسی نے ماما کے کان بھر دیے کہ وہاں پاپا کسی امریکن کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ پاپا فون پر اپنی بے گناہی کا

WOMEN SKILLS GROUP

یقین دلاتے رہے مگر ماما ان کی وضاحتیں سننے پر آمادہ ہی نہ تھیں اور پھر طیش میں آ کر پاپا نے ماما کو فون پر ہی طلاق دے دی۔

نانا، نانی، ماما اور مجھے اپنے ساتھ لے کر آ گئے لیکن سات ماہ بعد ہی ماما کی ان کے کزن سے شادی ہو گئی، وہ خود کینیڈا چلی گئیں۔

دادی جان وغیرہ کو بتانے کی زحمت ہی نہ کی۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد دادی کو پتا چلا تو وہ مجھے ننھیال سے واپس لے آئیں۔ پہلے بھی انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر مجھے ماما کے ساتھ جانے دیا تھا لیکن اب وہ مجھے ننھیال میں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں، نہ تو نانی نے مجھے روکنے کی کوشش کی نہ ہی ماما نے مجھے وہیں رکنے کا کہا حالانکہ کینیڈا جاتے ہوئے ماما نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دو مہینوں کے اندر، اندر مجھے بھی وہاں بلوا لیں گی۔

میں واپس ددھیال تو آ گئی لیکن میری ذہنی حالت بری طرح ڈسٹرب تھی۔ رات کو سوتے میں ڈر کے مارے چلانے لگتی۔ ماما، ماما پکارتی رہتی، یہ دادی ہی تھیں جنہوں نے اپنی مہربان آغوش میں مجھے سمیٹ لیا۔"

حور کسی ٹرانس کے عالم میں بولے جا رہی تھی، آنسو اب بھی لڑیوں کی صورت گالوں پر بہہ رہے تھے لیکن معاذ نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

"وہاں امریکہ میں پاپا نے بھی شادی کر لی۔ ماں، باپ سے میرا رابطہ صرف ٹیلی فون کی حد تک تھا۔ دادی جان کی تربیت نے گزرتے وقت کے ساتھ مجھے حوصلہ بھی دیا اور صبر بھی۔ ماں، باپ سے شکوے دم توڑ گئے، قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ دادی۔ نے مجھے شکوے کے بجائے شکر کا درس دیا تھا۔"

حور بول رہی تھی اور معاذ ندامت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس لڑکی کے آگے اپنا آپ کتنا چھوٹا لگ رہا تھا۔

"گھر میں ویسے تو سب ہی مجھے پیار کرتے تھے۔ توصیف چاچو تو خیر ہمیشہ سے ہی میرے دوست تھے۔ اظہار چاچو بھی مجھے اپنی بیٹیوں جتنا ہی چاہتے تھے۔ چاچیاں بھی اچھی تھیں لیکن دادی کو پھر بھی ہر وقت میری فکر ستاتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں اپنی زندگی میں ہی میرے فرض سے سبک دوش ہو جائیں، پھر آپ کا رشتہ آیا تو دادی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ ان کے رب نے ان کی دعائیں سن لیں۔"

وہ کہتے کہتے یک دم چپ ہو گئی۔ کیسے بتاتی کہ معاذ کا رشتہ آیا تو اسے خود اپنی خوش قسمتی پر یقین نہ آیا حالانکہ اس نے معاذ کو سرسری سا ہی دیکھا تھا لیکن جب ابا اس کا پروپوزل لائے تو اسے معاذ کا حلیہ یاد کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ آنکھیں بند کرنے کے ساتھ ہی چھم سے معاذ کا سراپا نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس کی شرافت، اس کی خوب صورتی، اس کی شخصیت کچھ بھی تو نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا لیکن شادی کی پہلی رات ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ خواہ مخواہ خود کو خوش قسمت گردانتی رہی حالانکہ خوش قسمتی کا اس کی زندگی میں کبھی دخل رہا ہی نہیں۔ وہ دادی جان کا پڑھایا سبق بھولنے لگی تھی۔ شکر کے بجائے پھر سے شکوے کو اپنا شعار بنا لیا لیکن شکوے صرف اپنے رب سے ہی کرتی تھی۔

دادی جان کو تو ہمیشہ ہی سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دی۔ پھر بھی وہ میرے حوالے سے مضطرب ہی رہتیں۔

ابھی پرسوں رات ہی ان کا فون آیا تھا، بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھیں "تو خوش تو ہے نا حور؟" میں نے انہیں اپنے خوش ہونے کا بہت یقین دلایا تو وہ کہنے لگیں "اگر تو خوش ہے تو مجھے خوابوں میں اتنی پریشان کیوں نظر آتی ہے۔"

حور کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ندامت کے سمندر میں غرق ہونا کس کو کہتے ہیں یہ معاذ کو آج پتا چلا تھا۔ اس کانچ سی لڑکی کو وہ کتنا ستا چکا تھا۔ اب تلافی کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔ پورے سفر کے دوران وہ اسی سوچ بچار میں غرق رہا تھا جب کہ حور کا باقی سفر روتے ہوئے یا پھر اونگھتے ہوئے گزرا تھا۔

☆☆☆

سب کی دعائیں رنگ لائیں۔ فاطمہ بیگم کی حالت میں خاصی بہتری آئی تھی، پہلے انہیں آئی سی یو سے جنرل وارڈ میں اور پھر ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ حور ان کے سرہانے سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ معاذ چونکہ شادی کے بعد پہلی بار سسرال گیا تھا اس لیے اسے وی آئی پی پروٹوکول دیا جا رہا تھا اور یہ چیز اسے مزید شرمندگی میں مبتلا کر رہی تھی۔

اظہار انکل کی چھماٹو امبر جو میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں تھی اس نے معاذ کا پیچھا پکڑ رکھا تھا۔ اسے اناٹومی کے سارے مشکل ٹاپک معاذ بھائی سے دو دن کے اندر، اندر سمجھنے تھے۔

معاذ اس بچی کو دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ابا واقعی معاذ کے کہنے کے مطابق فاطمہ بیگم کی ڈاکٹر پوتی کا رشتہ مانگ لیتے اور وہاں سے اقرار ہو جاتا تو کیا بنتا اس کا۔ اسے یاد آیا ابا نے اسے عمروں کے تفاوت کے متعلق بتانے کی کوشش کی بھی تھی لیکن وہ تو ابا کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا ورنہ ہو سکتا تھا وہ جب ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا۔ اس کی حماقتوں کا سلسلہ دراز نہ ہو پاتا لیکن اب بیتا وقت واپس نہ آ سکتا تھا۔

معاذ کو ماضی پر کڑھنے کے بجائے اپنے مستقبل کی خاطر حال میں ہی بیوی کو منانے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کا مرحلہ طے کرنا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ حور اپنی دادی کے پاس سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

معاذ نے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب دادی کے کمرے میں کوئی دوسرا تیمار دار موجود نہ تھا۔ صرف حور تھی جو دادی کی وارڈ روب سیٹ کر رہی تھی۔ معاذ کمرے میں داخل ہوا تو فاطمہ بیگم نے اسے محبت سے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ ان کے بیڈ کی پائنتی پر ہی ٹک گیا۔ کن اکھیوں سے حور کو دیکھا۔ دوران سفر اس پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی، اب اس کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اب وہ وہی پرانی روٹھی، روٹھی تنک چڑھی سی حور لگ رہی تھی۔

معاذ نے گفتگو کا سلسلہ تو فاطمہ بیگم کی طبیعت خرابی سے ہی شروع کیا۔ وہ بار بار انہیں وہ احتیاطیں اور پرہیز بتا رہا تھا جن پر سختی سے عمل کرنا ان کے لیے بہت ضروری تھا۔ انہیں احتیاطی تدابیر بتاتے بتاتے وہ یک دم موضوع بدل کر حور کی بہترین تربیت پر فاطمہ نانی کو خراج تحسین پیش کرنے لگا۔

"آپ نے حور کی بہت بہترین تربیت کی ہے نانی! میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین بندہ گردانتا ہوں جو مجھے حور جیسی لڑکی کا ساتھ نصیب ہوا۔ میرے اعمال ایسے نہیں کہ مجھے جنت میں کوئی حور ملے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے مجھے ایک زمینی حور عطا کر دی۔"

نزاکت کی بات میں اس نے مزید گل پھندنے ٹانک کر نانی کے سامنے شکر گزاری کا اظہار کیا۔

"ارے بیٹا! کسر نفسی سے کام کیوں لے رہے ہو۔ ماشاء اللہ ایسے پیارے، سلجھے ہوئے ذہین، قابل بچے ہو۔ خوش قسمت تو میری حور ہے جو اسے تم جیسا شریک حیات ملا۔" نانی اس پر نثار ہوتے ہوئے بولی تھیں۔

"نہیں نانی! میں اتنا بھی ذہین اور قابل نہیں۔ حور مجھ سے نہ جانے کیوں خفا ہے۔ آپ حور سے میری سفارش کر دیں۔" اس نے نانی کے گھٹنے چھوتے ہوئے عاجزی بھرے انداز میں ان کی سفارش چاہی۔

حور الماری کا پٹ تھامے ــــ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیسا غضب کا ایکٹر تھا یہ شخص اور فاطمہ بیگم اس کی باتوں میں آ کر پوتی کی کلاس لینے لگی تھیں۔

"معاذ جیسے شخص کی قدر کرو حور! کیوں اس سے بلاوجہ خفا ہو۔" انہوں نے اسے لمبا سا لیکچر دے کر سلسلہ کلام اس بات پر توڑا تھا۔ وہ بنا کوئی وضاحت

WOMEN SKILLS GROUP

دیے نانی کی ڈانٹ سنتی رہی۔

"مجھے علم ہے نانی کہ یہ میری بات پر یقین نہیں کرے گی لیکن میں اسے بے تحاشا و بے حساب چاہتا ہوں۔"

وہ تاریخ عالم کا پہلا شخص تھا جس نے بیوی سے پہلا اظہار محبت اس کی دادی کے سامنے کیا تھا۔ نانی اس پر مزید نثار ہونے لگیں جب کہ پوتی کو مسلسل خفگی بھری نگاہوں سے تکے گئی تھیں۔ اسی وقت ان کی عیادت کرنے کوئی رشتہ دار آن پہنچا تھا۔ معاذ کو مشن ادھورا چھوڑ کر اٹھنا پڑا تھا۔

رات کو جب حور بیڈ روم میں آئی تو اس کے سرد و سپاٹ انداز میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔

"میں نے آپ کے جوڑے بیگ میں ڈال دیے ہیں۔ ابا کے لیے بیگ میں کپڑوں کے نیچے سوہن حلوے کا ڈبا بھی رکھ دیا ہے۔ آپ صبح سویرے نکل جائیے گا۔ میں ابھی کچھ دن یہاں رہوں گی۔ توصیف چاچو مجھے چھوڑ آئیں گے۔" اس نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

"تم نے جتنے دن رکنا ہے، تسلی سے رکو۔ میں مزید چھٹی اپلائی کر دیتا ہوں، واپس ساتھ چلیں گے۔" معاذ نے بھی کمال اطمینان سے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

"آپ تو اپنے ہاسپٹل سے دو گھنٹے کا آف نہیں لے سکتے تھے، اتنی ڈھیروں چھٹیاں کیسے ملیں گی آپ کو؟" وہ طنز کیے بنا نہ رہ پائی۔

"وہ میرا مسئلہ ہے، میں نے شادی پر بھی صرف دو چھٹیاں لی تھیں۔ یہ کہہ دیا تھا کہ ہنی مون کے لیے بعد میں چھٹیاں اپلائی کروں گا، اب ہنی مون کا کہہ کر جتنی مرضی چھٹیاں چاہے لے سکتا ہوں۔" معاذ نے اسے تسلی دی۔

حور العین اسے کچھ دیر تک گھورتی رہی تھی پھر پھٹ پڑی۔

"معاذ! میں جیتی جاگتی، گوشت پوست سے بنی عام انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ آپ اپنی ڈرامے بازیوں سے مجھے مزید کتنی ذہنی اذیت دیں گے۔ آج شام نانی کے سامنے کی جانے والی گفتگو کا کیا مقصد تھا؟"

بات کے اختتام پر وہ بالکل روہانسی ہو گئی تھی۔

معاذ تو کب سے اسے حال دل سنانے کو بے تاب بیٹھا تھا۔ اس نے پہلی نگاہ کی محبت سے لے کر اپنی غلط فہمی اور اپنی حماقت کا سارا قصہ کہہ سنایا۔

"سچ یہی ہے حور کہ تم مجھے پہلی نگاہ میں ہی بے تحاشا و بے حساب اچھی لگی تھیں اور میں تمہیں بھلے سے واجبی سا بلکہ کوئی ولن وار ہی لگا ہوں گا۔ تم مجھے ایک موقع دو۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح تمہاری ناپسندیدگی، پسندیدگی میں بدل جائے۔" وہ مسکین صورت بنائے کہہ رہا تھا۔

"پھر وہ ہی ڈرامے بازی معاذ!" وہ جھنجلائی تھی۔

"آپ کا قصور اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ میں وہ ہی لڑکی نکل آئی جو آپ کو اچھی لگی تھی لیکن فرض کریں، آپ کو واقعی اظہار چاچو کی امبرا اچھی لگتی......"

"فار گاڈ سیک حور! امبر بہت چھوٹی ہے مجھ سے۔ تم اس چھوٹی سی بچی کے متعلق یہ سوچ رہی ہو کہ میں اسے ایسی نگاہ سے دیکھتا۔ اتنا بدنگاہ نہیں ہوں میں۔" معاذ کو اس کی بات سن کر دکھ ہوا تھا۔

"اچھا فرض کریں امبر اتنی کم عمر نہ ہوتی۔ آپ کو وہ یا پھر میری کوئی اور کزن پسند آتی اور ابا آپ کا رشتہ مجھ سے طے کر دیتے تو پھر آپ کیا کرتے۔ معاف کرنا تو آپ کی فطرت میں شامل ہی نہیں ہے، نہ آپ ابا کو معاف کرتے نہ مجھے بیوی کا درجہ دیتے اور فرض کریں، میں بھی کوئی کم عقل، جذباتی اور نادان سی لڑکی ہوتی تو کیا آج دنیا کے سامنے ہمارا بھرم اور ہمارا رشتہ قائم ہوتا۔" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"اف توبہ! اتنی خوف ناک باتیں کیوں فرض کروا رہی ہو۔ ہم دونوں مل کر یہ فرض کیوں نہیں کرتے کہ اب اتنے پیار محبت سے زندگی گزاریں گے کہ رہتی دنیا تک ہماری محبت کے لازوال قصے زبان زد عام رہیں گے۔"

"آپ اچھے بیٹے تو بن نہ پائے، اچھے شوہر کیا بنیں گے۔" وہ ہنوز خفا تھی۔

"یار بیوی! اگر تم کہتی ہو تو میں اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دیتا ہوں کہ میں اب فرماں بردار بیٹا، وفادار شوہر اور بہترین باپ بن کر دکھاؤں گا۔" وہ اپنی جھونک میں ہی بولا تھا۔ حور کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔

"اچھا، سچ سچ بتاؤ۔ پہلی ملاقات میں، میں تمہیں عام سا دکان دار لگا تھا تو میری اتنی خاطر کیوں کی تھی۔ کیوپڈ کا تیر تم پر بھی چلا تھا؟" وہ اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"کیسی خاطر؟ میں نے آپ کے سامنے چار دن پرانا فریج میں رکھا آلو قیمہ گرم کر کے رکھا تھا۔ مٹر پلاؤ پڑوس سے آیا تھا۔ شامی کباب مامی فریز کر کے [illegible] رس ملائی چاچو بازار سے لے آئے تھے، [illegible] توصیف رائتہ سلاد بنایا تھا۔" وہ بے نیازی سے [illegible] کچھ بولے بنا بس اسے مسکرا کر دیکھتا رہا۔

"سچ کہہ رہی ہوں جب آپ کا پروپوزل آیا تو مجھے تو یاد کرنے پر بھی آپ کی شکل تک نہ یاد آئی تھی۔" وہ اس کی مسکراتی آنکھوں سے جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ تمہیں میری خاطر مدارت کا مینیو تو آج تک یاد ہے لیکن میری شکل تم بھول گئی تھیں۔" معاذ نے فراخ دلی دکھاتے ہوئے اس کی بات تسلیم کر لی۔

"وہ تو میں......" حور العین نے گڑبڑا کر کوئی اور بات بنانا چاہی۔

"اب بس کرو حور! میری انا اور حماقت نے مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اگر میں سہاگ رات ہی اپنی غلطی تسلیم کر کے تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ چکا ہوتا تو آج یوں کان پکڑنے کی نوبت تو نہ آتی۔ تم بھی اپنی انا کا جھنڈا سرنگوں کرتے ہوئے میرے لیے عام معافی کا اعلان کر دو۔ میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں، نہیں رہ سکتا تمہارے بنا۔" وہ جذبوں سے چُور لہجے میں بولا۔

"توبہ ہے معاذ! کان کب پکڑے ہیں آپ نے۔" حور نے اس کی وارفتگی پر بوکھلاتے ہوئے بات بدلی۔

"میں زمانہ طالب علمی میں بہت ذہین رہا ہوں۔ کبھی کان پکڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ نانی کو بتاؤں گا آپ کی پوتی نے مجھ سے کان بھی پکڑوا لیے۔" معاذ نے دونوں کان پکڑ لیے۔

"کیا یاد کریں گے، معاف کیا آپ کو۔" حور کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"پہلے پتا ہوتا، معافی کان پکڑ کر ملے گی تو تمہارے کمرے میں آتے ہی کان پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اوئیں اتنی بڑی تقریر کی۔" وہ بھی ہنسا تھا۔

"پتا نہیں آپ ڈاکٹر کیسے بن گئے، آپ کو تو ایکٹر بننا چاہیے تھا۔"

وہ اس کی شوخیوں پر ہنس رہی تھی اور معاذ اسے ہنستے مسکراتے دیکھ کر خود بھی مسکرا دیا۔ دل میں مصمم ارادہ بھی کر لیا کہ اب ان ہونٹوں سے ہنسی کبھی نہ جدا ہونے دے گا۔ فاطمہ نانی نے پوتی کو شکوے کے بجائے شکر گزاری کا درس دیا تھا۔ ہو سکتا تھا ان کی پوتی کی صحبت میں رہ کر ایسی دو چار عقل کی باتیں وہ بھی سیکھ لیتا۔ فی الحال تو اس کا رواں رواں اپنے رب اور ابا کا شکر گزار تھا جس نے زمین پر پری اسے ایک عدد جو عطا کر دی۔ اسے اس خدائی تحفے کی قدر کرنی تھی۔ معاذ نے محبت بھری نگاہ اس پر ڈالی اور مسکرا دیا

WOMEN SKILLS GROUP

Women Skills

نزہت جبیں ضیا

آشیانہ

''خنکی بڑھ گئی ہے عبدالستار! کھڑکی بند کر دوں اب ۔۔۔؟'' جہاں آراء بیگم نے عشاء کی نماز پڑھ کر جائے نماز تہ کر کے شیلف پر رکھتے ہوئے شوہر کو مخاطب کیا جو کھڑکی کے عین سامنے ایزی چیئر پر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے...... تسبیح کا آخری دانہ گراتے ہوئے عبدالستار صاحب نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

''نہیں جہاں آرا ۔۔۔ ابھی کچھ دیر کھڑکی کھلی رہنے دو'' تسبیح میز پر رکھتے ہوئے عبدالستار صاحب نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''عبدالستار! ...رات بیت رہی ہے ۔ خنکی بڑھتی جا رہی ہے ۔۔۔ ویسے بھی تمہیں کھانسی ہو رہی ہے ۔۔۔ کیا محسوس کرنا چاہتے ہو...... کھلی کھڑکی سے ۔۔۔؟'' جہاں آراء بیگم کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔

''اچھا لگتا ہے ۔۔۔ شور شرابا...... ویسے بھی آج ۔۔۔ تو باہر بچوں نے ہنگامہ مچائے رکھنا ہے...... شور ہنگامہ اور نئے سال کا جشن ۔۔۔ کم از کم یونہی ...... ہماری زندگی میں بھی ہلچل محسوس ہو گی...... ہمیں بھی احساس ہو گا ۔۔۔ جینے کا، کم از کم یونہی دل بہلا رہے گا۔

گزشتہ چار برسوں سے ان اجنبی خوشیوں سے ہی تو دل بہلا رہے ہیں ہم ۔۔۔ اور ۔۔۔ میں آج بھی یہی محسوس کرنا چاہتا ہوں۔'' عبدالستار صاحب کے لہجے میں دکھ بچ رہے تھے ۔۔۔ نظر انداز کیے جانے اور بے توجہی کا کرب ان کے ٹوٹے لہجے میں نمایاں تھا۔

''عبدالستار کیوں خوامخواہ دل بھاری کر رہے ہو......''

''خیر تو ہے بیگم صاحبہ! آپ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہے کیا......؟ آج نماز کے بعد لائٹ بند نہیں کی آپ نے۔''

عین اسی وقت دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹا کر دین محمد اور نگینہ اندر آئے تھے اور دین محمد نے پوچھا۔

''ہاں ہاں ...... سب خیر ہے دین محمد۔ تم لوگ سو جاؤ...... بس ایسے ہی نیند نہیں آ رہی۔ باہر چہل پہل زیادہ ہے ناں اس وجہ سے ...... کچھ دیر میں سو جائیں گے ہم لوگ۔'' جہاں آراء بیگم نے دونوں ملازمین (میاں بیوی) کو تسلی دی۔

''جی اچھا جی۔'' دونوں سر ہلا کر دروازہ بند کرتے ہوئے باہر کی طرف چل دیے۔

جہاں آراء بیگم نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر پیروں پر کمبل ڈال کر شوہر پر نظر ڈالی...... عبدالستار کسی گہری سوچ میں گم تھے...... ان کے بوڑھے چہرے پر پھیلا کرب وہ محسوس کر سکتی تھیں...... اب عبدالستار تھکنے لگے تھے...... جلد پریشان ہو جاتے...... کم وبیش یہی حال جہاں آراء بیگم کا بھی تھا مگر ...... وہ بظاہر شوہر کو تسلیاں بھی دیتیں، ان کی دل جوئی کرتیں۔ تنہائی کا کرب ...... اکیلے پن کا عذاب، اس وقت شدید ہو جاتا ہے جب ...... انسان خود کو ...... بے بس محسوس کرتا ہے...... بڑھاپا بذات خود ایک بیماری ہے۔ اس پر ۔۔۔ اپنوں سے دوری...... اور طویل دوری بھی کبھی بہت آزردہ کر دیتی ہے ...... یہی کیفیت آج کل عبدالستار اور جہاں آراء بیگم کی بھی تھی۔

''عبدالستار! شکر ادا کرو کہ ہمیں ...... اتنی آرام دہ زندگی، اتنی سہولیات میسر ہیں۔ بہترین گھر، اچھے سے اچھے ڈاکٹرز، بہترین کھانا پینا، ہر وقت دو دو نوکر الرٹ...... کسی چیز کی کمی نہیں رکھی بچوں نے ہمارے لیے...... اس عمر میں جن چیزوں کی ضرورت ہونی چاہیے، ساری کی ساری ہماری دسترس میں ہیں...... نیک اور فرمانبردار اولاد بھی نصیب والوں کو ملتی ہے ورنہ آج کل کے دور میں بوڑھے والدین کو تو بچے محض بوجھ سمجھ لیتے ہیں۔'' جہاں آراء نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اپنا موقف بیان کیا......

''ہاں جہاں آراء کہتی تو تم ٹھیک ہو...... مگر ہم لوگ...... عمر کی جس منزل پر کھڑے ہیں وہاں ...... توجہ، احساس اور ساتھ کی ضرورت ہے...... بے شک سب کچھ میسر ہے لیکن کبھی ...... کسی موقع پر ......

یہ چیزیں بے معنی اور بے وقعت لگنے لگتی ہیں۔ اپنی بے وقعتی کا احساس بہت تکلیف دیتا ہے...... کتنے مصروف ہو گئے ہیں ہمارے بچے...... کہ ماں باپ کے لیے صرف پیسا بھیجنا ہی یاد رہتا ہے...... ان کے پاس ہم بوڑھوں کے لیے دس منٹ کا وقت نہیں...... کتنے کتنے دن ہو جاتے ہیں خیریت معلوم کرتے ہیں نہ بتلاتے ہیں...... بات کریں تو اتنی عجلت ...... کبھی آفس جانے کا ٹائم، کبھی شاپنگ کے لیے نکلنے کی بات، کبھی کوئی میٹنگ...... سب کچھ اہم اور ...... ہم ...... غیر اہم ...... کم از کم اتنا تو سوچیں کہ وہاں پر ان کے سامنے بے شمار مصروفیات ہیں، ہمارے پاس...... ہمارے پاس کیا ہے؟ ایک دوسرے سے باتیں کرنا، کھانا، نماز پڑھنا، دوائیں لینا...... اور سو جانا ...... جہاں آراء بیگم! کبھی کبھی ہمارے اپنوں کے رویے ہمیں خاموشی اور بے توجہی کی موت مار دیتے ہیں...... اور یہ موت...... اس موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے...... کیونکہ ہمیں مصلحتوں کی چادر تان کر جینا پڑتا ہے...... اس طرح جینا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔'' عبدالستار بولنے پر آئے تو بولتے ہی چلے گئے۔

جہاں آراء بیگم ان کے منہ سے پہلی بار ایسی تکلیف دہ باتیں سن رہی تھیں۔ حیرت اور دکھ ان کے

WOMEN SKILLS GROUP

چہرے پر بھی نمایاں تھا۔۔۔ جہاں آراء بیگم ان کے دکھ پر تڑپ اٹھیں۔

''عبدالستار! آج کل زندگی بہت تیز رفتار ہوگئی ہے جہاں لوگوں کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ کیوں ہلکان ہوئے جاتے ہو۔۔۔؟ ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔۔۔ ایسی بات نہیں کہ ہمارے بچے ہمیں اگنور کرتے ہیں بس۔۔۔ مصروف رہتے ہیں۔''

''بس کرو جہاں آراء بیگم کب تک یوں خود کو اور مجھے بھی بہلاؤ گی۔۔۔ تمہاری باتیں، تمہاری دلیلیں، تمہارے جواز۔۔۔ دو بوڑھوں کو کب تک بہلاتے رہیں گے۔۔۔؟ کیوں جھوٹی تسلیاں دیتی ہو۔ اپنے آپ کو اور مجھے بھی۔۔۔ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو۔۔۔ کیا میں نے غلط کہا؟ تمہیں یہ سب کچھ فیل نہیں ہوتا۔۔۔ پچھلے چار سالوں سے ہر سال عید، بقر عید، پر تم نے اپنے بچوں کے آنے کی آس لگائی کہ نہیں۔۔۔؟ ہر بار تم عید پر چھپ چھپ کر روئی ہو کہ نہیں۔۔۔ نیو ایئر اکتیس دسمبر ہماری شادی کا دن یہاں سے جانے کے بعد۔۔۔ تمہارے بیٹوں نے کبھی بھی ہمیں کال کرکے مبارک باد دی کیا۔۔۔؟ اتنی لاپروائی، اتنی عدیم الفرصتی۔۔۔ ہم بھی ان کی برتھ ڈے بھولے۔۔۔؟ ان کی اینی ورسری اور پوتے پوتیوں کو برتھ ڈے وش کرنا بھولے۔۔۔؟ نہیں ناں۔۔۔؟ کیوں کہ۔۔۔ ہم یہ سب یاد رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ باہر کی دنیا دیکھو۔۔۔ آج کتنی رونق ہے؟ اتنی شدید سردی کے باوجود۔۔۔ لوگ نیو ایئر کی تیاریاں کررہے ہیں۔۔۔ اور ہم۔۔۔ اپنے بچوں کی ایک کال کے انتظار میں۔۔۔ بیٹھے ہیں۔'' عبدالستار کا لہجہ بھیگنے لگا تھا۔

ان کی آنکھوں میں۔۔۔ چھپا درد جہاں آراء بیگم کو رلا گیا۔۔۔ وہ تو عورت تھیں۔۔۔ کب تک برداشت کرتیں۔۔۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔۔۔ اٹھ کر واش روم کی سمت بڑھ گئیں۔

☆☆☆

عبدالستار سرکاری نوکری کرتے تھے۔ اچھی معقول نوکری تھی، اللہ پاک نے یکے بعد دیگرے تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ اعراج، صمد اور یوسف تینوں بہت اچھا پڑھتے تھے۔ تینوں نے اپنی مرضی سے انجینئرنگ پڑھی بچوں کی پڑھائی پر عبدالستار صاحب نے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ تینوں نے پڑھائی کے بعد اچھی جگہ جاب شروع کی اور اسی طرح جہاں آراء بیگم نے سال سال کے وقفے سے تینوں کی شادیاں کردیں۔ اعراج کی بیوی ثانیہ، صمد کی شافعہ اور یوسف کی بیوی ماورا تھی۔ گھر بڑا تھا اس لیے اچھی طرح گزر بسر ہوجاتی۔ شادی کے تین سال بعد اعراج نے امریکہ جانے کی کوشش کی اور جلد چلا گیا۔ پڑھا لکھا اور کام کا بندہ تھا سو جلد جاب بھی مل گئی اس نے بیوی اور بیٹے کو بھی وہیں بلوالیا۔

عبدالستار اور جہاں آراء بیگم کا یہ خواب ادھورا رہ گیا کہ تینوں بیٹے ایک چھت تلے رہیں پھر صمد کی خواہش اور مسلسل اصرار پر اعراج نے صمد کو بھی بلوالیا۔ ابھی اعراج کو وہاں گئے پانچ سال ہوئے تھے اس کے دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ صمد باہر گیا تو اس کی ایک بیٹی تھی، دو سال بعد جب وہ پاکستان آیا تو اپنے ساتھ اپنی بیٹی اور بیوی کو لے گیا۔ کچھ قسمت ساتھ دے رہی تھی کچھ ان لوگوں میں قابلیت بھی ایسی تھی لو بھی! دوسرے بیٹے کی فیملی بھی امریکہ شفٹ ہوگئی۔ سات سال میں دونوں بیٹے وہاں سیٹل ہوگئے۔۔۔ عبدالستار اور جہاں آراء اپنے بچوں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے مگر اخراجات، حالات اور آئندہ زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ کمانے کی خواہش میں بیٹوں کو ان ماں باپ کا خیال نہ رہا جن کی بدولت وہ لوگ اس مقام تک پہنچے تھے۔ ابھی یوسف اور ماورا اپنے دو جڑواں بیٹوں کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ ہی تھے۔ سو یہ دم بھی غنیمت تھا۔ اب اتنا بڑا سا گھر کاٹنے کو دوڑتا۔۔۔ اعراج اور صمد ابتدا میں تو جلدی جلدی کال کرتے بچوں سے بات کرواتے مگر پھر کام

اور ذمے داریوں میں الجھنے لگے۔ لیکن۔۔۔ ہر ماہ باقاعدگی سے ڈھیر سارے پیسے عبدالستار کے اکاؤنٹ میں آجاتے۔ باہر جانے کی کشش بھی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ماورا کو بھی اب امریکہ جانے کی خواہش ہونے لگی۔ یوسف کی اچھی بھلی بہترین جاب تھی۔ روپے پیسے کی ویسے بھی کچھ کمی نہ تھی۔ لیکن۔۔۔ یوسف کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں یہی خواہش پل رہی تھی۔

''ارے بیٹا! تم بھی چلے جاؤ گے تو۔۔۔ ہم لوگ تنہا رہ جائیں گے۔۔۔ اتنا بڑا گھر۔۔۔ ہم دو نفوس۔۔۔ ویسے بھی اعراج اور صمد کے آنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔ سب چلے جاؤ گے تو۔۔۔ ہم یہاں کس طرح رہ پائیں گے۔۔۔؟'' جہاں آراء بیگم نے سنا تو وہ سچ مچ پریشان ہوگئیں۔

''اماں! اعراج بھائی بھابی، صمد بھائی بھابی اپنے اپنے بچوں کے ساتھ اپنی مرضی اور پسند کی زندگی گزار رہے ہیں۔۔۔ سب کو اپنی زندگی بہتر بنانے کی خواہش ہوتی ہے کل کو ہمارے بچے بھی بڑے ہوں گے۔ سو اگر وہ لوگ اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے جاسکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں جاسکتے۔۔۔ اور جہاں تک آپ لوگوں کا سوال ہے تو۔۔۔ کون سا خدانخواستہ آپ لوگ ناتواں اور معذور ہیں۔۔۔ الحمدللہ اچھے بھلے ہیں آپ لوگ۔۔۔ ہم کون سا رشتہ ختم کرکے جارہے ہیں آپ سے رابطہ برقرار رہے گا۔۔۔ ہمارا۔۔۔ آتے جاتے رہیں گے۔'' ماورا نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ عبدالستار اور جہاں آرا بیگم اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔۔۔ یوسف بالکل خاموش بیٹھا تھا۔۔۔ دونوں نے اندر ہی اندر ساری پلاننگ کرلی تھی۔۔۔ اسی سال اعراج آنے والا تھا۔ طے یہ پایا کہ وہ دونوں شہر کے وسط میں پوش ایریا میں جہاں رونقیں بھی ہوں وہاں لگژری فلیٹ خرید کر وہاں شفٹ ہوجائیں گے اور کل وقتی ملازمین جن میں ایک مرد اور ایک عورت ہو مستقل انتظام کردیا جائے گا۔ دیگر کاموں کے لیے وہاں کے چوکیدار کو ایکسٹرا پیسے دے کر راضی کرلیا گیا جس میں باہر کے کام شامل تھے۔

سارے کام، سارے انتظام دونوں بیٹے زوروشور سے کررہے تھے ایک بار بھی کسی نے ماں باپ کی مرضی نہیں پوچھی۔۔۔ یہ احساس نہ ہوا کہ بوڑھے ماں باپ اپنے بڑھاپے کے دنوں میں ننھے منے پوتا پوتیوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔

☆☆☆

''جہاں آراء بیگم کیا تم بچوں کے فیصلے پر افسردہ ہو؟''

رات کو بستر پر لیٹے تو عبدالستار نے بیوی کو مخاطب کیا جو چپ چپ سی تھیں۔

''نہیں عبدالستار! سچ ہی تو کہہ رہے ہیں وہ لوگ۔۔۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔۔۔ بس دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے بچوں کو شاد آباد رکھے'' جہاں آراء بیگم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''ہوں۔۔۔!''

سارے انتظامات ہوگئے کوئی رکاوٹ، کوئی مسئلہ اور کوئی مشکل راہ میں حائل نہ ہوئی۔ کچھ تعلقات اور کچھ پیسے نے کام دکھایا۔۔۔ عبدالستار اور جہاں آرا بیگم فلیٹ میں آگئے۔ دین محمد اور اس کی بیوی نگینہ گھر کی دیکھ بھال اور کاموں کے لیے مستقل سرونٹ ایریا میں منتقل ہوگئے۔۔۔ یوسف بھی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بیوی بچوں سمیت میلوں دور جا بسا۔ زندگی ایک بار پھر پینتیس سال پیچھے چلی گئی۔۔۔ وہی دو افراد۔۔۔ جنہوں نے پینتیس سال پہلے زندگی کا آغاز کیا تھا۔۔۔ آج پینتیس سال بعد ایک بار پھر۔۔۔ زندگی ان دو افراد پر آ گئی۔ ایک، دو، تین۔۔۔ تین، تین بیٹے۔۔۔ تین بہوئیں سات پوتے اور پوتیاں۔۔۔ ہونے کے باوجود زندگی ''دو'' میں بٹ کر رہ گئی۔۔۔ شروع شروع میں ہفتہ بعد، پھر پندرہ دن، مہینہ۔۔۔ اور پھر یہ مہینوں کا حساب بنتا گیا۔۔۔ دو سال بعد لگنے والے چکر بھی۔۔۔ طویل تر ہوتے گئے۔۔۔ اب تو لگتا تھا کہ ان تیرہ افراد کے پاس ان دو

WOMEN SKILLS GROUP

بوڑھی جانوں کے لیے دس، دس منٹ نکالنا بھی محال تھا۔

پہلے پہل تو جہاں آراء بیگم بچوں سے گلہ کرتیں، ان کو احساس دلاتیں مگر...... رفتہ رفتہ وہ تو خاموش ہونے لگیں ــــ بیٹے بہو یا کسی بھی پوتا۔ پوتی کی سالگرہ یا اپنی ورسری ہوتی تو یاد سے عبدالستار اور جہاں آراء بیگم وش کرتے...... مگر وہاں کی زندگی اتنی مصروف، اتنی بیگانی ہو چکی تھی کہ نہ رشتوں کا خیال تھا نہ کسی ایونٹ کا اہتمام ــــ اس بھاگتی دوڑتی زندگی کا حصہ بن کر وہ لوگ ان لوگوں کو فراموش کرنے لگے تھے جن کی دعاؤں کی بدولت اللہ نے انہیں اس مقام تک پہنچایا تھا۔ گزشتہ چار سال سے تینوں بیٹوں میں سے کسی کی فیملی نے چکر نہیں لگایا...... ہر بار...... ماں باپ منتظر رہے لیکن...... وہاں سے معذرت۔

بے شک ہر طرح کی آسائش، سہولت میسر تھی مگر ــــ جن کی ضرورت تھی وہ ننھے منے بچے ان کی شرارتیں، ان کے لاڈ نخرے ــــ یہ وہ چھوٹی چھوٹی اور معصوم سی خواہشیں تھیں جن کو پورا کرنے کے لیے بوڑھے والدین ترس رہے تھے۔ دونوں اکثر بالکنی میں آ کھڑے ہوتے ــــ وہیں کرسیوں پر بیٹھ کر سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتے۔ رونق، شور اور باہر کی دنیا کی ہلچل کو محسوس کرتے۔

☆☆☆

"جہاں آراء سو گئیں کیا ــــ؟" عبدالستار نے آواز دی ــــ جہاں آراء ان کی آواز پر چونکیں مگر اسی طرح کروٹ لیے منہ پر کمبل لیے اپنی بے آواز سسکیوں کو دباتی رہیں وہ ــــ خود کو کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھیں اور ــــ کرتے کرتے دکھ، اذیت اور برداشت کی حدوں سے گزرتے وہ اندر سے نیم جاں ہو جاتیں ــــ عبدالستار نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔

"اچھا ہوا تمہاری آنکھ لگ گئی۔" عبدالستار کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑبڑائے۔ انہیں پتا تھا کہ بارہ بجے کے بعد بیگم کو ایسی ورسری وش بھی کرنی تھی۔ انہوں نے خاص گفٹ بھی بنوایا تھا جو بڑی مشکل سے جہاں آراء بیگم سے چھپا کر رکھا تھا۔

بارہ بجنے میں کچھ وقت باقی تھا کہ جہاں آراء بیگم اٹھ گئیں۔

"ارے سوئے نہیں ابھی تک؟" انہوں نے عبدالستار کو کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں ...... میں نے سوچا ابھی فائرنگ سے آنکھ کھل ہی جانی ہے اس لیے شور ختم جائے تب لیٹوں گا...... تم بھی آ جاؤ ذرا...... باہر کی رونقیں تو دیکھ لیں۔" جہاں آراء تو جانتی تھیں کہ عبدالستار ان کو مبارک باد دیے بغیر نہیں سوتے۔

"کاش ...... ہماری خوشیوں میں کم از کم ...... کال پر ہی سہی ہمارے بچے بھی شریک ہوتے۔" جہاں آراء بیگم کا دل نہ جانے کیوں آج بے حد اداس تھا۔ بے وجہ رونے کا دل کر رہا تھا۔

"اچھا! چلو اٹھتی ہوں......" انہوں نے گرم شال کو اچھی طرح لپیٹا...... عبدالستار نے سویٹر کے اوپر شال لپیٹی، سر پر اونی ٹوپی پہنی...... دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک قدم بڑھے تب ہی ...... ڈور بیل بجی۔

"ہائیں! یہ اس وقت کون آ سکتا ہے......؟" جہاں آراء بیگم خوف زدہ ہو گئیں۔

"ڈرنے کی بات نہیں بیگم صاحب! میں دیکھتا ہوں۔" دین محمد بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر آیا تھا۔

"صاحب ــــ بیگم صاحبہ! دیکھیں تو کون آیا ہے؟" دین محمد کے پیچھے نگینہ بھی دروازے تک گئی تھی ــــ وہیں سے چلائی تھی۔

عبدالستار اور جہاں آراء بیگم آواز سن کر شش و پنج میں تھے جیسے ہی نظر اٹھائی ــــ دروازے میں اعراج کھڑا تھا ــــ پیچھے تانیہ اس کی بیٹی اور بیٹا تھے۔ عبدالستار اور جہاں آراء بیگم ــــ حیرت، بے یقینی اور خواب کی سی کیفیت میں تھے۔

"بابا ــــ اماں۔" اعراج دوڑ کر دونوں سے لپٹ گیا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی آگے آئے۔

"تم ...... یہ خواب تو نہیں ہے......" جہاں آراء بیگم روتے ہوئے شوہر کی جانب پلٹیں۔

"اماں ...... معاف کر دیں ہمیں ...... ہم بہت دیر میں لوٹے۔" اعراج روتے ہوئے ماں سے لپٹ گیا...... تب ہی صمد اور شافعہ داخل ہوئے ان کے ساتھ ان کے بچے تھے۔ وہ بھی دوڑ کر ان کے گلے لگ گئے۔

"یہ ...... یہ سب کیا ہے۔" پیچھے یوسف اور ماورا بھی تھے...... ایک کے بعد ایک سرپرائز...... عبدالستار اور جہاں آراء بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت ...... یہ اچانک سے ایک ساتھ ...... سب کے سب سامنے تھے چار سال بعد...... چار سال بعد یوں سب کو دیکھ کر عجیب سی حالت ہو رہی تھی ــــ بچے بے حد شرمندہ تھے۔ انہوں نے عبدالستار اور جہاں آراء بیگم کو پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اعراج، صمد اور یوسف دونوں کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے ساتھ ہی تینوں کی بیویاں تھیں۔ بچے کچھ حیران اور کچھ خوشی کی کیفیت میں تھے۔

"بابا، اماں ...... ہم تینوں بہت شرمندہ ہیں کہ...... دنیا کی چکروں میں پھنس کر ہم اپنے فرائض کو یکسر بھلا بیٹھے تھے۔"

"ہمیں اب اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ صرف پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے اصل دولت تو رشتے، خلوص، پیار ہے ماں باپ جیسی نعمت تو دوبارہ مل ہی نہیں سکتی ...... کچھ دن پہلے میری اماں سے بات ہوئی تو سب نے زندگی میں پہلی بار اماں کو تنہا ...... دیکھا...... تب مجھے احساس ہوا کہ آپ دونوں کو ہمارے پیسوں کی نہیں ہماری ضرورت ہے ــــ میں نے صمد اور یوسف سے بات کی اور فیصلہ کر لیا اب ہم ہر سال باری باری آپ کے پاس آیا کریں گے۔ کبھی آپ لوگ ہمارے پاس آ جایا کریں۔

اماں! خدا کی قسم مجھے آپ کے ایک جملے نے ہلا کر رکھ دیا۔ جب آپ نے مجھے مسکراتے ہوئے کہا کہ الحمدللہ ہم ٹھیک ہیں خوش اور مطمئن ــــ "ہم دو کیونکہ ہم دو نے ہی یہ سفر شروع کیا تھا اور ــــ عمر کے آخری حصے میں بھی ہم دو رہ گئے۔ اماں میں بہت رویا کہ عمر کے اس حصے میں آپ دونوں کو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔ وہ سفر جو آپ دونوں نے شروع کیا تھا آج ...... الحمدللہ اس سفر میں وقت نے اتنے سارے لوگوں کو آپ کا ہمسفر بنایا تو کیوں نہ ہم سب مل کر یہ سفر طے کریں۔ یہی سوچ کر ایک بار پھر ہم سب اکٹھا ہوئے ہیں۔"

"اماں ...... بابا آپ ہم لوگوں کو معاف کر دیں۔" پہلے اعراج نے ساری بات کی آخر میں صمد اور یوسف نے دونوں کے ہاتھ تھام کر روتے ہوئے معافی مانگی...... عبدالستار اور جہاں آراء بیگم نے جو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ آگے بڑھ کر بیٹوں کو ایک بار پھر سینے سے لگا لیا...... ساتھ ہی گھڑی نے بارہ بجائے...... باہر فائرنگ شروع ہو گئی۔

"ہیپی نیو ایئر ...... اماں بابا ہیپی ویڈنگ اینی ورسری۔" تینوں بہوؤں نے آگے بڑھ کر ساس اور سسر کے آگے جھکتے ہوئے پیار سے کہا......

بچے بھی دادا دادی کی سمت دوڑے...... اچانک سے ملنے والی یہ خوشی...... ماں باپ کے لیے ہفت اقلیم سے بھی زیادہ تھی۔

بے شک ایک تکلیف دہ اور تھکا دینے والے سفر کے بعد ایک بار پھر رب نے خوشیاں لوٹا دی تھیں۔ وہ گھر جس میں کچھ دیر پہلے تک ویرانی، خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ اچانک ہی گہما گہمی، چہل پہل اور شور سے آباد ہو گیا تھا ــــ نہ سردی کا احساس تھا نہ تھکن غالب تھی۔ بچے اچھلتے کودتے بالکنی میں جا کر سڑک پر ہونے والے نیو ایئر کے فنکشن کو انجوائے کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ دادا اور دادی کی شادی کی سالگرہ کا کیک بھی کھا رہے تھے عبدالستار اور جہاں آراء بیگم اپنے رب کے حضور سجدہ شکر بجا لا رہے تھے کہ جس نے ان کے گھر کی رونقیں بحال کر دی تھیں۔ آنے والے سال کے لیے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے اپنے رب سے خوشیاں مانگ رہے تھے۔ بکھرا ہوا "آشیانہ" پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ ☆

WOMEN SKILLS GROUP

Women Skills

"مس مائرہ! آپ اندر جا سکتی ہیں۔" شیشے کے کیبن میں بیٹھی لڑکی نے آڈیشن کے لیے آنے والی لڑکیوں میں سے ایک خوب صورت لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک ادا سے اپنے گھنے سنہری کلی بال جھٹکتی، لہروں جیسی چال چلتی اندر کی سمت بڑھ گئی۔ اس نے شیشے کا دروازہ بجے سے دھکیلا اور نرم و نازک سا وجود کمرے میں قدم رکھتے ہی کچھ اور تن گیا۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔" دلکش لہجے میں کہتی اس نے میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھے وجود سے جیسے اجازت طلب کی۔ وہ اس کی طرف پشت کیے فون پر مصروف تھا، تب ہی اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ اسی انداز سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اندر چلی آئی۔

تب ہی اس شخص نے کرسی گھمائی۔ مائرہ نے ایک بے حد دل کش مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔ مگر سامنے والے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ مسکراہٹ ایک پل میں اس کے چہرے سے غائب ہوگئی۔ وہ بے اختیار ہی دو قدم پیچھے ہٹی۔

"مس مائرہ! پلیز تشریف رکھیے۔" اجنبی آواز میں کہتے ہوئے اس خوبرو جوان نے کال بند کی اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے لہجے میں اجنبیت محسوس کرکے مائرہ نے بہت توجہ سے اس کی آنکھوں میں کچھ تلاشنا چاہا، مگر وہاں ان نظروں میں شناسائی کی رمق تک نہ تھی، تو کیا وہ اسے بھول چکا تھا۔ اسے جو کبھی اس کی متاعِ حیات تھی۔ اس کی کل کائنات تھی، جس کی وجہ سے وہ زندہ رہنا چاہتا تھا صدیوں تک۔ کیا یہ وہی شخص تھا، وہ سوچ گئی۔

حیا بخاری

گلاب رُتوں کے ہم سفر

WOMEN SKILLS GROUP

"کوئی مسئلہ؟" پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ وہ جیسے اب حیران ہوا تھا۔ اس کے یوں گم صم ٹھہر جانے پر۔

"نو، نو سر۔" وہ ہکلائی۔

"خیر، مجھے ابھی ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ باقی انٹرویو میرے اسسٹنٹ عدنان صاحب کریں گے لیکن پلیز، آپ مطمئن رہیں۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے انٹرکام کا بٹن دباتے ہوئے کہا اور دوسری طرف کسی کو ہدایات دینے لگا۔

مائرہ خان، ملک کی ابھرتی ہوئی ماڈل تو بس اس کی شان دار اور ساحرانہ شخصیت میں کھو سی گئی۔ وہ آج بھی بالکل ویسا تھا، وہی سانولی مگر پرکشش رنگت، ہلکی ہلکی سبز مائل رویں کے جیسی شیو، ڈارک براؤن، چمک دار آنکھیں اور خوب صورت ہونٹوں پر مسکان کھلتے ہی دائیں گال پر پڑ جانے والا ننھا سا گڑھا۔

لیکن نہیں .... وہ بظاہر پہلے جیسا بھلے ہی تھا مگر اصل میں کافی حد تک بدل بھی چکا تھا۔ سادہ سے شلوار قمیص کی جگہ وہ اس وقت بہترین تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ دولت مند بھی ہو چکا تھا اور دین داری کے ساتھ دنیاداری کو بھی تسلیم کر چکا تھا۔ تب ہی تو وہ اس فیلڈ میں آ گیا تھا۔ وہ شاہ سائیں کے دربار کے حولی کا بیٹا۔ ان کا اکلوتا وارث۔ جسے اعلا تعلیم کی اجازت بہت مشکل سے ملی۔ وہ بھلا یہ کام کیسے کر سکتا ہے۔ پھر اس کے پاس تو صرف چند کنال زمین تھی۔ اتنی دولت، اتنا شان دار آفس، وہ سوچتی رہ گئی۔ محور اس کی سوچوں کا تب ٹوٹا جب کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ سامنے کرسی پر بیٹھا وجود یکسر مختلف تھا۔ اس وجود سے جو کچھ دیر پہلے اس کرسی پر براجمان تھا۔ وہ اس سے سوالات پوچھنے لگا۔ مائرہ خان نے سر جھٹک کے خود کو اس کے سوالوں کے لیے تیار کیا تھا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے اپنے اختتام کی طرف رواں تھی۔ اے سی کی کولنگ نے کمرے کی فضا میں اچھی خاصی خنکی بھر دی تھی۔ مگر وہ اپنی آرام دہ کرسی پر جھولتا سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جا رہا تھا۔ اس کی خوب صورت کھلی پیشانی پر سوچوں کی لکیریں بے حد واضح تھیں۔

اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی اور میز پر رکھی بہت سی تصویروں میں سے چند تصویریں اٹھالیں۔ تصویروں میں بہت ہی خوب صورت لڑکی مختلف جگہوں پر، مختلف پوز بنائے کھڑی تھی۔ وہ مختلف برانڈ کی چیزوں کی نمائش کر رہی تھی۔ اس کا پرسکون مسکراتا چہرہ اور مغرور آنکھیں کسی بھی دکھ یا پچھتاوے سے خالی تھیں۔ اس نے تصویریں زمین پر اچھال دیں اور ایک اور سگریٹ سلگا لی۔

"تو یہ تھی تمہاری چاہت شہزا زیدی!" اس نے تلخی سے سوچا۔

"دن میں نہ جانے کتنے ہی دل تمہیں سوچتے ہوں گے، مگر صرف چند لمحوں کے لیے۔ کتنی آنکھیں تمہیں نظروں ہی نظروں میں چھیدتی ہوں گی شاید تم اندازہ بھی نہ کر سکو۔ سڑک پر لگے اشتہار کی کیا عزت؟" اس نے نفرت سے ہنکارا ابھرا۔

"کس طرح میری مخلص اور سادہ محبت کو ٹھوکر مار کر اس عیش و عشرت کا ہاتھ تھاما تھا تم نے۔ کتنی منتیں کی تھیں میں نے تمہاری کہ یہ راستہ صرف پستیوں کی طرف جاتا ہے۔ چار دن کا عروج اور پھر لازوال، زوال شروع ہو جاتا ہے۔

آج تمہیں تمہاری لالچ اور ہوس نے پھر میرے در پر لا پھینکا اور اب بھی تم مجھ سے توقع کرتی ہو کہ میں تمہیں پہچانوں۔ تمہیں دیکھ کر تمہارے قدموں میں بچھ جاؤں۔

جس محبت کا گلا تم نے اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا، وہ بھی چند پیسے اور سستی شہرت کی خاطر۔ اس سے یہ توقع کیوں؟ میرے دل میں تمہارے لیے سوائے ہمدردی اور نفرت کے کچھ باقی نہیں رہا، کچھ بھی۔ تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ کتنا تڑپا تھا میں۔ کتنا رویا تھا تمہارے لیے اور اب جب میں سکون سے جینے لگا تو تم پھر پورے غرور سے میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ لیکن نہیں، اس بار میں تمہارا غرور توڑ دوں گا۔" اس نے سگریٹ اچھالی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ماضی کے چند باب پلکوں تلے ورق در ورق نمایاں ہونے لگے تھے۔

☆☆☆

وہ پہلی مرتبہ کراچی آیا تھا تب ہی اسے اپنا مطلوبہ پتا ڈھونڈنے میں کافی مشکل پیش آئی تھی۔ وہ چاہتا تو اپنے گاؤں سے نزدیکی شہر حیدر آباد میں بھی تعلیم جاری رکھ سکتا تھا مگر اس نے سنا تھا کہ کراچی ہر آنے والے کو اپنی گود میں سمیٹ لیتا ہے۔ اسے اپنی تعلیم کے ساتھ کچھ پیسوں کی بھی ضرورت تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ روشنیوں کے اس شہر میں وہ کافی حد تک اپنی مشکلات پر قابو پا سکتا تھا۔

اس نے دستک دی تو ایک کمزور سی بزرگ عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے ادب سے سلام کیا، اسے دیکھتے ہی بزرگ خاتون کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔

"مہران علی، بیٹا! تم ہی ہو نا ں۔" خوشی ان کے لہجے سے بھی چھلکنے لگی۔

"جی پھوپھو! مجھے احمد علی شاہ میرا مطلب ہے میرے بابا سائیں نے بھیجا تھا آپ کے پاس۔ وہ مجھے ......" وہ بات پوری نہ کر سکا تھا۔ پھوپھو نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا تھا۔

"آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ۔ آ جاؤ، تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔" اسے بازو سے پکڑ کر وہ اندر لائی تھیں۔ صاف شفاف صحن جس کے ایک طرف چھوٹی سی کیاری میں پھول ہی پھول تھے۔

سامنے ہی برآمدہ اور دو کمرے تھے۔ برآمدے کے ساتھ ہی اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے شاید باتھ روم تھا، اس نے ایک تفصیلی نگاہ گھر پر ڈالی تھی۔

"تمہارے لیے اوپر کا کمرہ سیٹ کروا رہی ہوں۔ نہ جانے کب سے بند پڑا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ جوان جہان لڑکی کا ساتھ ہے نا، تو کسی کو کرائے پر نہ دے سکی۔ پر تم سے کیا مسئلہ، تم تو میرے اپنے ہو، تب ہی فوراً احمد علی کو ہاں کہہ دی۔ اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔" انہوں نے صحن میں پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود ایک طرف بنے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

مہران علی ایک دفعہ پھر سے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ گھر کا پرسکون ماحول دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ پڑھ سکے گا۔ تب ہی سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی تھی، اس کی نظریں اٹھیں، کمر کے گرد کس کر دوپٹا باندھے، الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ بڑبڑاتی ہوئی وہ لڑکی، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ تب ہی اس لڑکی کی نظر بھی اس پر پڑی تھی، اس نے نیچے اترتے ہی بالٹی اور جھاڑو ایک طرف رکھی اور سیدھا اس کی طرف آ گئی۔

"تم ہو مہران علی شاہ؟" دونوں ہاتھ کمر پر باندھے وہ کسی مغرور رانی کی طرح اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ اس کے اس قدر بولڈ انداز پر مہران صرف سر ہی ہلا سکا۔

"لو جی، کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔" اس نے ہاتھوں سے ہی پہاڑ کی پیمائش کی اور چوہا کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ کیے تو وہ بے چارہ اچھل ہی پڑا۔

"جی۔" وہ حیران تھا یا شاید پریشان۔

"جی۔ خدا کی پناہ۔ اماں نے تو مجھ سے ایسے صفائیاں کروائیں جیسے کوئی بہت بڑا لینڈ لارڈ آ رہا ہو۔ تم تو مجھے ہم سے بھی نچلے درجے کے لگتے ہو۔"

مہران کو اس کی بات پر افسوس سا ہوا مگر وہ چپ رہا۔

"اماں بھی ناں۔ اتنی تعریفیں کیں کہ متولی کا اکلوتا لڑکا ہے۔ اتنا بڑا دربار ہے ان کا اور زمینیں بھی۔

WOMEN SKILLS GROUP

یہ حالت ہوتی ہے زمینوں والوں کی۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سر جھکانے سے ٹوکا تھا۔
اسی وقت پھوپھو چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں سموسے اور چائے رکھی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔
"ابھی دیکھو، پہلے میری شہزا نے بنائے تھے، بہت شوق ہے اسے نئی نئی چیزیں سیکھنے کا۔ تم کھاؤ گے تو تعریف کیے بنا رہ نہ سکو گے۔" انہوں نے ٹرے اس کے پاس ہی رکھتے ہوئے کہا۔
"شہزا جاؤ بیٹا، تم ذرا رات کا کھانا دیکھ لو اور سلام کیا کرتی ہیں۔" اچانک انہیں خیال آیا۔
"بس اماں! اب کھانا خود ہی دیکھ لو۔ میری تو کمر توڑ دی ہے تم نے۔ پھر میں نے آج سارا دن ایک بھی ڈراما نہیں دیکھا۔ تمہارے چاچا کے بیٹے کے ... اس بیٹے کے چکر میں۔ مجھ سے نہیں ہوتا اور کام۔" صاف جواب دے کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی اور فوراً ہی کمرے سے ٹی وی کی اونچی آواز باہر آنے لگی۔
"تم دل پر مت لینا بیٹا۔ یہ ہے ہی ایسی لاپروا سی۔ اصل میں بچپن سے ہی باپ کے سائے سے محروم ہو گئی تھی ناں تو میں نے اس پر زیادہ روک ٹوک نہیں کی۔ بس تب ہی ذرا۔ لاپرواہی ہو گئی ہے۔" ان کے چہرے پر شرمندگی تھی، مہران کو برا لگا۔
"کوئی نہیں پھوپھو! آپ بھی میری ماں ہیں۔ شہزا ابھی چھوٹی ہے، جب زندگی میں مکمل طور پر قدم رکھے گی تو خود بخود سمجھ دار ہو جائے گی اور ویسے بھی لڑکیوں کی لاپروائی کے یہی دن تو ہوتے ہیں۔ پھر ساری عمر خواری ہی خواری۔" اس نے نہ جانے کس کتاب میں پڑھی لائنیں دہرائی تھیں اور پھوپھو اس کی عقل و فراست کی مزید قائل ہو گئی تھیں۔
"اچھا تو یہ تو لے نا۔ بتا ذرا کیسے بنائے ہیں شہزا نے۔" اماں نے سموسوں کی پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک سموسہ اٹھا لیا۔
"واؤ زبردست۔ واقعی بہت مزے دار ہے۔" اس نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔ پھوپھو اس سے گاؤں کا حال احوال پوچھنے لگیں۔ وہ بھی خوشی خوشی انہیں جواب دیتا رہا۔

☆☆☆

"سر! سیکریٹری کے لیے جو اشتہار دیا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ لڑکیاں آئی ہوئی ہیں۔ کچھ کے انٹرویوز تو میں لے چکا ہوں۔ ..." عدنان مزید کچھ کہتا کہ مہران نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔
"بس پھر ان ہی میں سے کوئی سلیکٹ کر لو نا یار۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" اس نے سیٹ پر نیم دراز ہوتے کہا۔
"مگر سر ان کی انگلش زیادہ اچھی نہیں۔ دوسرا ..." وہ خاموش ہوا۔
"ان میں بولڈ نیس کافی زیادہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کیٹ واک پر آئی ہوں۔" عدنان کو اپنے لفظوں پر افسوس ہوا مگر مہران کو سب سچ بتانا بھی اس کی مجبوری تھی۔ وہ مہران کی سخت طبیعت سے بخوبی واقف تھا۔
"نہیں، پھر کوئی سمپل سی ہے تو بھیج دو ورنہ ختم کرو یہ ڈراما اور کل دوبارہ سے اشتہار دو۔" اس نے بات ختم کی۔ عدنان سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ مہران میز پر پڑی فائلز دیکھنے لگا۔ تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔
"یس۔" شیشے کے اس پار نظر آنے والے عکس پر نظریں جماتے ہوئے اس نے تیز آواز میں کہا۔ مگر سایہ مسلسل دروازے پر ہاتھ مارتا دکھائی دیا، جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ مہران کچھ حیران ہوا، پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ خود بخود اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل اٹھی۔ آنے والی شاید دروازہ نہیں کھول پا رہی تھی۔
وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کے قریب آیا اور احتیاط سے دروازہ ایک طرف دھکیل دیا۔ بلیک کلر کے اسکارف میں لپٹا، گلابی رنگت لیے چہرہ کچھ شرمندہ سا ہوا۔
"آئی ایم سوری سر! وہ اصل میں ..." وہ ہکلائی۔
"اٹس اوکے۔ اندر آئیں۔" وہ کہتا واپس اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ نازک سی لڑکی شاید گھبرا رہی تھی، جب ہی ماتھے سے پسینہ پونچھتی وہ بمشکل کرسی تک پہنچ پائی تھی۔ مہران کو نو عمر ڈری سہمی لڑکی بے حد دلچسپ لگی۔
"آپ آرام سے بیٹھیں۔ ریلیکس پلیز۔" مہران مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھا۔ یہ بات اسے مزید گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔
"ڈاکومنٹس لائی ہیں۔" مہران نے پوچھا تو اس نے خاموشی سے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔ کاغذات پر نگاہ ڈالتے ہی مہران کی آنکھوں میں چمک سی ابھری تھی۔
"آپ نے بزنس مینجمنٹ میں ڈپلوما کر رکھا ہے، میں تو آپ کو سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ سمجھا تھا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا تو پہلی بار سامنے بیٹھی لڑکی کے چہرے پر خوف کچھ کم ہوا۔
"انگلش بھی ٹھیک ٹھاک بول لیتی ہوں گی آپ۔ آئی مین مارکس کافی شان دار ہیں آپ کے۔" مہران نے پوچھا تو وہ سر ہلا گئی۔
"مس ندی! جاب آپ کا شوق ہے یا مجبوری۔" اچانک اسے خیال آیا۔
"مجبوری ہے سر!" اس نے سچائی سے بتایا۔
"لیکن یہ اسکارف، آئی مین آپ دوپٹا لے لیتیں تو۔ اسکارف کچھ عجیب سا نہیں لگتا اور خصوصاً اس طرح کی کمپنی کی جاب میں۔" نہ جانے اس کے دل میں کیا تھا، ندی کو اس کی بات بالکل بھی اچھی نہ لگی۔
وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔
"دوغلی قوم۔ غیر مسلم حجاب پر پابندی لگائیں تو سڑکوں پر نکل آتے ہیں، اپنے ملک میں ایک اسکارف تک برداشت نہیں ہوتا۔" وہ بڑبڑائی۔
"ایکسکیوزمی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" مہران نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بولا۔ وہ شاید مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔
"جی نہیں، اپنے منکر نکیر کے سوالوں کے جواب دے رہی ہوں۔" اس نے پہلے بائیں پھر دائیں کندھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
مہران کھل کے ہنس دیا۔ وہ تیزی سے سر جھٹکتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"آ گئیں مہارانی! مل گئی نوکری۔" گھر کی دہلیز کے اندر قدم رکھتے ہی حسب توقع ماں اس کا

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
دستِ کوزہ گر
فوزیہ یاسمین

قیمت -/750 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

WOMEN SKILLS GROUP

راستہ روکے کھڑی تھیں۔
"امید تو نہیں ہے مامی! پر دیکھیں جو اللہ کی مرضی۔" اس نے سچ بتایا ہمیشہ کی طرح۔

"ملے گی بھی نہیں۔ اب سب کو ہڈ حرامی کی لت پڑ گئی ہے، بس چارپائی پر بیٹھ کر روٹیاں توڑتے رہو تم سب۔" مامی نے غصے سے کہا تو اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ جلدی سے اپنی چیزیں کمرے میں رکھنے چلی گئی۔

"اماں! اتنا کام تو کرتی ہیں باجی! تم بھی ناں خوامخواہ میں انہیں سناتی رہتی ہو۔" چودہ سالہ شاہ زیب ماں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"ہاں تو اس کے بھلے کے لیے ہی کہتی ہوں۔ کل کو پرائے گھر بھی جانا ہے اس نے کچھ ساتھ نہ لے کر جائے گی تو ساری عمر طعنے سہے گی۔ میرے پاس تو تم لوگوں کو کھلانے کے لیے پوری نہیں پڑتی۔ ایک پنشن میں کیا کیا کروں میں۔" مامی برآمدے کے سامنے رکھی چارپائی پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگیں۔

"مامی! میں کوشش کر رہی ہوں ناں۔ پھر ٹیوشنز کے پیسے تو مل رہے ہیں نا ابھی۔ اللہ نے چاہا تو کوئی پکا بندوبست ہو جائے گا۔" وہ ان کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دینے لگی۔

"بس بس۔ مجھ سے یہ ہمدردی جتانے کی کوشش نہ کرو اور بار بار یہ ٹیوشن کے طعنے بھی نہ سنایا کرو۔ میرا گزارا ہو جاتا ہے اچھا بھلا تیرے ماموں کی پنشن میں۔ میں نے بھی تجھے اپنے لیے مجبور نہیں کیا۔ تیرے پیسے لیتی ہوں تو صرف تیرے بھلے کے لیے تاکہ وقت پر تیرے کام آ سکیں۔" مامی نے صاف طور پر اس کی محبت ٹھکراتے ہوئے اسے خود سے دور کیا۔ وہ تڑپ کے رہ گئی۔

"جا کچن میں کھانا رکھا ہوگا، کھا لے۔ ورنہ پھر کہے گی کہ مامی پیسے لے لیتی ہے مگر مجھے کھانے تک کا نہیں پوچھتی۔"

"جی مامی!" وہ خاموشی سے کچن میں چلی آئی۔ منہ میں عجیب سا نمک گھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

"اللہ...... شزا! تم لوگوں کا کرایہ دار تو بڑا ہینڈسم ہے۔" سدرہ اس کی اسکول کی سہیلی تھی۔ امیر ماں باپ کی اکلوتی بگڑی اولاد اور شزا کی کمزوری ہمیشہ ایسے لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ سدرہ کی سنگت میں وہ اپنی چھوٹی موٹی خواہشات آسانی سے پوری کر لیتی تھی۔

ابھی بھی وہ برآمدے میں پڑے جھولے پر بیٹھی ڈائجسٹ پڑھنے میں گم تھی کہ سدرہ کی بات پر چونک پڑی۔ اس کی نگاہ سامنے کھڑے مہران پر پڑی، جو اماں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔

"اب اتنا بھی ہینڈسم نہیں ہے۔" وہ منہ بنا کر دوبارہ رسالے میں سر دے گئی۔

"پھر تمہاری نظر خراب ہے، ٹیسٹ کرواؤ۔" سدرہ نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹی۔ وہ سی کر کے رہ گئی۔

"ویسے کبھی اس سے کوئی بات وات بھی ہوئی؟" اس نے مزید پوچھا۔

"ابھی کل ہی تو آیا ہے۔ اماں نے تو تعریفوں کے اتنے پل باندھے تھے کہ میں نے سوچا کوئی شہزادہ آ رہا ہے، پر اسے دیکھ کر تو میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔" اس نے رسالہ بند کر کے مایوس لہجے میں کہا

"شہزادہ؟" سدرہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں اماں نے کہا تھا، بہت بڑا زمین دار ہے۔ میں نے سوچا یہ بڑی کار میں آئے گا۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اگر اس کے پاس یہ لمبی کار ہوتی تو اسے بھلا تمہارے گھر کرائے پر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔" سدرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو شزا کا چمکتا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا، مہران اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت دل کش مسکراہٹ سجی تھی، شزا دل جل ہی گئی۔

"اچھا چل، میرا تعارف تو کرا دے۔" سدرہ نے اسے کہنی ماری۔

"کس خوشی میں؟" وہ رسالہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"پرسوں میرے گھر پر پارٹی ہے۔ جو ڈریس دل کرے لے لینا میری وارڈ روب سے۔" سدرہ نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق شزا اچھل اٹھی تھی۔

"میں بلاتی ہوں اسے۔" وہ فوراً سیڑھیاں چڑھتے مہران کے پیچھے لپکی۔

"اوئے، سنو۔ نقلی لینڈ لارڈ۔" وہ وہیں سے چلائی۔ مہران مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

"میری فرینڈ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ ذرا نیچے آؤ۔" کمر پر ہاتھ باندھے اس نے جیسے مہران کو حکم سنایا، وہ مسکرا دیا۔

"تم بلاؤ تو ضرور۔ باقی اوروں کے لیے میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ آئی ایم سوری۔" سہولت سے منع کرتا وہ اوپر چڑھ گیا۔

"تمہیں ضرورت ہی کیا تھی اسے بات کرنے کی۔" سدرہ تلملاتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"ساری عمر گاؤں کے اجڈ ماحول میں پلا بڑھا ہے۔ تمہیں ہی اس سے بات کرنے کا شوق تھا ورنہ میں تو اسے ایک نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔" شزا کو سدرہ سے زیادہ اپنی بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو۔ تم بس پرسوں کی پارٹی پر دھیان دو۔ میں تمہیں پیسے دوں گی، فیشل وغیرہ کروا لینا۔ ذرا شکل تو دیکھو اپنی۔ حلیہ درست کروا لینا۔ بڑے بڑے بزنس مین ہوں گے پارٹی میں، کیا پتا کہیں تمہاری بات بن جائے۔" سدرہ نے آنکھ مارتے شرارتی انداز میں کہا تو شزا کھل کے مسکرا دی۔

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔" اس نے فوراً دعا کی تھی۔

☆☆☆

وہ شیو کر رہا تھا کہ شزا تن فن کرتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ تنگ پاجامے کے ساتھ، تنگ سا کرتا پہنے اور گلے میں سبز رنگ کا دوپٹا لٹکائے وہ ہمیشہ کی طرح اجلی اور معصوم لگ رہی تھی۔ مہران نے دوبارہ نظریں سامنے پڑے آئینے پر مرکوز کر لیں۔

"اگر تم دو منٹ اس سے بات کر لیتے تو کیا چلا جاتا تمہارا ہاں۔" غضب ناک لہجے میں بولی۔ مہران بامشکل مسکراہٹ روک پایا۔

"میں مصروف تھا۔"

"ہاں ہاں۔ تم تو گورنر ہو یا پھر وزیر اعلیٰ، ہے ناں۔"

"جو سمجھو۔" مہران نے تولیے سے منہ صاف کیا اور سامان اٹھا کر الماری میں رکھنے اندر چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔

"مسٹر لینڈ لارڈ۔" اب وہ طنزاً اسے اسی نام سے پکارتی تھی۔

"یہ نخرے اپنے گاؤں میں ہی چھوڑ آؤ، جہاں گنوار لوگ یہ سب سہہ لیتے ہیں۔ یہ شہر ہے شہر۔ یہاں یہ سب نہیں چلتا۔" شزا کے لہجے میں طنز تھا یا تنفر، وہ سمجھ نہ پایا۔ بہرحال اسے سخت ناگوار گزرا۔

"یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ گاؤں کے لوگ اجڈ اور گنوار ہوتے ہیں۔ وہ تو مہمانوں کو رحمت سمجھنے والے لوگ ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ ان کا معیار، ان کے طرز زندگی کو پرکھ کے بنائیں۔" اپنے تئیں گہری چوٹ کی تھی، مگر وہاں کسے پروا تھی۔

"میں تم سے لیکچر سننے نہیں آئی، صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ ہم تمہیں صرف دو وقت کا کھانا اور صبح کی چائے دیں گے۔ بس باقی کا انتظام تمہیں خود کرنا ہوگا اور ہاں ان سب کا بھی تمہیں معاوضہ دینا ہوگا۔ نہیں تو شوق سے کوئی اور بندوبست کر لو۔" وہ رکھائی سے بولی تھی، مہران خاموش رہ گیا۔

"اور دوسری بات؟" شزا نے رسالہ اپنی ٹھوڑی کے قریب لاتے ہوئے جیسے کچھ سوچا تھا، پھر بولی۔

WOMEN SKILLS GROUP

"ہر کیم سے چار تک کرایہ مل جانا چاہیے۔ یہ بھی تم اماں کے رشتہ دار ہو تو میں کچھ خیال کر رہی ہوں ورنہ——"

"بڑی مہربانی۔ ان شاء اللہ میں مایوس نہیں کروں گا آپ لوگوں کو۔" گہری نظروں سے اسے تکتے مہران نے اسے سادہ لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

"ندئی بیٹا! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔" وہ ماموں کی مفلوج ٹانگوں پر مالش کر رہی تھی کہ ان کی شرمندہ سی آواز اسے اداس کر گئی۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں ماموں!" وہ خفا ہوئی۔

"سچ کہہ رہا ہوں بیٹا! تمہاری مامی کا تمہارے ساتھ رویہ دیکھ کر میں تم سے، تمہارے ماں باپ سے سخت شرمندہ ہوں میرے بچے۔ اس معذوری نے تو مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ تمہارا ساتھ دے پاؤں، کم از کم تم سے اس عورت کی طرف سے معافی تو مانگ سکتا ہوں۔" ماموں نے نم پلکوں کہا تو ندئی مزید شرمندہ ہوگئی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں ماموں! کیوں مجھے شرمندہ کر رہے ہیں اور سچ کہوں تو ماموں! قصور مامی کا بھی نہیں۔ آپ مہنگائی بھی تو دیکھیں، لوگوں کو دو وقت کی عزت کی روٹی میسر آنا مشکل ہو گیا ہے۔ پھر چھوٹے چار بچے، ان کی پڑھائی، اور دوسرے خرچے آپ کی بیماری اور آمدنی صرف آپ کی چند ہزار روپے پنشن، اوپر سے میرا بوجھ۔ تو ایسی حالت میں آپ خود سوچیں مامی کتنی مشکل سے گزارا کرتی ہوں گی۔

بس آپ یہ باتیں نہ سوچا کریں، میری اور مامی کی باتیں آپ نہیں سمجھ سکتے۔ آپ بس دعا کریں کہ جلد ہی میری نوکری لگ جائے اور ہمارے حالات بہتر ہو جائیں۔" اس نے محبت سے ماموں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو وہ بھی دھیمے سے مسکرا دیے۔

☆☆☆

اسے پکا یقین تھا کہ اس کی اس قدر مستحکم حالت دیکھ کر وہ اب اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی اور اس کی توقع کے عین مطابق ریجیکٹ ہونے کے باوجود وہ ٹھیک تیسرے روز اس کے آفس میں موجود تھی۔

وہ آفس آیا تو اسے بتایا گیا کہ اس کی کوئی کزن اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ فوراً پہچان گیا تھا۔ وہ بہت اسٹائل سے اس کی سیٹ پر براجمان تھی۔ مہران علی نقوی کا چہرہ یکدم تن سا گیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ سوری! کافی دیر ہوگئی تھی ناں تو تھک کر ایسے ہی سیٹ بدل لی۔" اس کی آواز سے عجیب سا خمار چھلک رہا تھا۔

"جو انسان اپنی جھوٹی خواہشات کو پانے کے لیے اپنا آپ بدل سکتا ہے، سیٹ بدلنا تو اس کے لیے کچھ بھی نہیں۔" ضبط کے باوجود بھی وہ خود کو کہنے سے نہ روک پایا تھا۔

"اوہ، تو اس کا مطلب میرا یقین ٹھیک تھا۔ تم مجھے بھلا نہیں پائے، کیوں مہران علی نقوی۔" ایک ادا سے کلر کیے بالوں کو پیچھے جھٹکتی وہ اسے زہر لگی۔

"ماننا پڑے گا۔ تم تو مجھ سے بھی بڑے ایکٹر ہو۔" مائرہ نے تالی بجائی۔

"اس مطلبی اور ہوس پرست دنیا میں سب ہی زبردست ایکٹر ہیں۔ پھر مجھ سے مطلب۔" اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سگریٹ سلگالی۔ مائرہ نے دیکھا اس کی شخصیت نکھر کے مزید نکھر سی گئی تھی۔ وہ کافی میچور لگ رہا تھا۔

"ویسے سچ میں، مجھے لگا اس روز تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا تھا۔"

"پہچان کر کیا کرنا تھا۔ مجھے کام لینا تھا اور تمہیں کام چاہیے تھا۔ بس، اٹس اوور۔" مہران نے دھواں اڑایا۔

"بس، کیا ایسا کہنے سے سب ختم ہو جائے گا۔ تمہاری چاہت، تمہاری محبت، تمہارے خواب……"

وہ اٹھ کر اس کے سامنے آکر میز کے سرے سے ٹک گئی۔ اس کی ہیزل گرین آنکھیں مہران کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

"وہ سب ختم ہو چکا ہے۔ یہ سب کہنے سے بہت پہلے اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔" مہران نے کمال اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"خیر یہ بتاؤ، اماں کیسی ہیں؟ آئی مین میری پھوپھو؟" اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے پوچھا۔

"ان کی تو دو سال پہلے ہی ڈیتھ ہوگئی۔ انہیں اپنے گھر کا بہت صدمہ تھا حالانکہ میرا اپنا فلیٹ کافی اچھا اور فرنشڈ تھا۔ مگر یونو پرانے لوگ یہ کبھی اپنے ماضی سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔"

اس نے بے فکری سے اپنے ہاتھ میں پڑے بریسلیٹ سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔ مہران تاسف سے اسے دیکھے گیا، وہ چاہ کر بھی اس سے پھوپھو کا افسوس نہ کر پایا۔ اسے یہ غم بھی اکیلے ہی برداشت کرنا تھا۔

☆☆☆

"اماں! سوٹ تک تو مجھے سدرہ دے رہی ہے۔ اب یہ جیولری اور سینڈل بھی تم نہیں لے کر دے سکتیں۔" اماں کے صاف انکار پر اب وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"ہاں نہیں ہیں میرے پاس تمہاری ان فضول خرچیوں کے لیے پیسے۔ ارے تمہارا بیاہ بھی کرنا ہے پھر۔" اماں سے اس کا رونا دھونا بھی برداشت نہیں ہوتا تھا مگر بیٹی کی نت نئی فرمائشوں کے آگے بند باندھنا بھی ان کی مجبوری تھی۔

"بیاہ پر بھی یہی کہنا ہے تم نے اماں! کون سا مجھے گاڑی، اے سی دے دینے ہیں تم نے۔" وہ بدتمیزی سے بولی۔

"شزا۔" انہوں نے سختی سے اسے ٹوکا۔

"چھوڑ دو اس سدرہ کی دوستی۔ اس سے پہلے کہ تمہارے پاس سوائے پچھتاووں کے کچھ باقی نہ رہے شزا۔" ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

"ایک ہی تو دوست ہے میری۔ اب اسے بھی چھوڑ دوں۔" وہ مزید بگڑی۔

"ایسی دوست سے اکیلی ہی اچھی ہے تم۔ ارے میں جو یہ اتنی خوب صورت کتابیں لا کر دیتی ہوں تمہیں، ان سے دوستی بنالو۔ زندگی بنا دیں گی تمہاری۔" اماں نے اس کی کمر پر دھپ رسید کی۔

"نہ لایا کریں۔ مجھے نہیں پسند۔ یہ فلسفیانہ باتیں۔ میں تو بس فیشن، بیوٹی والے صفحے دیکھ لیتی ہوں۔" اس نے زور سے ہاتھ جھاڑے اور اس سے پہلے کہ اماں اسے مزید کچھ سخت سناتیں۔ مہران اندر آیا تھا، اس کے ہاتھوں میں کچھ تھیلے تھے۔

"اماں! یہ کچھ چیزیں لایا ہوں آپ لوگوں کے لیے۔ آج ٹیوشن کے پیسے ملے تھے تو میں نے سوچا آپ لوگوں کے لیے بھی کچھ لے لوں۔" شزا نے جلدی سے لفافے جھپٹ لیے۔ مہران مسکرا دیا تھا اس کی جلد بازی پر جب کہ اماں اس پر بس تیکھی نگاہ ڈال کے رہ گئیں۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی متواتر دستک نے اسے جھنجھلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ روٹیاں ڈال رہی تھی اور اب چولہا بند کر کے گیٹ تک جانا اسے سخت مشکل کام لگ رہا تھا۔ بچے سب اسکول گئے ہوئے تھے اور شاید مامی کی آنکھ لگ گئی تھی ورنہ وہ خود ہی جاتی تھیں دروازے پر۔ اس نے چولہا بند کیا اور ہاتھ صاف کر کے گیٹ پر چلی آئی۔

"میڈم! مس ندئی احمد کا گھر یہی ہے؟" سامنے کھڑے شخص نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔

"جی فرمائیے میں ہی ہوں ندئی!" وہ حیران ہو کر بولی۔

"یہ خط ہے آپ کے لیے۔ سر مہران نے دیا تھا۔" اس نے ایک خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ندئی نے لفافہ لے لیا تو وہ فوراً واپس مڑ گیا۔ وہ لفافہ کھولتی اندر چلی آئی، جوں جوں وہ لیٹر

WOMEN SKILLS GROUP

پڑھتی ہوئی اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

"ماں — ماں" وہ چلائی۔

"ماں — کہاں ہو ماں؟" وہ چلاتے ہوئے برآمدے کی طرف بھاگی۔

"ارے کیا ہو گیا ندی! کیوں چلا رہی ہو۔" اس کی چیخیں سن کر ماں آنکھیں ملتی ہانپتی باہر آئیں۔

"ماں! مجھے جاب مل گئی۔ مجھے جاب مل گئی ماں!" وہ انہیں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھمانے لگی۔

"سچ بیٹا ندی! کیا واقعی۔" ماں کے مرجھائے چہرے پر ایک دم ہی بشاشت سے آگئی تھی۔

"ہاں ماں! یہ دیکھو، ابھی لیٹر آیا ہے۔ میری جاب ہو گئی۔" اس نے خوشی خوشی ماں کو وہ خط دکھایا۔ انہوں نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"شکر ہے میرے مولا کا۔ اب کچھ ہم بھی اچھے دن دیکھیں گے۔ رات دن خرچوں کا حساب کرتے کرتے میری تو روح بھی تھکنے لگی تھی اب دماغ کے ساتھ ساتھ۔" ماں کے لہجے سے حقیقی خوشی چھلک رہی تھی۔ ندی ان کا یہ روپ دیکھ کر سرشار سی ہو گئی۔

"اچھا، کب بلایا ہے؟" انہیں اچانک خیال آیا۔

"پرسوں سے۔"

"اچھا پھر میرے ساتھ بازار چلو، ایک دو اچھے سوٹ سلوا لو اور اسکارف بھی نیا لے لو۔ کافی پرانا ہو رہا ہے۔ آگے پھر اللہ اور بھی کرم کرے گا۔" انہوں نے کہا تو مسکراتی ہوئی ندی نے سر ہلا دیا۔

"چلو تم بھی تیار ہو جاؤ، میں ذرا نماز پڑھ لوں پھر بچوں کو کھانا دے کر نکلتے ہیں۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو لے لینا شرمانا نہیں۔"

"جی ماں!" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

وہ خود ندی کو سارا کام سمجھا رہا تھا تاکہ اسے کسی قسم کی کوئی مشکل نہ ہو۔

"سو ایک بات کلیئر کر لیں مس ندی! یہاں پروڈیوسر حضرات کے کافی چکر لگتے رہتے ہیں نئے چہروں کی تلاش میں۔ اگر آپ کسی کی نگاہ میں آتی ہیں یا کوئی کنٹریکٹ سائن کرتی ہیں تو پہلے نہ صرف آپ کو مجھے انفارم کرنا ہوگا بلکہ جاب بھی چھوڑنی ہوگی لیکن مہینہ پورا ہونے کے بعد۔" سارا کام سمجھا کر اس نے ندی سے کہا اور سگریٹ سلگا لیا۔

"سوری سر! میں یہ جاب بھی مجبوری کے تحت کر رہی ہوں۔ اپنے ماموں کی شدید بیماری کی وجہ سے۔" ندی کو اس کے الفاظ ناگوار گزرے تھے۔

"ماموں۔" وہ چونکا۔ "آپ کے ڈیڈی؟"

"ان کی برسوں پہلے ڈیتھ ہو گئی۔" وہ آواز میں در آئی نمی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اوہ، سو سیڈ۔ آئی ایم سوری۔" وہ حقیقتاً شرمندہ ہوا۔

"اٹس او کے۔" ندی کہہ کر فائلز سنبھالنے لگی، تب ہی دروازہ کھلا اور مائرہ خان اندر آئی تھی۔ ان دونوں کو قریب کھڑا دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کے دل میں جلن سی اٹھی تھی۔

"او کے، اب آپ جائیں مس ندی!" مائرہ پر نظر پڑتے ہی مہران کی آنکھوں میں اجنبیت سی اتری تھی۔ وہ سر ہلاتی باہر چلی گئی۔

"خیریت۔ یوں بنا اجازت لیے اس طرح اندر آنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" اس نے غصے سے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے پوچھا۔

"کم آن مہران! اب تمہارے آفس آنے کے لیے اجازت یا کسی وجہ کی ضرورت ہوگی۔" وہ ٹیبل پر انگلیاں بجاتے ہوئے اعتماد سے بولی۔

وہی ازلی اعتماد، دودھیا رنگت پر کھلتی گلابیاں، شولڈر کٹ سنہرے بال، وہ بالکل ویسی کی ویسی تھی۔ ساحرہ — اپنے بس میں کر لینے والی۔ مہران نے دھوئیں میں اس کے چہرے کو جیسے غائب کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تم پہلا بھی چاہو نہیں بدل سکتے مہران علی یقین مانو، میں بھی نہیں بدلی۔ بس ذرا سا نظریں اور ٹھہر گئی تھی۔" اس نے نفاست سے اپنا نرم مرمریں ہاتھ ٹیبل پر دھرے مہران کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے شزا!" اچانک ہی وہ بولا تھا۔ مائرہ نے چونک کے اپنے پیچھے دیکھا تھا۔

"اپنا نام تک تو بھلا چکی ہو تم مائرہ خان! پھر یہ جھوٹی وضع داری کس لیے۔" وہ قہقہہ لگا کے بولا تھا۔ مائرہ خان کا چہرہ احساسِ ذلت سے زرد پڑنے لگا۔

"میں سب کچھ بھلا چکا ہوں مائرہ! سو بھلائی اسی میں ہے کہ تم بھی بھول کر آگے بڑھ جاؤ۔ میرے پیچھے آنے سے سوائے دھول کے اور کچھ ہاتھ نہیں آنے والا۔" وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

"میں کروں تو کیا کروں مہران! میں غلط تھی۔ میں بے اختیار ہی نہ تھی، وہ محبت کہیں اندر ہی ڈیرہ جمائے بیٹھی تھی۔" وہ اٹھ کر اس کے بالکل سامنے آٹھہری تھی۔ اس کی نظری بے باکی سے، وہ ضبط سے ہونٹ چبا گیا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو مہران! پہلی محبت کبھی نہیں مرتی، ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ تم یہ حقیقت تسلیم کیوں نہیں کر لیتے۔ یہ دوریاں، یہ فاصلے مٹا کیوں نہیں دیتے۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ مہران نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھڑا لیا۔

"مجھے کہیں ضروری کام سے نکلنا ہے۔" وہ تیزی سے اٹھا۔

"اچھا میرے اشتہار کا کیا ہوا؟" وہ فوراً اپنے مطلب پر آگئی۔

"ہاں، عدنان سے مل لو، سمجھا دے گا تمہیں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی کرسی پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک واضح تھی۔

☆☆☆

"شزا! میری بات مان لے بیٹا۔ ایسا رشتہ پھر نہیں آنے والا۔ بینک میں ہے لڑکا تنخواہ بھی اچھی ہے اور پھر ایک ساس۔ نہ نندوں کا جھنجھٹ، نہ دیوروں کا۔ اتنا بڑا گھر صرف تُو حکمرانی کرے گی۔ بڑی قسمت والی ہے کہ بیٹھے بٹھائے تجھے ایسا رشتہ مل گیا ورنہ لوگ تو اپنی بیٹیوں کے لیے اچھا بر ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک جاتے ہیں۔"

شزا کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا تھا۔ اماں تو راضی تھیں مگر شزا نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"اماں! میں نے کہہ دیا نہیں تو نہیں۔ بس اب اور کوئی بات نہ کرنا تم۔"

"لو بات کیسے نہ کروں، اگر اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر۔"

"آپ کو ٹینشن کیا ہے؟" وہ تڑپی۔

"مجھے اپنی ٹینشن نہیں ہے، تیری ہی فکر کھاتی رہتی ہے۔" اماں غصے سے بولیں۔ "اگر میں مر گئی نا تو یہ دنیا کچا چبا ڈالے گی تجھے۔"

"چبا جائے، مگر میں شادی کروں گی تو کسی امیر زادے سے، بزنس مین سے جس کے اپنے نوکر ہوں۔ مجھے ہزاروں روپے والا نہیں، لاکھوں کمانے والا چاہیے۔" وہ چیخی تھی۔ اماں تو جیسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی تھیں۔ کتنی خودسر ہو گئی تھی ان کی شزا، یہ انہیں آج پتا چلا تھا۔ وہ تیزی سے اوپر جانے لگی۔

"اب اُدھر کہاں جا رہی ہو؟" اسے اوپر جاتے دیکھ کر وہ چونکیں۔

"کام ہے لینڈ لارڈ سے۔ ڈرو نہیں، کھا نہیں جاؤں گی ان کے تمہارے چہیتے بھتیجے کو۔" وہ چڑ کر بولی تھی اور اوپر غائب ہو گئی۔ اماں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

شزا اوپر آئی تو مہران شاید اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور شزا کو دیکھتے ہی وہی دلکش مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔

WOMEN SKILLS GROUP

''وہ مجھے تم سے ایک ضروری کام تھا۔'' وہ انگلیاں مسلتے ہوئے بولی۔

''ہاں بولو۔''

''مجھے کچھ پیسے چاہئیں، کالج میں سب فرینڈز......''

''کتنے۔'' مہران نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔ اس نے مطلوبہ رقم بتائی تو مہران نے فوراً پیسے نکال کر اس کے سامنے دھر دیے۔ وہ مڑنے لگی۔

''سنو۔'' شزا نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''چائے پیو گی۔'' اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''تم باہر بیٹھو، میں لاتا ہوں۔''

اور ٹھیک دس منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھامے کپوں میں سے ایک شزا کو تھما دیا۔

''ایک بات پوچھوں لینڈ لارڈ۔'' اچانک ہی شزا نے اس سے کہا تھا۔

''ہاں، پوچھو۔'' وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

''تم مجھے پسند کرنے لگے ہو نا۔'' مہران کو اچھو لگ گیا۔ شزا ہنسنے لگی، کھنکتی ہنسی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

''بولو نا۔''

''تمہیں ـــ تمہیں کیسے پتا؟'' وہ حیران تھا۔

''لڑکیاں اس معاملے میں ایک حس زیادہ رکھتی ہیں لڑکوں سے۔ تمہاری آنکھوں سے چھلکتے یہ رنگ، تم بھلے نہ دیکھ پاؤ مگر مجھے بے حد واضح نظر آتے ہیں۔'' اس نے بڑی بے باکی سے مہران کی ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ مہران کو اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگی، جب ہی اس نے نگاہیں پھیر لیں۔

''خیر، میرا فی الحال تم سے عشق وشق لڑانے کا کوئی ارادہ نہیں، بلکہ میں تو کہوں گی اگر کبھی دل نے تمہاری سفارش کر دی تو اور بات ورنہ میرے خواب بہت اونچے ہیں۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ میرے پیچھے مت آنا کیونکہ میں تمہیں بے حد پیچھے چھوڑ دوں گی۔ میری منزل تم سے بہت آگے ہے۔'' اس نے ایک ادا سے اپنے سنہرے بال جھٹکے۔ مہران نے ایک گہری نگاہ اس کے وجود پر ڈالی۔

''تمہارے برابر آنے کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا تو کروں گا۔'' مہران اٹل لہجے میں بولا۔ شزا کے اندر سرشاری سی بھر گئی، مہران کی یہ دیوانگی دیکھ کر۔

''بے شک، میں تمہارا انتظار کروں نہ کروں، یہ میری مرضی ہے۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔'' اس کی ہر ادا میں غرور تھا۔

☆☆☆

''مہران صاحب! آپ کی کمپنی نے تو چند ماہ کے اندر ہی کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ بہت مثبت سوچ کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک کے بڑے بڑے برانڈز بلکہ آج کل تو انٹرنیشنل برانڈز کے بھی کئی اشتہارات دیکھے ہیں میں نے آپ کے۔'' ادھیڑ عمر شخص شاید کچھ زیادہ ہی باتونی تھا۔

''سردار صاحب! کام کی بات کریں۔ مجھے کچھ ضروری کام بھی نپٹانے ہیں۔'' مہران سیدھا ہوا۔ اس نے دنیا کے لوگوں کو اب ان کی آنکھوں سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

''بس صاحب! وہی پرانا کام ہے۔ پتا تو ہے کہ فیشن شو کرانا ہیں۔ ایک نیا برانڈ ہے ان کی خواہش ہے کہ ماڈل کے ساتھ باقی سب نئے چہرے متعارف ہوں ان کے شو میں تاکہ لوگوں کی دلچسپی مزید......''

''پلیز، میں نے کہا نا کہ کام کی بات کریں۔'' وہ بے زار ہوا۔

''یہ دو تین نئی ماڈلز ہیں آپ کے ہی بنائے ہوئے اشتہار کی۔ تو ان کا رابطہ نمبر چاہیے تھا بس۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بتانے لگے۔ مہران نے ان کا تصویریں لیے بڑھا ہوا ہاتھ واپس کر دیا۔ اس نے ان تصویروں پر ایک نگاہ غلط بھی ڈالنا پسند نہیں کیا۔

''عدنان سے مل لیں، اس کے پاس فیڈ ہوتا ہے۔'' اس نے جیسے ان کو باہر کا رستہ دکھایا۔ وہ بھی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بنے ہو لیکن تیز ہو۔ ہم سے ہٹا کر رکھو گے تو فائدے میں رہو گے۔'' انہیں شاید اپنی یہ بے عزتی پسند نا آئی تھی۔

''پروڈیوسر بے چارے کی کیا ویلیو سردار صاحب۔'' مہران نے طنزیہ مسکراہٹ اچھالتے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

''ایک فلم فلاپ ہو جائے یا ایک شو ٹھیک نہ ہو تو دیوالیہ نکل جاتا ہے آپ لوگوں کا۔ رہنے دیں یہ فائدے، ابھی تو ہماری طرف سے جو فائدہ مل رہا ہے وصول کریں۔'' اس نے کہا تو سردار مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔

اسی وقت دستک دے کے ندئی اندر آئی۔ سردار توقیر سکندر کی نگاہ تیزی سے اسے جانچنے لگی۔

''اصل ہیرا تو آپ نے اپنے پاس چھپا رکھا ہے۔'' ان کی تو جیسے آنکھیں ابلنے کو تھیں۔ مہران غصے سے کھڑا ہو گیا۔

''اسٹینڈ اپ۔''

''واٹ۔'' انہیں شاید یقین نہیں تھا کہ مہران ان سے اس طرح بھی بات کر سکتا ہے۔

''ناؤ، گیٹ لاسٹ۔'' اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے مسٹر مہران علی نقوی۔''

''جسٹ لیو ناؤ۔'' اس نے کہا تو وہ غصے سے باہر نکل گئے۔ ندئی کی آنکھوں سے مارے خوف کے آنسو چھلک پڑے، وہ فوراً اس کے پاس آیا۔

''آئی ایم سوری ندئی! پلیز ریلیکس۔'' اس نے میز پر پڑا پانی کا گلاس ندئی کو تھماتے ہوئے کہا۔ ندئی جلدی سے پانی پی گئی۔

''اینڈ بی کیئر فل اگین۔ مہمانوں کے سامنے اس وقت تک نہ آیا کریں، جب تک میں نہ بلاؤں، اوکے۔'' نرم سا لہجہ ندئی کو پھر سے اعتماد بخش گیا۔ وہ اعتماد سے اثبات میں سر ہلا گئی۔

☆☆☆

وہ ٹیوشن پڑھا کر گھر آیا تو گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ اس نے سوچا شاید پھوپھو سو رہی ہوں اور شزا کہیں گئی ہوئی ہو۔ سو وہ سیدھا اوپر چلا گیا۔ دفعتاً وہ چونکا، اوپر بالکل آخری سیڑھی پر شزا منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ کافی دیر تک روتی رہی ہے۔ وہ اس کے برابر وہیں بیٹھ گیا۔

''کمال ہے اتنی بارش کے باوجود بھی گرمی جوں کی توں ہے۔ ذرا برابر بھی کمی نہیں آئی۔'' مہران نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ شزا نے ایک خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ رخ پھیر گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میری دوست کی برتھ ڈے پارٹی ہے اور اماں نے مجھے اس بار صاف منع کر دیا ہے کہ کوئی چیز نہیں لے کر دیں گی۔'' وہ چھوٹی سی ناک مزید رگڑتے ہوئے بولی۔

''اور تم یہاں رونے بیٹھ گئیں اس بات کا سوگ منانے کے لیے۔'' وہ مسکرایا۔

''تو اور کیا کروں۔ اونچی آواز میں گانے لگا کے جشن مناؤں کہ میرے پاس ایک چھوٹی سی برتھ ڈے پارٹی پر جانے کے لیے کوئی اچھا سوٹ، کوئی اچھی جیولری، کچھ بھی نہیں ہے۔''

''وقت سب کچھ جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ صرف اللہ پر بھروسا کرنا سیکھو۔'' اس کے آنسو جیسے مہران کے دل پر گر رہے تھے۔

''اچھا؟ یہ قناعت کے درس آج کی تاریخ میں تو مت ہی کھولنا ورنہ......'' اس کی سرخ آنکھوں میں ایک دم سے غصے کی لہر اٹھی تھی۔

''ورنہ؟'' وہ شریر ہوا۔

''ورنہ سارا غصہ تم پر نکال دوں گی۔ اماں کا بھی

WOMEN SKILLS GROUP

اور اپنی حسرتوں کا بھی۔" "نہ بابا! اس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔ اچھا تم ایک منٹ انتظار کرو، میں ابھی آیا۔" وہ اٹھ کر اوپر چلا گیا۔ شہزا وہیں بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چند ہرے نوٹ تھے۔

"یہ رکھ لو۔ اماں کے ساتھ جا کر کچھ لے لینا۔" اس نے پیسے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جو شہزا نے فوراً جھپٹ لیے۔

"لیکن اماں کے ساتھ کیوں، وہ تو سینکڑوں سوال کریں گی۔ میں کل کالج سے جلدی نکل کے دوست کے ساتھ جا کر لے لوں گی۔"

"لیکن یہ بات تو غلط ہے۔ میں تمہیں اماں سے چھپ کر تو نہیں دے رہا۔ آج نہیں تو کل انہیں پتا چل ہی جائے گا۔" وہ شاید حیران تھا۔

"بس تم مت بتانا، آگے میرا کام ہے۔"

"لیکن؟"

"یہ لو اپنے پیسے، بس۔" اس نے مہران کا ہاتھ پکڑ کے روپے واپس اس کی ہتھیلی پر دھر دیے۔

"اچھا یار! ایک تو غصہ تمہاری ناک پر رکھا رہتا ہے۔" مہران نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" وہ مسکرائی۔ مہران کو لگا جیسے ایک دم سے بہاری چھا گئی ہو ہر سو۔

"وہ کس لیے؟" اس نے پوچھا۔

"تم ہمیشہ میری مدد کر دیتے ہو ناں۔ اس لیے۔" پھر سے وہی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ جیسے سارا رونا دھونا بھلا چکی تھی۔

"سو واٹ؟ تم جانتی ہو تم میرے لیے کیا ہو۔" خوب صورت کالی آنکھوں میں کتنے ہی جذبے بکھرے تھے۔ شہزا مسکرا دی۔

"کیا ہوں؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"میری زندگی، میری مسکراہٹ کی وجہ۔ جب سے تم سے ملا ہوں تو سو سال لمبی زندگی مانگنے لگا ہوں۔" وہ شریر ہوا۔

"اچھا اچھا بس۔ اب مجھے زیادہ الجھاؤ مت۔ ابھی مجھے چیزوں کی لسٹ بھی بنانی ہے۔" وہ تیزی سے کہہ کر نیچے بھاگ گئی۔ مہران کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ مچل اٹھی۔

☆☆☆

"جو تم سوچ رہی ہو، وہ مر کر بھی ممکن نہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارا تعلق سید گھرانے سے ہے۔" اماں مارے غصے کے کانپنے لگی تھیں، مگر وہاں پروا ہی کسے تھی۔

"یہ بالکل پرانی ہو گئیں اماں! اب تو ہر نسل، ہر گھرانے کی لڑکیاں اس فیلڈ میں ہیں اور ان کے گھر والے ان پر فخر کرتے ہیں۔" وہ لاپروائی سے اپنے ناخن تراشتے ہوئے بولی۔

"ہوتی ہوں گی، مجھے ان سے کوئی لینا دینا نہیں۔ میری بیٹی صرف تم ہو اور تمہارے لیے فیصلہ کرنا صرف اور صرف میرا حق ہے۔"

"سوری اماں! اب میں بچی نہیں رہی۔ میں اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو شہزا! لیکن جب میں نے نہ کہہ دیا تو۔ اس بار تمہاری کوئی ضد نہیں چلنے والی۔" اماں کو مزید غصہ آیا۔

"تو کون روکے گا مجھے ہاں۔ میں بھی کل آڈیشن دینے جاؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور اس بار میں بھی آپ کی ایک نہیں سنوں گی۔" وہ غصے سے پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اماں اسے آوازیں دیتی رہیں مگر وہ ان سنی کرتی اوپر کے پورشن میں چلی آئی۔ جہاں صحن میں ہی چارپائی پر مہران حسب معمول مطالعے میں مصروف تھا۔

"مہران مجھے دو تین ہزار روپوں کی ضرورت ہے، دے سکتے ہو۔" اس کی بات پر مہران نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ شہزا پہلی بار خود اتنے پیسے مانگ رہی تھی۔ اسے کچھ غلط محسوس ہوا۔

"کیا بات ہے شہزا! سب ٹھیک تو ہے ناں۔"

"اس دن میں برتھ ڈے پارٹی پر گئی تھی ناں۔ تو وہاں سدرہ کے جاننے والے کئی بڑے بڑے پروڈیوسر اور شوز منیجر آئے ہوئے تھے۔ کئی لڑکیوں کو وہیں کھڑے کھڑے آفرز ملیں اور انہوں نے وہیں قبول بھی کر لیں۔ مجھے بھی انہوں نے آڈیشن کے لیے بلایا ہے اور اماں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سید زادی ہونے کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔" وہ کہتی گئی اور مہران اس کی نئی فرمائش سن کر ششدر رہ گیا۔

"اب تم بتاؤ مہران! قسمت کی دیوی خود میرے دروازے پر دستک دینے چلی آئی ہے اور میں یہ چانس مس کر دوں۔ زندگی بہت کم لوگوں پر مہربان ہوتی ہے، اس معاملے میں، اماں کی بات ہرگز ہرگز نہیں مان سکتی۔"

"پھوپھو ٹھیک کہتی ہیں شہزا! تم وہاں مت جاؤ۔" بہت دیر بعد جب وہ بولا تو اس کی آواز بہت کمزور تھی۔

"واٹ، آر یو میڈ؟" اسے شہزا سے اسی جواب کی توقع تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں شہزا! وہاں کی ظاہری چمک دمک پر نہ جاؤ شہزا! باہر سے کتنی ہی روشن سہی اندر سے کسی پاتال کی طرح گہری اور دلدل کی طرح ہے۔ ایک دفعہ اس میں قدم دھنسے تو پھر کبھی باہر نہ آ سکو گی۔" اس کا لہجہ کمزور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شہزا جو ٹھان لے وہ کر کے رہتی ہے۔

"دلدل......" وہ اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"جنت کہو جنت۔ میری ساری خواہشات، میرے سارے خواب چٹکیوں میں پورے ہوں گے۔ میں پیسوں میں کھیلوں گی۔"

"صرف پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا شہزا۔" وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اپنی پہلی محبت کو پانے سے پہلے کھو دینے کے خوف سے۔

"میرے لیے تو یہی سب سے بڑی چیز ہے۔" کتنی رکھائی تھی اس کے لہجے میں۔

"میں پوری کروں گا تمہاری ہر خواہش۔ ہر ایک پر۔" اس نے سچے دل سے عہد کیا مگر شہزا اس کی بات سن کر ہی زور سے ہنس دی تھی۔ مہران ابھی لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم اپنی ضروریات اپنے باپ یا پھر خود ٹیوشن پڑھا کے پوری کرتے ہو، تو میرے خواب کیا پورے کرو گے۔

ارے ہاں یاد آیا۔ وہ تمہارے بابا جان، شاہ صاحب کے دربار کے متولی ہیں ناں، تو ان کے قبضے میں کہیں کوئی جن یا پری تو نہیں کہ میری خواہشات آنکھیں بند کرتے ہی پوری کر دیں گے، ہا ـــــ ہا ہا...... اٹس رئیلی فنی مہران۔" وہ ہنستی چلی گئی۔ مہران ضبط سے مٹھیاں بھینچ گیا۔

"خیر میں جو چاہتی ہوں، کرتی ہوں۔ سو پلیز اگر پیسے دینے ہوں تو صبح مجھے دے دینا، ورنہ مجھے یہ درس پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں، کلیئر؟" تلخی سے کہتی وہ تیزی سے نیچے بھاگ گئی۔

وہ اندر ہی اندر شہزا کے اس قدر تلخ اور اجنبی برتاؤ پر بکھرتا رہا۔ تب ہی اس کے سیل پر بیل ہوئی اور جو خبر اسے ملی، وہ اس سب سے کہیں زیادہ بھیانک تھی، جو ابھی کچھ دیر پہلے اس پر بیتا تھا۔ اس کے بابا کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سردار توقیر کے واقعے کے بعد مہران کو توقع تھی کہ ندی شاید پھر اس کا سامنا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے۔ ان چند دنوں میں وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق آج اسے چھٹی کیے دوسرا دن تھا۔ اسے کسی بھی حال میں ندی سے ملنا تھا اس سے پہلے کہ وہ استعفیٰ بھیج دیتی۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ عدنان سے اس کا پتا لیا۔ آج اسے کچھ ضروری اشتہار کی ویڈیوز کلیئر کرنا تھیں لیکن اس نے سب سے پہلے ندی کے گھر جانے کا مصمم ارادہ باندھ لیا تھا۔

☆☆☆

"ندی! خیریت تو ہے نا۔ تم تو ایسے آرام سے

WOMEN SKILLS GROUP

گھر بیٹھی ہو، جیسے نوکری نہ لگی ہو کسی شہزادے نے تمہیں چن لیا ہو۔ نئی نئی نوکری میں بھی بھلا ایسے ایک ساتھ تین تین چھٹیاں ملتی ہیں۔" مامی کو اس کی چھٹی کھٹک رہی تھی اور وہ جو پہلے ہی اندر ہی اندر پریشان تھی مزید ڈل گئی۔

"وہ مامی! آفس والے کچھ دنوں کے لیے ٹور پر جا رہے تھے۔ میں نے صاف انکار کر دیا، آئیں گے تو مجھے بلا لیں گے۔" اس نے بڑی مشکل سے بہانہ تراشا۔

"نوکری نہیں چھوڑنا لڑکی۔ مجھ سے اب نہیں اٹھائے جاتے تمہارے مفت کے خرچے۔ ارے ماما تو پڑ گیا چارپائی پر اور بھانجی سوار کر دی میرے سر پر۔" مامی کا وہی پرانا سرد انداز اسے اندر تک دکھی کر گیا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

"میں مہران علی نقوی! ندئی کے آفس سے۔" مامی نے دروازہ کھولا تو مہران نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔

"ارے بیٹا! آؤ آؤ، تم کام کرتے ہو آفس میں ندئی کے ساتھ؟" مامی نے گلی میں کھڑی چمچماتی کار پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں، اصل میں، میں ہی وہ کمپنی چلاتا ہوں۔" اس نے سچ بتایا۔

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔" مامی نے تو فوراً بلائیں لے لیں۔

"آؤ بیٹا! اندر تو آؤ۔" وہ بولیں تو مہران ان کے ہمراہ اندر چلا آیا۔

"تم یہاں بیٹھو، میں ابھی آئی۔" مامی نے صحن میں پڑی کرسی دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا اور تیزی سے اندر چلی گئیں۔ تب ہی مہران کی نگاہ سامنے گئی اور جیسے پلٹنا بھول گئی تھی۔

وہ ندئی تھی۔ دھلا دھلا، نکھرا نکھرا، پاکیزہ سا روپ۔ اس کے دل میں روشنی سی بھر گیا۔ وہ شاید نہا کر نکلی تھی۔ لمبے گھنے سیاہ بالوں سے شبنم ٹپک رہی تھی۔ ندئی بے خیالی میں گنگناتی گیلا تولیہ تار پر ڈالنے لگی۔ مہران نے نظریں پھیر لیں۔

تب ہی ندئی نے لمبے بالوں کو زور سے جھٹکا تھا اور اسی وقت اس کی نظر سامنے بیٹھے مہران پر پڑی۔ اس کا چہرہ دوسری جانب تھا مگر پھر بھی وہ اسے فوراً پہچان گئی تھی۔ اس نے تیزی سے تار پر پھیلی بڑی سی چادر کھینچ کر خود کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

"آپ کیسے...... سر! آپ یہاں۔" اس نے حیرت سے کہتے ہوئے مامی کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں جو نہ جانے کہاں غائب تھیں۔

"کیوں مس ندئی! میرے یہاں آنے پر کوئی پابندی ہے کیا؟ اگر آپ کو میرا یہاں آنا برا لگا تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔" وہ کہہ کر اٹھنے لگا۔

"سر پلیز! بیٹھیں آپ۔" ندئی فوراً بولی تو وہ سے بیٹھ گیا۔

"آپ...... میرا مطلب ہے...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مس ندئی! آپ مجھ سے خوف زدہ ہیں کیا؟" مہران کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

"نو سر! وہ اصل میں...... اچھا ایک منٹ۔ میں ابھی آتی ہوں۔" وہ تیزی سے کہہ کر برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ کچن سے نکلتی مامی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھیں۔

"کیا ہے ندئی! آرام سے۔" انہوں نے بڑی مشکل سے ٹرے سنبھالی۔

"مامی! بھلا ایسے بھی کوئی کسی کو اندر لے آتا ہے۔ مجھے تو بتا دیتیں۔ بندہ سنبھل ہی لیتا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ ان کا رخ دوسری طرف تھا۔" وہ مدہم آواز میں بولی۔

"ارے لو، اب اتنا بڑا آدمی کیا ہمارے دروازے پر کھڑا رہتا۔ پگلی! اچھا جلدی سے حلیہ ٹھیک کر کے باہر آ۔ میں اتنے تک یہ چائے پانی دے آؤں انہیں۔" مامی اسے ہدایت دیتی باہر چلی گئیں۔

"ندئی نے بتایا کہ تم لوگ کہیں ٹور پر گئے ہو۔" مامی کی بات سن کر مہران ندئی کو دیکھنے لگا۔

"ہاں بس، آج ہی ہم ٹور سے واپس آئے تو میں نے سوچا کہ ندئی کو بھی خود جا کر بتا آؤں۔" اس نے بات سنبھالی تو ندئی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

"اچھا، تم لوگ باتیں کرو، میں ذرا کچن دیکھ لوں۔"

مامی سر ہلاتی کچن کی طرف چل دیں۔

"میں تو آپ کو بہت بہادر سمجھتا تھا مس ندئی!"

"آپ بہادری کسے کہتے ہیں سر؟" اس نے گھنی پلکیں اٹھائیں۔

"دنیا کو فیس کرنا، ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا۔" وہ بولا۔

"بہادری اور بے حیائی میں بہت واضح فرق ہوتا ہے۔ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا، وقت پر بہترین فیصلہ کرنا جس سے آپ کو شاید کئی گنا نقصان بھی ہو یہ بہادری ہے سر۔ مگر جب بات عزت پر آ جائے تو بہادری تب ہی ہے، جب آپ اپنا دفاع کریں، خود کو محفوظ کر لیں۔ صرف ہاتھوں سے نہیں بلکہ ہوس پرست لوگوں کی آنکھوں سے بھی۔ ڈھیٹ بن کر ان کی نظریں برداشت کرنا بہادری نہیں، میرے نزدیک ڈھٹائی اور بے حیائی ہے۔" اس نے دوٹوک جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ......" مہران کا دل دھڑکا نہ جانے کیوں۔

"نہیں سر! میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتی۔ اسی لیے میں مستعفی ہونے کا سوچ رہی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں اعتماد تھا۔

"لیکن آپ کے مالی حالات، بقول آپ کے آپ کی فیملی کو اس وقت فنانشل سپورٹ کی کتنی ضرورت ہے۔" وہ اسے جیسے منانے لگا۔

"میں کہیں اور ٹرائی کر لوں گی سر! اور ویسے بھی ...... پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ پہلے بھی گزارا ہو رہا تھا، آگے بھی اللہ کرم کرے گا۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

"مس ندئی! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں پلیز یہ فیصلہ واپس لے لیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں، آپ کو آئندہ ایسی کسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا مگر پلیز ابھی اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مشکل میں نہ ڈالیں۔ ہاں جب کوئی اور اچھی جاب مل جائے تو بے شک آپ یہ فیصلہ کر لیجیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" ندئی کو مہران کے لہجے میں عجیب سی بے بسی محسوس ہوئی۔ وہ چاہ کر بھی اس کو انکار نہ کر پائی۔

واپسی پر نہ جانے کتنے برس بعد وہ گنگنایا تھا۔ دل پر کوئی دستک سی ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ بہاروں کے سندیسے لاتی دستک۔

☆☆☆

"تو مس مائرہ! یہی نام بتایا تھا ناں آپ نے۔" سگریٹ سلگاتے اس بڑی سی توند والے ادھیڑ عمر شخص نے کرسی سے اٹھ کر اسے سرتاپا جانچتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ دل ربا انداز سے مسکرا دی تھی۔ سامنے کھڑے اس شخص کی خمار آلود آنکھوں میں وہ اپنے لیے پسندیدگی بخوبی دیکھ سکتی تھی، مگر اس کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بہت پراعتماد تھی۔

"میرا نام تو شزا ہے، لیکن میں چاہتی ہوں کہ ماڈلنگ کی دنیا میں مائرہ کے نام سے جانی جاؤں۔ مجھے یہ نام بہت پسند ہے، اس لیے۔" اس نے اپنے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک ادا سے جواب دیا۔

"حکم کریں سرکار! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" وہ میز کے کنارے پر آ ٹکا۔ اس کا سخت ہاتھ میز پر رکھے شزا کے نرم مرمریں ہاتھ پر آ ٹھہرا۔ شزا اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہی آپ کے فائدے میں ہوگا مسٹر

WOMEN SKILLS GROUP

ہینڈسم!" اس نے مسکراتے ہوئے اس آدمی کی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا تو اس آدمی کی باچھیں کھل گئیں۔

"تو پھر کیوں نہ آج کی شام ہمارے نام ہوجائے۔" اس نے خباثت سے کہا۔

"نہیں، میرے خیال میں پہلے کنٹریکٹ سائن ہوجائے۔" وہ سامنے کھڑے شخص سے بھی کہیں زیادہ تیز تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم ناگواری سی اتری۔ مگر اس نے شزا پر ظاہر ہونے دیا تھا۔

"کہا نا ڈارلنگ! جیسے آپ کا حکم۔ میرے پاس فی الحال جتنے بھی شوز رجسٹرڈ ہیں۔ سب میں تمہیں ریڈ نیو ٹیلنٹ کے طور پر متعارف کروانا اب میرا کام ہے۔" کہتے ہوئے وہ ہنسا تھا۔

"مگر شام صرف دستخط کے بعد۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔ اس موٹے شخص نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شزا بے خبری میں نہیں جان بوجھ کر دلدل میں گرتی چلی گئی۔

☆☆☆

"وہ لوگ تو یہ گھر بیچ کر چلے گئے ہیں۔" وہ بابا کی وفات کے تین ہفتوں بعد شہر لوٹا تھا اور یہاں آ کر اسے ایک نئی مشکل کا سامنا تھا۔ اس کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی، وہ چاہتا تو اب کسی ہاسٹل میں بھی رہ سکتا تھا۔ مگر اس گھر میں صرف رہائش تو اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ شزا زیدی تھی اس کی پہلی محبت۔ جسے دیکھ کر اسے اللہ سے کچھ مانگنے کا سلیقہ آیا تھا۔ بالکل ویران زندگی میں جو بہاروں کا پہلا جھونکا ثابت ہوئی تھی وہ شزا۔

"کیا آپ کو کچھ پتا ہے ان کے نئے ٹھکانے کا۔" وہ پریشان ہو کر بولا۔

"نہیں۔ ہم تو ان کو جانتے بھی نہیں۔ بس انہیں ذرا جلدی تھی تو جلدی میں ہی سودا ہوگیا۔" اس آدمی نے جواب دے کر دروازہ بند کردیا۔

وہ کراچی صرف شزا کے لیے واپس آیا تھا۔ جب وہ ہی نہ ملی تو وہ یہاں رہ کر کیا کرے۔ وہ سوچتا رہا اور بالآخر اس نے واپسی کی بس پکڑ لی تھی۔

بس دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف رواں تھی، مگر مہران کو لگا اس کی منزل کہیں کھو گئی تھی کبھی نہ ملنے کے لیے۔ تب ہی اس کی نگاہ ساتھ بیٹھے آدمی کے ہاتھ میں کھلے اخبار پر پڑی۔ وہ چونک گیا۔

"شزا" بے دھیانی میں اس کے منہ سے نکلا۔

"نئی ماڈل نے اپنے پہلے شو میں ہی اس نے قیامت برپا کردی۔ شوبز کی دنیا میں تہلکہ مچا ہوا ہے اس کی خوب صورتی سے۔" وہ اس وقت تکتا شزا کی بڑی بڑی تصویروں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مہران غصے سے لب کچلنے لگا۔ وہ واقعی اپنی منزل کھو چکا تھا۔

☆☆☆

"مس ندئی! یہ استعفیٰ کیوں۔"

"میں آپ کی بے حد ممنون ہوں سر! مگر رئیلی میں بے حد مجبور ہو کر یہ جاب چھوڑ رہی ہوں۔" ندئی شرمندگی سے بولی۔

"جاب کرنا بھی آپ کی مجبوری، چھوڑنا بھی آپ کی مجبوری۔" وہ پریشان لگ رہا تھا۔ ندئی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"جاب کرنا اب بھی میری مجبوری ہے۔" وہ زیادہ دیر تک ان آنکھوں میں نہ جھانک سکی۔ تب ہی پلکیں گراتے ہوئے بولی۔

"تو پھر؟"

"میں یہ بات آپ کو نہیں بتا سکتی سر!" اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"مس ندئی! شیئر کرنے سے مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔" وہ اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"سر اصل میں ہماری گلی سے مین روڈ کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اور مین روڈ تک پیدل آنا پڑتا ہے۔ اور اس فاصلے کے دوران مجھے روزانہ کئی خوفناک اور تیز نظروں کا سامنا رہتا ہے۔ دل ہولا رہتا ہے میرا۔ سر! مجھے لگتا ہے چار دیواری ہی میری بہترین پناہ گاہ ہے۔ مجبوری پر عزت کو تو داؤ پر نہیں لگایا جاسکتا۔

اور مجھے میری عزت بہت عزیز ہے۔ دنیا کی ہر مجبوری اور ہر دولت سے بڑھ کر۔" عزم سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پیسہ ہی سب کچھ ہے مہران علی نقوی۔ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔" مہران کے کانوں میں کسی کی آواز گونجی۔

"یاد رکھنا مہران۔ اوپر والا ہمارے حق میں جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ بہتر نہیں بلکہ بہترین ہوتا ہے۔ تمہیں وہ نہیں ملی کیونکہ وہ تمہارے قابل ہی نہ تھی۔ اچھے لوگوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں اچھائی ہی ملے گی۔ اچھے مردوں کے لیے اچھی عورتیں اور اچھی عورتوں کے لیے پاک مرد۔ کبھی مایوس نہ ہونا مہران۔ تم نے جو منتخب کیا وہ صرف اور صرف غلط تھا۔ جو تمہارے لیے اللہ منتخب کرے گا وہ جلد تمہارے سامنے ہوگا۔ اور وہی تمہارے لیے بہترین ہوگا۔" اسے چاچا کے الفاظ یاد آئے۔ تب ہی وہ چونکا۔ ندئی باہر جارہی تھی۔

"مس ندئی۔" اس نے آواز دی۔ ندئی حیرت سے مڑی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا مائرہ خان اندر آگئی۔ مہران کو اس کا اس وقت آنا زہر لگا تھا۔ مگر وہ اسے نظر انداز کرتا ندئی سے بولا۔

"کل سے آپ کو آفس سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت میسر ہوگی۔ تو مور کو چین۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔ ندئی خاموشی سے سر ہلاتی باہر چلی گئی۔

"بہت مہربان ہو اس لڑکی پر۔" مائرہ کی آنکھوں میں جلن واضح تھی۔ مہران کو سکون سا ملا، اس نے مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگالی۔

"کیوں؟" اس نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں، صرف یہ پوچھنا تھا کہ کیا ویسے ہی جیسے تم کبھی مجھ پر مہربان تھے۔" مائرہ کی آواز میں طنز اترا۔

"بالکل ویسے ہی لیکن وہ مجھ پر ویسے مہربان نہیں جیسے تم مجھ پر مہربان تھیں۔" مہران نے گویا تازیانہ مارا تھا اسے۔ اس کا گلابی چہرہ ایک لمحے کے لیے زرد پڑ گیا۔

"تم مجھے معاف نہیں کرسکتے۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

"معافی سے تمہارا کیا مطلب ہے مس مائرہ خان۔" اس نے لفظ مطلب پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے عقل آگئی ہے مہران۔ میں واقعی غلط تھی۔ تھک گئی ہوں میں اس دوغلی دنیا کے پیچھے بھاگ بھاگ کر۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔" مائرہ نے نرمی سے اپنا ہاتھ مہران کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ جو اس نے فوراً کھینچ لیا۔ مائرہ کو بے عزتی سی محسوس ہوئی۔

"سمجھ میں آگئی یا پتا چل گیا کہ اب میں تمہاری خواہشات پوری کرنے کے قابل ہوگیا ہوں۔" مائرہ کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔ مہران اپنے درست اندازے پر مسکرا دیا تھا۔

"اس الو کو کب کی عقل آگئی مائرہ۔ اب تم کوئی اور الو ڈھونڈو۔" اس نے گہرا کش لیا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ مائرہ مارے غصے کے کانپنے لگی تھی۔ مہران علی نقوی نے اس کا سارا غرور مٹی میں ملا دیا تھا۔

☆☆☆

اس دن کراچی سے واپس گاؤں آ کر وہ خوب رویا تھا۔ اس کے دور کے ایک چاچا نے اسے سنبھالا۔ اسے سمجھایا۔

"میں اس کے لیے کچھ بھی کرتا چاچا۔ بس اس نے میرا انتظار تو کیا ہوتا۔ اس طرح سرعام نیلام ہوتے ہوئے اس نے ایک پل کے لیے میری محبت، اپنے خاندان کی عزت کا نہیں سوچا، کیوں چاچا، کیوں؟" وہ بے حد تڑپا تھا اس روز۔

"یہی تو ناشکری ہے بیٹا۔ حرص و لالچ میں انسان اور کسی کا نہیں صرف اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ نہیں۔ بلکہ خود اپنے ساتھ برا کیا ہے بچے۔" وہ حیران سا انہیں دیکھے گیا۔

WOMEN SKILLS GROUP

"پادر کھنا مہران۔ اوپر والا ہمارے حق میں جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ بہتر نہیں بلکہ بہترین ہوتا ہے۔" انہوں نے اسے آرام سے سمجھایا تھا۔ اور وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے انہیں لگیں ایک عجیب سی لگن لگ گئی اسے۔ اس نے دربار چاچا کے حوالے کیا اور اپنا آبائی گھر اور زمینیں بیچ کر کراچی چلا آیا۔ اس کی زندگی کا مقصد اب صرف اور صرف اتنی دولت جمع کرنا تھا کہ ایک بار شزا خود چل کر اس کے پاس آئے۔ اس نے ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا اور ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرنے لگا اور چھ ماہ کے اندر ہی وہ اس کے تمام امور سے بخوبی واقف ہو گیا۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے اپنے چند قابل اعتماد دوستوں کے ساتھ اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی کھول لی۔ اشتہارات کی دنیا میں اس کی کمپنی کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس کامیابی کا سہرا اس کے اسسٹنٹ عدنان کو بھی جاتا تھا۔

مہران ہر بار اپنی کمپنی کے تحت بننے والے اشتہار کے لیے نئی ماڈلز کا انتخاب کرتا اور اس چہرے کو ڈھونڈتا رہتا۔ جو اس کے دل میں محبت کی کرچیاں بکھیر گیا تھا۔

اور اب جب وہ ملی تھی تو جیسے دل کو اس کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ مہران علی نقوی کے دل میں محبت کا وہ درخت جس کی جڑیں شزا نے خود اپنے ہاتھوں سے کاٹی تھیں۔ بالکل ہی سوکھ چکا تھا اور اس کی جگہ ندئی کی معصوم محبت کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔

☆☆☆

"کیا ہوا مس ندئی۔ اینی پرابلم۔" وہ آفس سے گھر جانے کے لیے نکلا تو سڑک کنارے کھڑی ندئی کو دیکھ کے چونک گیا اور اس کی طرف چلا آیا۔

"سر وہ آفس کی گاڑی خراب ہے۔ سو سب ہی آج خود بندوبست کر رہے ہیں اس لیے میں بھی۔" ندئی نے ادب سے جواب دیا۔

"اوہ آئی سی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔" اس نے فوراً آفر کی۔

"ارے نہیں سر میں چلی جاؤں گی آپ کو خوامخواہ تکلیف ہو گی۔" ندئی ہچکچائی۔

"تکلیف کیسی۔ اور پھر میں نے ویسے بھی راستہ دیکھا ہوا ہے سو پلیز آئیں میرے ساتھ۔" وہ کہتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"اور کوئی پرابلم تو نہیں ہے نا آفس میں۔" اس نے گاڑی مین روڈ پر لاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر۔ تھینکس آپ نے ہمیشہ میری بہت مدد کی۔ ورنہ میرے لیے تو چاروں طرف مشکلات ہی مشکلات تھیں۔" ندئی کے لہجے سے تشکر واضح تھا۔

"یہ سب اللہ کی مرضی ہوتی ہے مس ندئی۔ ہوسکتا ہے میں نے آپ کی اتنی مدد نہ کی ہو جتنی آپ نے میری کر دی ہو۔" مہران مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں اور آپ کی مدد۔ آپ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے؟" وہ ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی اس کے اس قدر دوستانہ انداز پر۔

"بعض چیزیں نظر نہیں آتیں لیکن ہوتی ہیں۔" مہران نے موڑ کاٹتے ہوئے سادہ الفاظ میں جواب دیا۔

"نظر بھلے نہ آئیں لیکن محسوس تو ہوتی ہیں نا اور مجھے تو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ میں نے آپ کی مدد کی ہو۔" ندئی شیشے سے باہر دیکھتی صاف گوئی سے بولی۔

"یہ ایک حقیقت ہے ندئی کہ آپ نے واقعی میری بہت بڑی مدد کی ہے۔" مہران نے ایک جذب سے اعتراف کیا تھا۔ ندئی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟" مہران کی خاموشی پر وہ خود بول پڑی۔

"مجھ سے شادی کریں گی مس ندئی؟" مہران نے گویا بم پھوڑا۔ ندئی اچھل پڑی۔

"جی...... جی سر...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ جیسے سمجھ ہی نہ پائی تھی۔

"مجھے اظہار کرنا نہیں آتا۔ مگر تم سے صرف اتنا کہوں گا کہ تم نے، تمہاری اجلی شخصیت نے مجھے جینے کی نئی راہ دکھائی ہے۔ میں تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔"

ندئی کو لگا جیسے اس کی اندھیری دنیا اچانک ہی رنگوں اور روشنیوں سے جگمگانے لگی ہو۔ قسمت یوں بھی اچانک دروازے پر دستک دیتی ہے وہ حیران تھی۔

"ندئی۔ تم جو بھی فیصلہ کرو۔ مجھے منظور ہے۔ اور اگر کوئی پرابلم ہو تو وہ بھی تم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔" مہران نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میری مامی سے بات کرنا ہو گی۔" خود ندئی کے دل میں کئی وسوسے جاگے۔ مگر وہ مہران کو بھی کوئی امید فی الحال نہیں دینا چاہتی تھی کہ مامی کی لالچی طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

"ان کی فکر نہ کرو۔ وہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اتنا تو میں جان ہی چکا ہوں کہ رشتوں سے زیادہ انہیں پیسوں کی قدر ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے سر۔ بس ماموں کی طبیعت اور ناسازگار حالات کی وجہ سے کچھ چڑچڑی ہو گئی ہیں۔" ندئی نے نرمی سے اس کی بات کی تردید کی۔ وہ دل سے اس کی سیرت اور اخلاق کا قائل ہوا۔

"مذاق کر رہا تھا یار! چلو پھر کرتا ہوں تیاری آپ کی مامی جی سے ملنے کی۔" اس نے ندئی کے گھر کے سامنے کار روکی۔

"کچھ کہو گی نہیں۔" وہ خاموشی سے نیچے اترنے لگی تو مہران نے پکارا۔

"میں اس وقت کا انتظار کروں گی۔" شرم و حیا سے لبریز خوب صورت لہجے میں کتنا خوب صورت اظہار چھپا تھا۔ جو مہران کے وجود میں روشنی بکھیر گیا۔

☆☆☆

خوشی کے مارے اس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ وہ جلدی جلدی دو نوالے لے کر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

"امی۔" اس نے اپنے تکیے کے نیچے رکھی اپنی ماں کی تصویر اٹھائی۔

"امی، کاش آج آپ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں ناں کہ آپ کی شہزادی کے لیے کیسا شہزادہ آیا ہے۔" وہ اپنی سوچ پر خود ہی مسکرا دی۔ تب ہی اسے مامی کا خیال آیا تھا۔

"مامی۔" اس نے بددلی سے تصویر دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دی۔

"کیا مامی مجھے اب اس گھر سے رخصت کرنے پر تیار ہوں گی۔ اب جبکہ میں اچھا خاصا کمانے لگی ہوں۔ ان کو تو ابھی ابھی ہی گھر کی فکروں سے کچھ آزادی ملی ہے۔ وہ مجھے کیونکر جانے دیں گی۔" وہ پریشان ہو کر ٹہلنے لگی۔

"لیکن کیا مجھے ان حالات میں ایسی خود غرضی دکھانی چاہیے۔ ماموں کی اس قدر شدید بیماری، چھوٹے بچوں کی تعلیم کا خرچہ اور اس مہنگائی کے دور میں اتنے افراد کے دوسرے اخراجات، یہ سب جانتے بوجھتے بھی کیا میں بس اپنی زندگی بنا کر الگ ہو جاؤں گی۔" وہ خود سے الجھ پڑی۔

مامی کا رویہ خواہ جیسا بھی تھا۔ صرف اور صرف گھر کے خراب معاشی حالات کی وجہ سے تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے تب مجھے سینے سے لگا لیا جب میرے ماں بابا اس دنیا میں نہ رہے۔ مجھے اپنے گھر میں رہنے کی جگہ دی۔ مجھے بھی وہی کھلایا جو اپنے بچوں کو دیا۔ اتنے مخدوش حالات کے باوجود اگر کبھی انہوں نے اپنے بچوں کے لیے کوئی چیز لی تو میرے لیے بھی پسند کی۔ ٹھیک ہے مجھے کافی کچھ سنایا۔ مگر ظاہر ہے اتنے مشکل حالات میں انسان تلخ ہو ہی جاتا ہے وہ اپنے بچوں کو بھی تو ڈپٹتی رہتی ہیں۔

کیا میں ایسی خود غرضی دکھا سکتی ہوں۔ نہیں مہران کی محبت بھلے ہی میرے دل کی چوکھٹ وا کر گئی ہے۔ مگر میں احسان فراموش نہیں بنوں گی۔ میں اسے صاف بتا دوں گی کہ میں قرض دار ہوں کچھ محبتوں کی اور قرض اتار کر ہی اس کا ہاتھ تھاموں گی۔ مجھے امید

WOMEN SKILLS GROUP

ہے وہ ضرور میری بات سمجھے گا۔ میرا انتظار کرے گا۔'' وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی مسکرا دی۔ خواب جیسے پلکوں پر ستاروں کی مانند سجنے لگے تھے۔

☆☆☆

''ندئی! بیٹا۔ تم سے ملنے آیا ہے کوئی؟'' وہ کتاب میں گم تھی کہ ماں نے اسے آواز دی۔

''کون ہے ماں؟'' اسے پہلا خیال مہران کا ہی آیا تھا۔ مگر ماں کے لہجے سے یہ لگ نہیں رہا تھا۔

''تمہاری کوئی کولیگ ہے۔ میں نے ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ تم جا کر باتیں کرو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' ماں نے کمرے میں آ کر اسے بتایا۔

''آپ آرام کریں ماں۔ میں خود دیکھ لوں تو پھر کچھ بنا لوں گی۔'' ندئی نے ــــ کہا اور سلیقے سے دوپٹا اوڑھتی ساتھ والے کمرے میں آ گئی۔ مگر سامنے کھڑے وجود نے اسے حقیقی طور پر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

''مائرہ، آپ!'' اپنی ہی کمپنی کی ماڈل کو یوں اچانک اپنے گھر میں دیکھ کر اسے واقعی کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

''مس مائرہ۔ آپ اور یہاں میرے گھر۔'' وہ اپنی حیرانی چھپا نہ پائی۔ تب ہی پوچھ بیٹھی۔

مائرہ نے مسکراتے ہوئے اپنے سنہرے بالوں کو جھٹکا۔

''اب ایسی بھی کیا حیرانی مس ندئی۔ کہ بندہ گھر آئے مہمان کو سلام کرنا ہی بھول جائے۔ یا پھر کہیں......'' اس نے جان بوجھ کر بات درمیان میں چھوڑ دی۔

''یا پھر......'' ندئی کا ذہن اس کی ادھوری بات میں اٹک گیا۔ مائرہ اپنا تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر کھل کر مسکرا دی تھی۔

''یا پھر مہران نے تمہیں میرے بارے میں وہ سب کچھ پہلے بتا دیا جو میں اس کے بارے میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔''

وہ اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ندئی کے دل کو کچھ ہوا۔

''کیا مطلب مس مائرہ! مہران نے مجھے آپ کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا اور نہ ہی میں آپ سے مہران کے متعلق کچھ سننا چاہوں گی۔'' نہ جانے کیوں اسے مائرہ سے خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے واضح طور پر اسے جواب دیا تھا۔

''وہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تو اپنا فرض پورا کرنے آئی تھی۔ ایک زخمی عورت کبھی کسی دوسری عورت کا برا نہیں چاہتی۔ میں خود جس کنویں میں چھلانگ لگا چکی ہوں۔ تمہیں اس میں کودتے نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ نم لہجے میں بولی تو ندئی جیسی حساس لڑکی تڑپ کر رہ گئی۔

''کیا مطلب۔ تم مجھ سے صاف بات کرو۔'' اسے بے چینی سی ہوئی۔

''میرا خاندان سید گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ تمہاری طرح حجاب پہننا ہمارے خاندان کی عورتوں کا شیوہ تھا۔ ہم لوگوں کو، مطلب ہمارے خاندان کی لڑکیوں کو سوائے اسکول کے اور کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ مگر بدقسمتی۔'' وہ رونے لگی۔ ندئی بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آئی۔ مائرہ نے بہت مشکل سے خود کو سنبھالا۔

''مگر پھر بدبختی نے ہمارے گھر کا دروازہ دیکھ لیا۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں پاپا کی اچانک ڈیتھ ہو گئی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے۔ سب ہی رشتہ داروں نے آہستہ آہستہ امی اور مجھ سے منہ موڑنا شروع کر دیا۔ پاپا کی مستقل جاب نہ تھی تب ہی ہمیں کوئی پنشن ملنے کی بھی امید نہ تھی۔

تب ایک دن تمہاری طرح حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں مہران علی نقوی کے آفس پہنچی تھی۔ تمہاری طرح حجاب لیتی تھی تب میں۔ شروع میں مہران نے میری بہت مدد کی۔ کسی کی لالچی نگاہیں ہوتیں یا غلیظ لہجہ مہران میرے سامنے ہمیشہ ڈھال بن جاتا۔ میں خود کو اس کے آفس میں محفوظ سمجھنے لگی اور پھر

میری زندگی سنور گئی جب جب مہران نے مجھے اپنا بنانے کی بات کی۔'' ندئی کے اندر کچھ چھنا کے سے ٹوٹا تھا۔ وہ بمشکل سنبھل پائی تھی۔

''میں اس کی زندگی بن گئی تھی بھول اس کے اسے میرے علاوہ اور کوئی چاہ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ دن بے حد حسین تھے۔ ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے۔ ایک دوسرے کی بات بنا کہے ہی سمجھ لیتے۔ مہران جیسے شاندار مرد کو پا کے میں خود کو خوش قسمت تو سمجھ ہی رہی تھی۔ مگر مہران، اس کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ اس کے وہ الفاظ وہ محبت بھرے اظہار قیمتی تحائف کی صورت میں اس کی محبت کا اقرار، مجھے تو گویا زمین پر ہی جنت مل گئی تھی۔

لیکن، لیکن پھر میرے سارے خواب ٹوٹ گئے۔ مہران کو کسی ایسے چہرے کی تلاش تھی۔ جو اس کے کمرشلز کو دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دے۔

وہ کہتا تھا کہ پرانے چہرے دیکھ دیکھ کے لوگ اکتا جاتے ہیں۔ میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن مجھے کہاں خبر تھی کہ میں ہی انجانے میں اس کی...... وہ پھر سے رونے لگی۔ ندئی اس بار اسے دلاسا نہ دے سکی۔ وہ تو خود بے آواز رو رہی تھی۔

''میں اس کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی ندئی۔ پھر اس کو نکال کے میرے پاس بچا بھی کیا تھا۔ اس نے میری اتنی منتیں کیں۔ مجھے اپنی محبت کی اتنی قسمیں دیں کہ میں ہار گئی۔ میں اس کی منتوں، اس کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں یوں پھنسی کہ پھر پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

میرا حجاب، میری شرم و حیاء، میرے خاندان کا تقدس، میری عزت سب کچھ داؤ پر لگ گیا صرف مہران کی محبت کے بدلے میں لیکن پتا ہے مجھے بدلے میں کیا ملا۔ صرف چند ایڈز کے کنٹریکٹ، مہران نے مجھ سے مکمل طور پر منہ موڑ لیا۔ اس کے نزدیک میں اب صرف ایک ماڈل گرل تھی۔ سڑکوں پر لٹکے اخباروں کی شہ سرخیوں میں میرا نام آنے لگا۔

اخبارات میں اشتہارات میں میری تصویریں چھپنے لگیں۔ سڑکوں پر میرے بڑے بڑے پوسٹر نظر آنے لگے۔ میں نیلام ہو گئی ندئی۔ نیلام ہو گئی۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ اندر آتی ماں نے حیرت سے اس سنوری لڑکی کو یوں روتے اور چیختے دیکھا تھا۔ وہ چائے میز پر رکھ کر واپس پلٹ گئیں۔ گم صم سی ندئی شاید ان کے آنے کا نوٹس بھی نہ لے سکی تھی۔

''اب میں مشہور نہیں رہی۔ میری جگہ نئی ماڈلز نے لے لی۔ میں مہران سے ایڈز کی بھیک مانگنے اکثر آفس آتی جاتی رہتی ہوں۔ تب ہی میں نے نوٹس کیا کہ تمہاری طرح حجاب لینے والی لڑکی کا اس ماحول کی کمپنی میں کیا کام۔ میں چونک گئی تمہیں دیکھ کر اور پھر میں سب کچھ سمجھ گئی۔ مہران کا ہو بہو میری طرح تمہارا خیال رکھنا۔ تمہیں صرف اپنے تئیں محدود رکھنا۔ تمہاری حفاظت کا سارا بندوبست اپنے ذمہ لینا۔ مجھے لگا جیسے جو کچھ اس نے میرے ساتھ کیا وہ تمہارے ساتھ دہرانے لگا ہے۔''

''کیا تم ویسے ہی اس پر مہربان ہو جیسے کہ مجھ پر تھے۔''

''ہاں مگر وہ مجھ پر ویسی مہربان نہیں جیسے تم مجھ پر تھیں۔'' ندئی کو کچھ یاد آیا۔ سر کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے سنا تھا۔ مگر خیال نہ کیا تھا۔ تو کیا وہ الفاظ اس کے لیے تھے۔ وہ کانپ گئی۔

''میں نے اس سے تب کھلے لفظوں میں پوچھا تھا ندئی اور اس واہیات نے کھلے لفظوں میں اقرار کیا۔ اسے کوئی خوف نہیں آتا ندئی۔ اللہ کا نہ رسول کا۔ پلیز ندئی میری بات کا یقین کرو۔'' وہ اٹھ کر اس کے قدموں میں آ بیٹھی۔ اور ندئی کا ایک ہاتھ تھام لیا۔

''میں اسی لیے فوراً تمہارا ایڈریس ڈھونڈ کر تم سے خود ملنے چلی آئی۔ سنبھل جاؤ ندئی۔ یہ نہ ہو کہ میری طرح محبت میں اندھی ہو کر تم بھی اپنی دنیا و آخرت خراب کر بیٹھو۔

میری ماں بھی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ میں

WOMEN SKILLS GROUP

اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ندیٰ۔ در در پر صرف ایک ایڈ یا ایک شو کی بھیک مانگنے والی بھکارن بن گئی۔" وہ رونے لگی۔ ندیٰ اس کو چپ کرانے کے لیے اس بار ایک لفظ تسلی کا نہ بول پائی۔ دل کا درد بے انتہا تھا۔ وہ خود کو سنبھالنے کے قابل نہ رہی تھی اسے تسلی کیا دیتی۔

☆☆☆

"میں تین دن کے لیے انگلینڈ جا رہا ہوں۔ تم مس ندیٰ کو ان تین دنوں کے لیے آف دے دینا۔" اسے آفس سے ہی ایئرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ وہ تیزی سے سارے کام نمٹا رہا تھا۔ تب ہی اسے خیال آیا تو اس نے عدنان کو ہدایت کی۔

"ڈونٹ وری سر! میں انہیں اطلاع بھجوا دوں گا۔" اس نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"اور ہاں اسے یہ بھی بتا دینا کہ میں تین دن کے لیے انگلینڈ گیا ہوں۔ تم جانتے ہو اب وہ صرف میری سیکریٹری نہیں۔" اس کے لبوں پر ہمیشہ کی دلکش مسکراہٹ آ گئی۔"

"میں نے کہا ناں سر! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں یہاں سب سنبھال لوں گا۔" اس بار عدنان بھی مسکرا دیا۔ وہ بھلے ہی مہران کے آفس میں کام کرتا تھا۔ مگر دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ سگے بھائیوں کی طرح تھی۔

"تھینکس یار! تمہاری وجہ سے میں بہت سے مسائل سے بچ جاتا ہوں میں۔" وہ سچے دل سے اس کا ممنون ہوا۔

"ارے نہیں سر۔ آپ کے بھی تو کتنے احسانات ہیں مجھ پر۔ بھائیوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں مجھے۔ کبھی مجھے محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں آپ کے آفس کا کوئی ورکر ہوں۔" عدنان بولا تو مہران نے اسے گلے لگا لیا۔

"پاگل۔ تم ہو ہی میرے بھائی۔ یہ ورکر کیا ہوتا ہے۔ آئندہ ایسی بات کر کے میرا دل مت دکھانا۔" اس نے اسے سر پر ہلکی سی دھپ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"او کے۔"

"اچھا میں نکلتا ہوں پھر۔ تم ذرا یہ لاک وغیرہ صحیح سے لگا لینا۔" اس نے بیگ اٹھایا اور عدنان کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ باہر موسم بے حد زبردست تھا۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔

"بہار آنے کو ہے۔" وہ گنگنایا۔ تب ہی اس کی نظر مائرہ پر پڑی۔ وہ شاید اسی سے ملنے آفس آ رہی تھی۔ اس کا موڈ ایک پل میں خراب ہوا تھا۔

"کہیں جا رہے ہو۔" محبت پاش نظروں سے اسے تکتے ہوئے مائرہ نے سوال کیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ خاموشی سے اس کے پاس سے گزر جائے۔ مگر اسے اس کے قریب رکنا پڑا۔

"ہاں۔ انگلینڈ جا رہا ہوں۔ ایک دو جگہ میٹنگ ہے۔" اس نے آرام سے بتایا۔

"تم اس موسم میں بھی گھر پر نہیں ٹک سکتیں۔" اپنی عادت سے مجبور وہ دوستانہ لہجے میں بولا تھا۔

"اکیلے بیٹھے بیٹھے جیسے اپنا آپ تنگ کرنے لگتا ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے تمہاری طرف دوڑ آتی ہوں۔" وہ چہرے پر مصنوعی اداسی لاتے ہوئے بولی۔

"جھوٹ بولنے میں بہت مہارت حاصل کر لی ہے تم نے۔" مائرہ نے ایک گہری نگاہ مہران کے مسکراتے چہرے پر ڈالی تھی۔ کس قدر کائیاں ہو گیا تھا وہ سادہ سا دیہاتی لڑکا۔

"تم کافی بدل گئے ہو مہران۔" وہ بول اٹھی۔

"نہیں، میں بالکل بھی نہیں بدلا مائرہ! ہاں شہر میں رہ کر شہری لوگوں کو اچھی طرح جان گیا ہوں۔ ورنہ میں تو وہی ہوں۔ گاؤں کا اجڈ گنوار لڑکا۔" اس نے مائرہ کے کب کے کہے الفاظ آج اس کے منہ پر مارے تھے۔ وہ خاموش رہی۔

"اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تمہیں کوئی کام ہو تو عدنان ہے پیچھے۔ تمہاری جو بھی مدد کر سکے گا کرے گا۔" اسے واقعی دیر ہو رہی تھی۔ تب ہی بولا۔

"ندیٰ سے نہیں مل کے جا رہے۔" مائرہ سے اسے ایسے الفاظ کی توقع نہیں تھی شاید تب ہی وہ چونکا تھا۔

"کیا ہوا۔ ڈر گئے۔" اسے خاموش دیکھ کر وہ طنزیہ مسکرائی۔

"پتا ہے مائرہ! ندیٰ کی محبت نے میرے سارے خوف زائل کر دیے ہیں۔ ندیٰ کے معاملے میں مجھے کوئی خوف نہیں بلکہ اس کی محبت میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔ ندیٰ پر مجھے بھروسا ہے اور مجھے یقین ہے وہ بھی مجھ پر بھروسہ کرتی ہے۔" وہ اس کے قریب آ کے بولا تھا۔ "چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔"

وہ اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا تھا بہار کے کسی تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند، اس کے پاس اس کی خوشبو رہ گئی تھی۔

"میں تمہارا یہ یقین توڑنے میں کامیاب ہو چکی ہوں مہران! تمہارا ہر راستہ بس میری طرف آتا ہے۔ اس بار بکھرو گے تو میں تمہیں سمیٹ لوں گی۔ تمہیں میرے علاوہ کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ تمہیں میری طرف لوٹنا ہی ہوگا۔" اس نے دل ہی دل میں مہران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور گنگناتی ہوئی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

"ندیٰ۔" مامی کمرے میں آئیں تو گھپ اندھیرا دیکھ کر ان کا دل ہول گیا۔ انہوں نے لائٹ جلائی۔ تو ندیٰ بستر پر پڑی تھی۔ وہ پریشان ہو کر اس کے پاس چلی آئیں۔

"ندیٰ! کوئی عدنان صاحب آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ تم دو تین دن آفس مت آنا۔ تمہارے باس شاید کسی کام سے انگلینڈ گئے ہیں۔" مامی نے غور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے بتایا۔

"ندیٰ! تم روئی ہو۔" مامی اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر پریشان ہو کر بولیں۔ وہ خاموش رہی۔

"ندیٰ! میرا بیٹا۔ بولو کیا بات ہے۔" ان کے نرم لہجے پر ندیٰ مزید بکھر گئی۔ وہ ان سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ وہ اسے حوصلہ دیے گئیں۔ تب ہی اس نے اپنے اور مہران کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو کے علاوہ مائرہ کی بات چیت کے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا۔

مامی سب سن کر ذرا دیر خاموش رہیں۔ ندیٰ ان کے ردعمل کو سوچ کر مزید پریشان ہونے لگی۔

"ندیٰ، ایک بات پوچھوں۔ سچ بتانا۔" مامی نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم بھی مہران کو پسند کرتی ہو۔" وہ سر جھکا گئی۔

"پتہ نہیں مامی۔" لیکن جب انہوں نے مجھے شادی کا کہا تو مجھے اچھا لگا۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

"اس ایک ڈیڑھ ماہ کے دوران تم نے کبھی کوئی ایسی حرکت دیکھی مہران کی جو کسی بھی شریف عورت کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔" انہوں نے ایک اور سوال کیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔ جیسے ان کے سوال کا مطلب نہ سمجھ پائی ہو۔

"اس طرح کے ماحول میں تو روزانہ کئی لڑکیاں تمہارے آفس آتی ہوں گی۔ کوئی بھی عیاش آدمی خود پر جتنا بھی ضبط کر لے کوئی نہ کوئی حرکت اس سے ضرور سرزد ہو گی۔ جیسے کسی بے حد خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر سیٹی بجا دیتا۔ گھورنا۔ یا پھر۔۔۔" انہوں نے وضاحت کی۔ وہ تیزی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں نہیں مامی۔ میں نے ان میں بھی ایسی کوئی حرکت نوٹ نہیں کی۔ بلکہ وہ تو اس مزاج کے لوگوں کو اپنے آفس کے پاس نہیں بھٹکنے دیتے۔"

"تو پھر تم ان پر شک کیسے کر سکتی ہو؟" مامی کا لہجہ سادہ تھا۔

"کیونکہ بقول مائرہ کے وہ یہی سب کر کے لڑکیوں کو امپریس کرتے ہیں۔ پھر مائرہ نے جو بھی باتیں بتائیں۔ بالکل ویسا ہی انہوں نے میرے ساتھ بھی کیا۔ مامی مجھے ڈر لگ رہا ہے ۔۔۔ کہیں

WOMEN SKILLS GROUP

ہاتھ میں بھی باز و کی طرح کسی کے ہاتھ کھلونا نہ بن جاؤں۔" وہ رو دی تھی۔ مامی کو اس کی اس قدر مایوس حالت پر غصہ بھی آیا اور ترس بھی۔

"میں اور تمہاری ماں بہت اچھی دوستیں تھیں۔ ہم دونوں امیر ماں باپ کی بیٹیاں تھیں۔ ہر وقت موج مستی کرنا۔ کبھی زندگی سے بھی اگر ہمارا ناتا تھا تو صرف خواتین کے رسالوں کی صورت میں۔ ہم ان رسالوں میں چھپے سارے امور انجام دے دیتے۔ ان کو پڑھتے اور پھر دیر تک بیٹھے ان کو ڈسکس کرنا تمہاری ماں اور میرا مشغلہ تھا۔ لیکن پھر ہماری قسمت بدلی۔ یوں کہو کہ پلٹا کھایا۔

تمہاری ماں کے بابا اور میرے چچا یکے بعد دیگرے اس دنیا سے چل دیے۔ تب تمہارے ماموں نے تمہاری ماں کی شادی کرا کے ان سے اور میرے چیا زادوں نے میری شادی اپنے ہی ایک نوکر سے کرا کر ہم سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑا لیا۔ تب ہمیں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی کوئی سمجھانے والا تھا۔

عیش و عشرت کی زندگی بس پل میں ختم ہوئی۔ ان دنوں ان ہی رسالوں نے ہمیں رہنمائی دی۔ ہمیں صبر و رضا کا درس دیا۔ ہر مشکل وقت میں کس طرح اللہ کی مدد سے سرخرو ہونا چاہیے ان ہی رسالوں سے سیکھا ہم نے۔ تمہاری ماں کی نسبت میں ذرا کم حوصلہ تھی۔ تب میں جلد ہی ان رسالوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنی زندگی میں مگن ہو گئی۔ پھر اوپر تلے ان بچوں کی پیدائش نے بھی مجھے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وقت ہی نہیں ملتا تھا اپنے لیے۔ لیکن تمہاری ماں نے ان سے اپنا رشتہ نہ توڑا۔

پھر تمہارے ابی ابو کی اچانک ڈیتھ اور تمہارے ماموں کی مجھیں بیماری اور گھر کے ناساعد حالات نے مجھے چڑچڑا سا کر دیا۔" وہ ذرا دیر خاموش رہیں۔ پھر بولنے لگیں۔

"یقین مانو ندلی۔ اگر میں اسی طرح حوصلہ ہارے رکھتی۔ یوں ہمت ہارنے کے بجائے حالات کا سامنا کرتی تو میری زندگی بھی تمہاری ماں کی طرح آسانی سے کٹ جاتی۔ اس کی شادی بھی ایک عام کلرک سے ہوئی تھی۔ مگر اس نے ہمت سے اپنی زندگی سنوار لی۔" انہوں نے ندلی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تو کیا ماموں، آئی مین وہ امی کے ـــــ" یہ ندلی حیران ہوئی۔

"ہاں وہ ان کے بھائی نہیں ہیں وہ تمہاری ماں کے بلکہ ہم دونوں کے رشتے ... سگی بہنوں سے بڑھ کر تھی اور تمہارے باپ نے ... اور انہوں نے بھی کبھی اس رشتے میں کمی آنے نہ دی۔"

"خیر۔ میں تمہیں صرف اتنا کہوں گی کہ پتا نہیں کیوں مجھے تو خود وہ لڑکی اچھی نہیں لگی۔ اللہ معاف کرے بدگمانی پر۔ مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے اسے مہران سے کوئی خار ہے۔

لیکن جو بھی ہے تم خود سمجھ دار ہو۔ دنیا کو دوسروں کی نظر سے نہیں اپنی نظروں سے پرکھو۔ دل اور دماغ دونوں کی سنو۔ اللہ پر بھروسہ کرو اور پھر فیصلہ کرو۔ کسی دوسرے کے کہے کو سچ مان لینا عقل مندی نہیں۔ یہ نہ ہو تمہارے ساتھ صرف پچھتاوا رہ جائے۔"

مامی نے نرمی سے اسے سمجھایا اور اٹھنے لگیں۔ کہ ندلی نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"مامی، مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کو غلط سمجھی۔ مجھے تو لگا کہ آپ شاید مہران کے بارے میں سن کر ــــ"

"نہیں ندلی! قصور تمہارا نہیں بلکہ میرے رویے کا ہے۔ بعض اوقات ہم اپنے غلط رویوں سے نہ صرف کئی معصوم دل توڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اپنا عکس بھی دھندلا دیتے ہیں ان کے دلوں کے آئینے میں۔ ہو سکے تو تم مجھے معاف کر دینا۔" وہ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

اضطرابی کیفیت میں عجیب سا سکون آ گیا تو وہ کمرے میں بنی بڑی سی الماری ... کمرے میں بڑی بڑی ... رکھی تھیں۔ جن میں الماری کے بالکل اوپر چند کتابیں رکھی تھیں۔ جن میں سے ایک مخملیں کپڑے میں محفوظ تھی۔ اس نے احتیاط سے وہ کتاب اٹھالی۔

کپڑا گرد سے اٹا پڑا تھا۔ یہ کتاب اسے امی نے دی تھی۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کے لیے۔ مگر وہ اسے اپنے پاس رکھ کے بھول گئی تھی۔ دنیا کی واحد مکمل کتاب مکمل ضابطہ حیات، درس اخلاقیات اور تمام مشکلات سے نجات کی کنجی وہ یونہی رکھ کر بھول گئی تھی۔ اس نے گرد آلود غلاف اتار کر اپنے تکیے پر رکھ دیا۔ کپڑے کی وجہ سے وہ پاک کتاب دھول کی پہنچ سے دور رہی تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے قرآن مجید کو صاف کیا اور اسے لبوں اور آنکھوں سے لگالیا۔ ڈھیروں ڈھیر سکون سا سرایت کر گیا تھا اس کے وجود میں۔

"امی آپ نے مجھے کتنے اچھے تحفے دیے۔ زندگی کی راہوں پر ہر اندھیرے کی مقابلہ کرنے کے لیے ایک مشعل میرے ہاتھ میں پکڑائی کہ جس کی لو کوئی طوفان، کوئی آندھی ختم نہ کر سکتی تھی۔ اور میں، میں نے آپ کے دیے ہوئے کچھ جگنو تو تھامے رکھے لیکن اصل مشعل راہ بھول گئی۔ چھوٹے موٹے اندھیرے تو ان جگنوؤں کی وجہ سے چھٹتے رہے مگر زندگی کے اس موڑ پر جب میری کوئی مدد نہ کر سکا، جب مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تو آپ کی دی ہوئی لازوال شمع ان شاء اللہ ضرور میری مشکل آسان کرنے میں میری مدد کرے گی۔ اور مجھے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور دکھائے گا میرا خدا۔" اس نے دل ہی دل میں ماں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اچھی طرح سر دوپٹے سے لپیٹ کر گود میں رکھا قرآن مجید کھول کر اونچی آواز میں پڑھنے لگی۔

تب ہی مامی نے اندر جھانکا تھا۔ اور اسے تلاوت قرآن پاک کرتا دیکھ کر مطمئن ہو کر واپس مڑ گئیں۔ انہیں یقین تھا کہ ندلی کی ساری پریشانیاں ان شاء اللہ جلد دور ہو جائیں گی۔

"اور کیا حالات ہیں عدنان۔" وہ آج صبح ہی واپس آیا تھا اور سیدھا آفس چلا آیا۔ اس کا مقصد تھا کہ آفس سے ہو کر پھر گھر جا کر آرام کرے گا اور شام کو اس نے ندلی کے گھر کا چکر بھی لگانا تھا۔

"سب ٹھیک ہے سر۔"

"کتنے ایڈز مکمل ہو پائے۔" اس نے فائل چیک کرتے ہوئے کہا۔

"سر نوید صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اچانک تو شوٹنگ کینسل کرنا پڑی۔" نوید ان کا پرانا اور قابل اعتماد کیمرہ مین تھا۔

"اوہ کیا ہوا انہیں۔ خیریت تو ہے ناں۔" وہ پریشان ہوا۔

"بس سر۔ ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا یہیں شوٹ کے دوران۔"

"پھر تم لوگوں نے سب کچھ سنبھال تو لیا تھا ناں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یس سر، ہم فوراً انہیں اسپتال لے گئے تھے۔ میں نے ڈرائیور بھیج کر ان کے گھر والوں کو بھی بلوالیا تھا۔" عدنان نے اسے تفصیل بتائی۔

"پھر بھی تمہیں خود بھی ان کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ خرچا وغیرہ؟" مہران نے مزید پوچھا۔

"میں اور عامر شام کو ان ہی کے پاس ہوتے ہیں۔ خرچہ بھی فی الحال ہم دونوں اٹھا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سر ان کے گھر میں اور کوئی میل (مرد) نہیں ہے۔" عدنان بولا۔

"بہت اچھا کیا یہ تم لوگوں نے۔ میں گھر جاتا ہوں۔ فریش ہو کر شام کو میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔" مہران نے کہا تو وہ سر ہلا کر جانے لگا۔

"ایک منٹ عدنان۔ ندلی آئی ہیں۔" اچانک اسے خیال آیا۔ اسے تین دن سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ اس طرح ندلی کو اس وقت آفس ہونا چاہیے تھا۔

"نہیں سر۔ مس ندلی تو دو دن سے نہیں آ رہیں پرسوں آئی تھیں۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں۔

WOMEN SKILLS GROUP

میں نے دو تین دن کا اسے بتایا تھا۔ تب شاید۔" عدنان نے جواب دیا۔

"ہاں، تم نے اچھا کیا۔ چلو آج تو مسز نوید کا حال احوال پوچھ لوں۔ کل پھر خود ندلی کے گھر جاؤں گی۔" اس نے جیسے خود سے کہا تھا۔ عدنان مسکراتے ہوئے باہر چلا گیا۔ مہران سامنے میز پر رکھی کچھ فائلز چیک کرنے لگا۔

☆☆☆

"تو کیا سوچا ہے تم نے ندلی۔" ندلی جانے کن سوچوں میں گم دور خلاؤں میں گھور رہی تھی کہ ماں کی آواز نے چونکا دیا۔

"آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے ماں۔" اس نے الٹا ان سے سوال کیا۔

"میرے خیال میں تو تمہیں خود جا کر مہران سے بات کرنی چاہیے۔ مائرہ کے بارے میں سب کچھ بتانا چاہیے۔ اس کی بات بھی تو سنو۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔" ماں بولیں۔

"نہیں ماں۔ وہ مائرہ کی سب باتیں فوراً جھٹلا بھی تو سکتا ہے۔" ندلی بولی۔

"ہو سکتا ہے وہ یہ سب مان بھی لے۔" ماں نے کہا تو اس نے دوبارہ سے نظریں آسمان پر ٹکا لیں۔

"اس طرح تو میری منزل آسان ہو جائے گی ناں ماں۔" اس کی آواز خود اس کے لیے اجنبی تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہو۔ اور جو کچھ اس نے مائرہ کے ساتھ کیا اس پر شرمندہ ہو۔" ماں نے ایک اور پہلو اجاگر کیا۔

"نہیں ماں۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ اگر وہ ایسا ہی ہوا تو میں اسے کبھی بھی نہیں سدھار سکتی۔" وہ کچھ زیادہ ہی بدگمان تھی۔ نہ جانے کیوں ماں کو افسوس ہوا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے ندلی اگر تمہیں اتنی بدگمانی ہو چکی ہے مہران سے۔ اگر یہ سب جھوٹ ہوا۔ صرف اس بنا پر تم اس کی نظروں سے اس کا سامنا کر لو گی۔ اور پھر تم نے خود بتایا مجھے کہ اس نے واضح طور پر

اختیار تمہیں سونپ دیا ہے۔ کہ تم جو بھی فیصلہ کرو اسے قبول ہو گا۔ اس نے تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔ سو ابھی بھی تم اسے انکار کرو یا اقرار، فائدہ یا نقصان میرے نزدیک تو صرف تمہارا ہو گا۔" ماں نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔ ندلی نے احترام سے انہیں دیکھا۔

"ماں! آپ کو نہیں لگتا کہ اگر یہ سب کلیئر ہو گیا اور میں اس گھر سے چلی گئی تو آپ کے حالات ایک دفعہ پھر مشکل ہو جائیں گے۔" خود بخود اس کے منہ سے پھسلا تھا۔ ماں مسکرا دی تھیں۔

"پاگل، رزق تو اللہ دیتا ہے۔ تمہاری نوکری سے پہلے بھی تو گزارا ہو رہا ہے۔ ایسی باتیں صرف وہ لوگ سوچتے ہیں جو اللہ کی ذات کا یقین کھو دیتے ہیں نعوذ باللہ۔ اللہ مجھے اور تمہیں اس شرک سے بچائے۔ آمین۔ آئندہ ایسا سوچنا بھی مت۔ اچھا۔" ماں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

"میرے خیال میں تو مہران واپس آ چکا ہو گا۔ تم کل ہی جا کر اس سے مل لو۔ آگے جو ہو گا اللہ پر چھوڑ دو۔ اور اللہ ہی بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔" ماں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے نرمی سے کہا اور اٹھ گئیں۔ ندلی پھر سے دور نیلے آسمان پر جیسے کچھ کھوجنے لگی۔

☆☆☆

وہ چاہ کر بھی خود کو نارمل نہ کر پائی تھی۔ کئی روز کی مسلسل پریشانی نے اس کے اعصاب پر بہت زیادہ اثر ڈالا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ تب ہی عدنان اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

"مس ندلی! آر یو او کے۔" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"جی عدنان بھائی۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑی طبیعت خراب تھی تو۔" اس نے حتی الامکان اپنے آنسوؤں کو چھلکنے سے روکا تھا۔ جو آج کل ان بلائے مہمان بن کر چلے آتے تھے۔

"تو آپ [illegible] چلیں میں آپ کو واپس گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ ابھی نہیں لگ رہی۔ واپسی پر میں سر کو بتا دوں گا آپ کے بارے میں۔" عدنان نے اسے آفر دی۔

"نہیں اٹس او کے۔ میں سر سے ملنے ہی آئی ہوں۔ مجھے ان سے بے حد ضروری کام ہے۔" اس نے آرام سے عدنان کو منع کر دیا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ کہتا اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ ندلی چپ چاپ مہران کے کمرے کی طرف آ گئی۔

"تم اتنے سنگ دل تو نہ تھے مہران۔" مائرہ کی آواز وہ بخوبی پہچان سکتی تھی۔ تب ہی اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھم سے گئے تھے۔

"میں اب بھی سنگدل نہیں ہوں مائرہ خان۔ یہ راستے تم نے خود چنے تھے۔ تمہیں یاد ہے پھوپھو اور میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ اس راستے میں صرف اور صرف بربادی ہے۔ تاریکی اور تنہائی ہے ان راستوں کا مقدر۔ بظاہر گل و گلزار نظر آنے والے یہ راستے کانٹوں سے بھرے ہیں۔ لیکن تم نے ہماری محبتوں کو ٹھکرا کر خود یہ راستے چنے ہیں۔ میں آج بھی تمہاری مدد کر رہا ہوں اور وہ تمہاری وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مرحومہ پھوپھو کی وجہ سے ان کی شفقت، محبت اور احسانات کی وجہ سے میں تمہیں پیچھے [illegible] کے بجائے تمہیں سہارا دے رہا ہوں۔ تم اگر اسے میری کمزوری خیال کرو تو یہ سراسر تمہاری غلطی ہے میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔" مہران کا سچا لہجہ اس کے الفاظ کی سچائی کا گواہ تھا۔ ندلی دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ان احسانات کے بدلے تم مجھے اپنا نہیں سکتے۔" مائرہ کے لہجے میں منت نہیں زعم تھا۔ ندلی دروازے کے مزید قریب ہوئی۔

"پلیز مائرہ۔" مہران نے ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے ختم کرنا چاہی تھی۔

"تم مجھے شیزا نہیں کہہ سکتے۔" مائرہ تڑپی۔

"نہیں کیونکہ تم ہو ہی مائرہ۔ شیزا دی تو کب

کا بہو سادہ تھا یا کفر بھرا۔ ندلی سمجھ نہ سکی۔

"تم کیا سمجھتے ہو تم یوں مجھ سے دامن چھڑانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ٹھیک ہے میں نے غلطی کی۔ تمہاری محبت تمہارے خلوص کو ٹھوکر مار کر شرافت کا راستہ چھوڑ کر بدنامی کو گلے لگایا مگر ایک بات تم بھی اچھی طرح سن لو مہران، میرے علاوہ تمہارے پاس اور کوئی آپشن نہیں رہا۔" وہ ہنسی تھی۔ ندلی کو اس کی ہنسی کھولا گئی۔

"ایک بات تم بھی غور سے سن لو مائرہ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو کسی کی چوائس ہوتے ہیں۔ ورنہ آپشن تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ میرے لیے خدا نے ایک ایسی ہی چوائس رکھ دی ہے۔ بے حد پاکیزہ، خالص اور سادہ۔" مہران کے لہجے میں کتنا جذب تھا۔ ندلی کی آنکھوں سے مارے شرمندگی کے آنسو جاری ہو گئے۔

"تمہارے لیے کئی آپشنز اور ہوں گے شیزا مگر میں یہ چوائس مر کر بھی چھوڑ نہیں سکتا۔ ندلی نہیں تو کوئی

WOMEN SKILLS GROUP

تھیں۔" کتنی نفرت تھی مہران کے لہجے میں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ٹشو بگاڑتے ہوئے سوچا۔

"ندی ---- وہ تمہیں قبول کرے گی تو ناں۔" اچانک ہی مائرہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب؟" مہران کی آواز میں حیرانی واضح تھی۔

"میں نے تمہارے متعلق جو کچھ بھی ندی کو بتایا ہے ناں۔ تو وہ مرنا پسند کرے گی مگر تمہارا ساتھ کبھی قبول نہ کرے گی۔" اس کی آواز میں نفرت تھی۔ ندی کو غصہ آنے لگا۔

"تم ---- تم ندی سے ملی تھیں۔" مہران شاید اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں۔ تمہیں پانے کے لیے صرف اور صرف تمہیں پانے کے لیے، میں نے اس کے کانوں میں تمہارے خلاف اتنا زہر بھر دیا ہے کہ تم چاہ کر بھی اس کا دل صاف نہ کر سکو گے اپنی طرف سے۔" مائرہ نے چیختے لہجے میں کہا۔

"اور تمہیں کیا لگتا ہے اس کے بعد بھی میں تمہیں قبول کر لوں گا۔" مہران کی آواز میں طنز تھا۔

"مجھے ندی پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ تمہارا کبھی یقین نہیں کرے گی۔ اللہ نے چاہا تو وہ خود میرے پاس آئے گی۔ تمہاری طرح وہ رشتوں کو ٹھوکر پر رکھنے والی نہیں بلکہ محبتوں کی قدر کرنے والی لڑکی ہے۔ پرخلوص اور ریا سے پاک۔" مہران کے لہجے میں اس کے لیے کتنا مان تھا کتنا بھروسہ تھا۔ ماسی نے سچ کہا تھا۔ اسے اب خود سے نظریں ملانا مشکل ہو رہی تھیں۔ اس نے پھٹا ہوا کاغذ دروازے کے پاس رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور دروازہ کھول کے اندر چلی آئی۔ اسے دیکھتے ہی مہران کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

"ندی۔" مائرہ نے مڑ کر دیکھا اور اس پر نظر پڑتے ہی ہونٹ چبانے لگی تھی۔

"مہران!" اس نے جان بوجھ کر "سر" کی بجائے مہران کہا تھا۔

"میری طبیعت خراب ہے۔ کیا آپ مجھے گھر چھوڑ دیں گے۔" اس نے مہران کے بالکل سامنے آتے ہوئے کہا۔ اس کی نڈھال سی صورت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا تمہیں۔" اس نے تیزی سے ندی کا دایاں ہاتھ تھاما۔

"ہوا ہے نہیں، ہوا تھا۔" اس نے مائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مائرہ نے فوراً نظریں چرائیں۔

"لیکن اب ٹھیک ہوں، چلیں۔" اس نے بھی مہران کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں چلو۔ اوکے مائرہ! میں چلتا ہوں۔ تم عدنان سے مل کر اپنا سارا حساب کلیئر کر لینا۔ اور ہاں میں نے یہ کمپنی بیچ دی ہے۔ ندی کے ملنے کے بعد نہ تو اب میرے دل میں کوئی انتقامی جذبہ زندہ رہا ہے نہ کوئی احساس محرومی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ندی کو اس پر فخر سا ہوا۔

"اب میں کوئی ڈھنگ کا بزنس کروں گا۔ سو اب میری طرف سے ہمیشہ کے لیے اللہ حافظ۔"

اسے ہاتھ ہلاتا، ندی کا ہاتھ تھامے وہ اپنے شان دار آفس سے باہر نکل آیا۔ بہار کی پہلی بارش نے موسم بے حد خوش گوار کر دیا تھا۔

" تارکول کی صاف ستھری سڑک پر گاڑی دوڑاتے مہران نے محبت پاش نظروں سے ندی کو دیکھا جس نے اس کا یقین ٹوٹنے نہیں دیا۔ اور ندی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ جس ذات پاک نے اسے بروقت غلط فیصلہ کرنے سے بچا لیا تھا۔ اور اسے اپنے رب پر بھروسہ تھا کہ وہ ضرور اس کی اس چھوٹی سی غلطی کا پردہ رکھے گا۔ بہاریں مسکرا دی تھیں اور محبتوں کے مہکتے گلاب اس کے ہم سفر تھے۔ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

☆

نادیہ جہانگیر

فائدہ

"ازمیر، سمیر! میں تم بھائیوں کو اکٹھا دیکھنا چاہتی ہوں، ساری زندگی ایک ساتھ، کندھے سے کندھا ملائے، پشت سے پشت جوڑے۔" نائلہ خاتون نے اپنے سامنے بیٹھے دونوں بیٹوں اور دونوں بہوؤں پر باری باری گہری نظر ڈال کر کہا تو دونوں بہوئیں پہلو بدلنے لگیں جبکہ ایک بیٹا ماں کے کندھے سے جا لگا اور دوسرا قدموں میں بیٹھ گیا۔

"اتفاق میں برکت ہے بیٹا۔ جب تک تم لوگ ایک ساتھ رہو گے، کوئی دوسرا تمہارا نہ کچھ بگاڑ سکے گا اور نہ توڑ سکے گا۔ تم دونوں کی طاقت ایک ہو گی تو لوگوں کو دوگنی لگے گی۔ لوگ تمہیں بکھیرنا بھی چاہیں تو بکھیر نہ سکیں گے۔" ماں نے کندھے سے لگے بیٹے کے گرد اپنا بازو پھیلا لیا جب کہ قدموں میں بیٹھے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

"مانا کہ تم دونوں کی شادیاں ہو گئیں۔ دونوں بچوں کے باپ بھی بن گئے ہو لیکن جو رشتہ تم دونوں کا آپس میں ہے۔ اسے کبھی فراموش نہ کرنا۔ کسی اور کی خاطر (ان کی بیویوں پر نظر ڈال کر) ۔ کبھی ایک دوسرے سے اختلاف نہ رکھنا۔ اپنے کانوں کو ہمیشہ صاف رکھنا ورنہ سنانے والے بہت کچھ سنا دیتے ہیں لیکن اس "سنائی" کی وجہ سے جو میل دلوں میں آ جاتا ہے وہ بہت خطرناک ہوتا ہے بیٹا۔ گھر کی تیاری، بھائیوں کی جدائی۔ اتفاق کا توڑ، اتحاد کا مروڑ سب اسی میل کی مرہون منت ہوتے ہیں بیٹا۔ اس

چیز کو بھول کر بھی بھی پاس بھٹکنے نہ دینا۔"

ماں بہت نرمی سے اپنے بیٹوں کو دنیا کی اونچ نیچ سمجھا رہی تھی۔ ایک عمر جی چکی تھیں دنیا کے ہر رنگ اور ہر روپ دیکھ چکی تھیں۔ جب ہی تو وہ اپنے دونوں بیٹوں کو ہمیشہ ایک ساتھ جوڑے رکھنا چاہتی تھیں۔ ایک گھر میں ایک ہی چھت کے تلے۔

"یہ گھر تم دونوں کا ہے۔ ایک سا، ایک جتنا، اس کے بٹوارے کا سوچا بیٹا تو تم اسی دن جان لینا۔ تم دونوں کے دلوں کا بٹوارہ ہو گیا اور یہ بٹوارہ بھائیوں کی طاقت کا بٹوارہ ہوتا ہے۔ ان کی آپس کی محبتوں کا جو دکھ سکھ پہلے بھائیوں کے آپس میں برابر ہوتے ہیں وہ بٹوارے کے بعد سب میں دراڑیں آجاتی ہیں۔ کبھی نہ ختم ہونے کے لیے لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی بیٹا۔ ایسے حالات میرے بیٹوں کے ساتھ پیش آئیں۔ کبھی ان میں پھوٹ پڑے۔ دراڑ آئے۔"

وہ نرمی و محبت سے، اور مامتا سے لبریز جذبات میں بیٹوں کو سمجھا رہی تھیں۔ انہیں سب اونچ نیچ دکھا رہی تھیں اور بیٹے بھی تو ماں کے دیوانے تھے۔ ماں کی ایک ایک بات توجہ سے سنتے۔ اپنے اندر تک اتارے جا رہے تھے۔ ان کی بہوئیں بار بار پہلو بدلتیں۔ ماتھے پر شکنیں لا کر معدوم کرتیں۔ بار بار منہ کے زاویے بدل بدل کر تھک گئیں تو رات کے کھانے کے لیے اٹھ گئیں جبکہ بیٹے ماں سے لپٹے بیٹھے انہیں اندر تک سرشار کرتے رہے۔

"میں یہ نہیں کہتی بیٹا! تم لوگوں کی بیویاں اچھی نہیں ہیں اپنی اپنی ذات میں وہ بھی یقیناً اچھی ہوں گی لیکن ان کا ہر ہر انداز بتاتا ہے وہ تم دونوں کو اپنی اپنی طرف کھینچیں گی۔ بھائیوں کی آپس کی محبت میں تھوڑی تھوڑی خراش ڈالیں گی کہ تم دونوں گھر اور کاروبار علیحدہ علیحدہ کرنے پر مجبور ہو جاؤ لیکن بیٹا یاد رکھنا بیویاں اور بچے اور بھی مل جاتے ہیں مگر ماں باپ اور بہن بھائی دوبارہ نہیں ملتے۔ ماں ایک، باپ ایک، بہن کا اپنا مقام، بھائی کا اپنا، انسان دوسری شادی بھی کر لیتا ہے بیوی اور شوہر بدلے بھی جا سکتے ہیں لیکن ماں، بہن، بھائی نہیں۔"

اور ماں اتنے پتے کی بات بتا رہی تھی دونوں بھائی ماں کے قریب کیوں نہ ہوتے، دونوں ماں کو محبت سے چومنے لگے تھے اور یہ محفل رات گیارہ بجے تک جاری و ساری رہی تھی۔

☆☆☆

بیٹوں کے اندر جاتے ہی وہ بھی اٹھ کر اپنے بستر پر آ گئیں تو سائیڈ ٹیبل پر رکھے اپنے فون پر نظر گئی، ناعمہ (بیٹی) کی چھ مسڈ کالز تھیں۔ وہ جو خاصی مطمئن اور شاد سی اندر آ کر لیٹی تھیں۔ ناعمہ کی اتنی کالز دیکھ کر ذرا سی پریشان ہو گئیں۔ تب انہوں نے اسے جوابی کال کی جو ناعمہ نے تیسری ہی بیل پر اٹھالی۔

"خیریت، تم نے اتنی کالز کیں؟"

"نعمان آج اسلام آباد گئے ہوئے ہیں امی اور آج میرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ وہ ہمیں کسی بھی صورت علیحدہ گھر میں شفٹ نہیں ہونے دے رہیں۔ شور شرابا مچا رہی ہیں۔ بیٹوں پر رعب ڈال رہی ہیں۔"

"ارے دفع کرو اس کے شور شرابے کو۔ جب اس عمر میں ہی بچوں نے اپنی زندگی نہیں جینی تو آگے کا فائدہ۔ میری مانو ناعمہ! تم نعمان کو ان محترمہ کے پاس کم ہی بیٹھنے دیا کرو۔ ورنہ وہ تم لوگوں کی زندگیوں کا نہیں صرف اپنی زندگی کا سوچے گی۔ ان بھائیوں کو کبھی گھر اور کاروبار علیحدہ نہیں کرنے دے گی کیونکہ اس میں ان بھائیوں کا فائدہ کم تمہاری ساس کا فائدہ زیادہ ہے اور ایسا وہ کبھی نہیں چاہے گی۔ وہ کبھی ایک بیٹے کے گھر جا کر رہے اور کبھی دوسرے کے جب ہی تو وہ نعمان اور سلیمان کو ایک ہی گھر میں رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تم اپنے شوہر کو پوری طرح قابو کرو ناعمہ اپنا فائدہ سوچو، اپنے بچوں کا فائدہ سوچو، اس بڑھیا کا نہیں۔"

☆

WOMEN SKILLS GROUP

Women Skills

مدیحہ سعید

دِل فقیر تیرے لیے

"مجھے دیکھنے دے قریب سے
میری چشم نم کو زکوۃ دے"

جلنے کا وقت تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں سرمئی بدلیاں اڑتی پھر رہی تھیں۔ سرشام کیاریوں کو پانی دیا گیا تھا جس کے باعث فضا میں مٹی کی سوندھی خوشبو کے علاوہ انواع اقسام کے پھولوں کی مہک رچی تھی۔ جامن کے پیڑ پر کوکتی کوئل کی کوک اور دور چڑی کی چک چکا چک کی آواز میں عجیب سا تال میل تھا۔

وہ اٹھارہ روز بعد زید کے آنے کی خبر سن کر حویلی آیا تھا۔ صحن عبور کرتے وہ لمبے برآمدے کے

ناولٹ

تین اسٹیپ چڑھ کر [illegible] موڑتا اپنے ہی دھیان میں تھا کہ چھناکے کی آواز پر [illegible] اس جانب اٹھی تو ہاتھ ایک زاویے پر ساکت رہ گیا۔ وہ [illegible] اور سرخ لان کے خستہ حال سوٹ میں ملبوس آنے والے کی طرف بے خودی سے متوجہ تھی۔ جبکہ آنے والے کو اپنی بصارتوں پر شبہ ہوا۔ کیا وہ اجڑے حال [illegible] درعدن بلال ہے؟ وہ درعدن بلال جس کی شاہانہ شخصیت اور وقار کا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی قائل تھا۔ وہ شاہزادیوں جیسی آن بان والی کیسے بھکارن کے روپ میں کھڑی تھی۔ تب ہی ہلکے سے کھٹکے کی آواز پر وہ چونک کر ہال کمرے سے باہر آتے زید کی طرف متوجہ ہوا تو لبوں کو دلکش مسکان چھو گئی۔

درعدن کی آنکھیں تیزی سے نم ہوئیں۔ زید گرم جوشی سے بھائی پکارتا اس کی طرف لپکا۔

"کہاں سے لاؤں میں اتنا صبر
تم تھوڑا کیوں نہیں مل جاتے"

اس کی پشت پر نگاہیں جمائے عدن بے بس ہوئی تھی۔

☆☆☆

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بڑی اماں؟" زید نے بے یقینی سے تائی کی طرف دیکھا۔ "آپ لوگ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟"

دکھ، حیرت، بے یقینی کیا کچھ نہ تھا لہجے میں۔

"یہ ہم نے نہیں کیا؟ ان کا انداز روکھا سا تھا۔

"تو پھر کون ذمہ دار ہے؟" اس بار مخاطب ماں تھی۔

WOMEN SKILLS GROUP

''سکندر!'' ماں نے گہری سانس لیتے گویا اعتراف جرم کیا جبکہ اس بار لگنے والا جھٹکا اس قدر شدید تھا کہ وہ چند لمحوں تک کچھ بول ہی نہ پایا۔ فیروز چاچو جانے کب وہاں آئے تھے اور اب اس کے شاکڈ چہرے پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔

''وہ اتنے ظالم کیسے ہو سکتے ہیں؟'' بے یقین لہجے میں خود کلامی کی تو تائی نے اسے گھورا۔

''اس میں ظلم والی کیا بات ہے؟'' تائی کے سرد انداز پر سر اٹھایا تو آنکھیں سرخ تھیں۔

''یہ ظلم نہیں بلکہ ظلم کی انتہا ہے۔ بڑی اماں!''

''زید! تم اس معاملے سے دور رہو۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔''

''یہ میرے بھائی کا معاملہ ہے تو اس کا تعلق مجھ سے بھی ہے۔''

''تمہیں کیوں اس سے اتنی ہمدردی ہو رہی ہے؟'' تائی نے مشکوک نگاہوں سے اسے گھورا تو زید کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''مجھے اس سے نہیں اپنے بھائی سے ہمدردی ہے۔''

''اگر تمہارا کوئی جواں سال بیٹا دنیا سے جاتا اور وہ منحوس لڑکی بدلے میں یہاں آتی۔ تب میں دیکھتی کہ تمہیں کس سے ہمدردی ہے زید؟'' تائی کا لہجہ بھر آگیا۔ عابدہ نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں بھینچتے بیٹے کو گھورا۔

''معافی مانگو زید۔''

''میں نے ایسا کیا کیا ہے اماں اور بھائی......''

''زید!'' اماں نے درشتی سے اسے ٹوکا تو اس نے لب بھینچ لیے۔

''تم اس معاملے میں کچھ نہیں بولو گے اور معافی مانگو۔''

''ایم سوری بڑی اماں!'' آنکھوں میں ہٹ دھرمی اور تنی گردن کے ساتھ سوری کہتے وہ جھٹکے سے اٹھ کر ڈیرے پر سکندر کی طرف روانہ ہوا، وہ جس اعتماد اور مان بھروسے پر بھائی کے پاس گیا تھا اس سے دگنی شکستگی سے اپنے ٹوٹے مان کی کرچیاں لیے پلٹا تھا۔ گاڑی وہیں چھوڑ کر وہ پچھلے پچیس منٹ سے پیدل چل رہا تھا۔ بادامی قمیص پسینے میں بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔ دن کے دو بجے کا وقت تھا سورج خوب چمک رہا تھا مگر وہ موسم کی شدت سے بے نیاز بس چلتا ہی جا رہا تھا۔ پاؤں کے نیچے مٹی کا ڈھیلا آیا تو وہ لڑکھڑا گیا پھر جھک کر ڈھیلا اٹھاتے پوری قوت سے دور اچھال دیا۔

''کیوں؟'' وہ حلق کے بل چیخا۔ ''پلیز مجھ سے اس سے انداز میں بات مت کریں میں آپ کی بے رخی سہہ نہیں پاؤں گا۔''

''تم اس معاملے سے دور رہو زید! یہ میرا اور اس خاندان کا مسئلہ ہے۔''

''وہ اس خاندان کا نہیں اس لڑکی کا معاملہ ہے جو آپ کی بیوی ہے۔''

''جسٹ شٹ اپ!'' سکندر کے تین حروف نے زید کے منہ پر گویا طمانچہ دے مارا تھا۔ ''جب کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے سے دور رہو تو تمہیں دور رہنا چاہیے۔ نہ کہ بحث کرتے جاؤ۔ چلے جاؤ۔ یہاں سے۔''

زید نے ضبط سے سرخ پڑتی نگاہیں سورج پر جمائیں تو آنکھوں میں شدید جلن کے باعث نمی چھا گئی، اذیت کی انتہا تھی مگر پھر بھی ان لفظوں کی شدت سے کم جو سکندر نے کہے تھے۔ سکندر نے آج ایک ہی جھٹکے سے اسے دور کر دیا تھا۔ وہ جو باپ کے بعد ان کے لیے باپ بن گیا تھا۔ دوست ہم زاد جس سے وہ دونوں بھائی بلا جھجک ہر بات منوا سکتے تھے۔ آج وہی کہہ رہا تھا کہ اس کے معاملے سے دور رہو۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تب ہی تین پہیوں کی بائیک اس کے پاس رکی۔

''پاگل ہو گئے ہو زید؟'' فیروز نے اسے جھنجھوڑا۔

اس کا لہجہ گرلایا۔ بھائی

''کاش ہو جاتا۔''

''ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟''

''مجھے تمہاری حالت ٹھیک نہیں لگ رہی گھر چلو۔''

''ابھی نہیں۔''

''میں کہہ رہا ہوں زید! تم گھر چلو۔'' فیروز کو اس کی حالت تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

''مجھے نہیں جانا۔'' اس بار انداز ضدی تھا۔

''ٹھیک ہے پھر میں بھی ادھر ہی ہوں۔'' فیروز نے بھی اسی کے انداز میں کہتے ہوئے نگاہیں سڑک پر جمائیں۔

''پلیز چاچو! آپ جائیں میں آجاؤں گا۔'' وہ روہانسا ہوا۔

''بالکل بھی نہیں جب تک تم یہاں ہو میں بھی ادھر ہی رہوں گا۔''

ان کے اٹل انداز پر اسے ماننا ہی پڑا اور اگلے پچیس منٹ بعد وہ فریش ہو کر چاچو کے کمرے میں ان کے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ جبکہ وہ افسردگی سے بول رہے تھے۔

''جب بھائی نے بدلے کے لیے اس لڑکی کے ساتھ میرا نام لیا تو میں نے سنتے ہی انکار کر دیا تھا۔'' زید نے نگاہیں ان کے چہرے پر جمادیں۔

''کیونکہ میں اپنے ادھورے وجود کا بوجھ کسی کے ناتواں کندھوں پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔''

زید نے بے ساختہ ان کے نچلے دھڑ کی طرف دیکھا۔

آٹھ برس قبل ایک بھیانک حادثے میں جہاں زید نے مشفق باپ کو کھویا تھا۔ وہیں وہ حادثہ فیروز چاچو کو بھی عمر بھر کے لیے معذور کر گیا تھا۔ ڈی آئی خان سے واپسی پر فیضان اور فیروز کی گاڑی گہری کھائی میں گری تھی۔ جس کے باعث فیضان تو موقع پر ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے جبکہ فیروز دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئے تھے۔

کیا بتاؤں تو زید مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا یہاں اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی لیے انکار کر دیا کہ میں اسے اس کا حق دلوا بھی نہیں سکتا تھا تو بھائی نے سکندر کا نام تجویز کر دیا۔ تم جانتے ہو، سکندر نے صرف شکل ہی دونوں بھائیوں (سفیان اور عارف) جیسی نہیں پائی۔ عادات میں بھی ان کے ہی کے جیسا ہے۔

وہ نرمی سے مسکرائے۔ ''بالکل عارف بھائی والی ضدی طبیعت اگر کسی بات پر اڑ جائے تو کسی کی مجال نہیں کہ اسے فیصلے سے ہٹنے پر مجبور کر سکے۔ اس نے چاچو کے چہرے سے نگاہ ہٹائی اور لیٹ گیا۔

''بہت عجیب طبیعت ہے تمہارے بھائی کی اخروٹ جیسی۔'' وہ بہت نرمی سے بھتیجے کا ذکر کر رہے تھے پھر زید کی طرف دیکھا۔

''ویسے ایک بات ہے زید! ہے تو کھڑوس مگر یار ہے وہ بہت پیارا۔''

وہ ہنسے تو زید بھی مسکرا دیا۔ بلاشبہ وہ بہت ہینڈسم اور وجیہہ نوجوان تھا چھ فٹ قد اور شفاف رنگت کھڑی مغرور ناک ہلکی سرمئی پرکشش آنکھیں نجانے اس کے چہرے میں کیسا چارم تھا جو دل اس کی جانب کھینچتا تھا جتنا بھی غصہ ہو اس کی صورت دیکھتے اڑن چھو ہو جاتا۔

''آپ کہہ رہے تھے، بھائی کی طبیعت تایا ابو کی طبیعت جیسی ضدی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا میں نے تو کبھی نوٹ نہیں کیا ایسا؟''

''تایا ابو اور ضدی طبیعت بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

''تم آپا والے واقعہ کو بھول گئے ہو؟'' ان کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔

''پھوپھو کا کیسا معاملہ؟'' وہ چونکا۔ ''کبھی دیکھا نہیں انہیں۔ وہ کہاں ہیں؟''

''دیکھ بھی کیسے سکتے ہو بائیس برس قبل انہیں دیس نکالا دیا جا چکا ہے۔'' انہوں نے افسردگی سے

WOMEN SKILLS GROUP

کہتے نگاہیں چھت پر لگائیں۔

"پلیز چاچو! بتائیں نا یہ کیا معاملہ ہے؟" زید متجسس ہوا۔ فیروز نے گہری سانس لیتے اس کی طرف دیکھا۔

"وہی معاملہ جو روایتی جاگیردار گھرانوں کا ہوتا ہے۔ صفدر ملک بھائی صاحب کے ہی بہترین دوست تھے نجانے انہوں نے کیسے آپا کو دیکھ لیا پھر عزت سے رشتہ بھیجا مگر بھائی صاحب نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا اور انکار کر دیا۔ لیکن ابا جی نے ان کے بارے میں چھان بین کی اور رشتہ قبول کر لیا اس بات کو بھائی صاحب نہیں بھولے ابھی تک۔"

"کمال ہے۔" زید حیران ہوا۔

"تم اس قصے کو چھوڑو۔" فیروز نے اسے ٹوکا۔

"تم کیا چاہتے ہو سکندر کے معاملے میں؟"

"میں! میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ افسردہ ہوا۔

"پھر بھی پتا تو چلے؟" زید نے سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں چاہتا ہوں بھائی در عدن کو بحیثیت بیوی قبول کریں۔"

"کر تو لیا ہے قبول، وہ بھی تین بار۔ مزید کیا کرے بھئی؟"

"اسے قبول کرنا کہتے ہیں۔" زید متاسف ہوا۔ "خود شہر میں ڈیرا جما رکھا ہے بیوی کو ملازمہ کی حیثیت دے کر کال کوٹھڑی میں ڈالا ہوا ہے۔ آپ نے اس لڑکی کی حالت دیکھی کیسی خستہ اور اجڑی ہوئی ہے۔" اس کا لہجہ شکایتی تھا۔ "چاہے جیسے ہی حالات میں کی لیکن چاچو وہ اب اس گھر کی بہو ہے۔"

"دیکھو سب سمجھ رہا ہوں مگر وہ بھی اڑ گیا ہے کہ اگر اس لڑکی کو سچائی پتا چلی تو یہ کسی کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔" زید نے ان کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

"آپ کو بھی تو غصہ ہوگا عدن پر؟"

"مجھے کیوں ہوگا؟" وہ حیران ہوئے۔

"اس کے باپ کی وجہ سے ہم نے سیف کو کھو دیا۔"

"غصہ تو ہے مگر اس کے باپ پر جوان بیٹا کھونا آسان نہیں مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ جو لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا اور میں ایسے مردوں کی مردانگی پر لعنت بھیجتا ہوں جو خود کو بچانے کے لیے بہن بیٹیوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ سنا تو یہاں تک ہے کہ بہت نازوں سے پلا تھا بچی کو اور صورت حال یہ ہے کہ پلٹ کر نہیں پوچھا کہ آیا وہ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔"

"تم دعا کرو زید سکندر کا دل اس بچی کے لیے نرم ہو جائے۔"

"اور دل نرم کیسے ہوتے ہیں؟" زید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"محبت سے۔" ترنت جواب پر وہ چونکا۔

"محبت؟"

"ہاں محبت اس کے علاوہ کوئی جذبہ انسان کا دل نرم نہیں کر سکتا۔"

"اور محبت کیسے ہوتی ہے؟"

"محبت کی نہ تو وجوہات ہوتی ہیں نہ علامات کہ یہ کوئی مرض نہیں۔" وہ شرارتاً بھتیجے کی طرف دیکھتے مسکرائے۔ "یہ تو بس ہو جاتی ہے اور جب ہو جاتی ہے تو انسان کو بدل بھی دیتی ہے۔"

"تو اب ہمیں دعا مانگنی چاہیے کہ صاحب کو بھی محبت ہو جائے۔" زید ہنسا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

"جی بالکل ویسے ایک حقیقت اور بھی ہے۔ بتاؤں تمہیں؟" زید نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شرارت کا عکس بہت واضح تھا۔

"ویسے یہ جو موم کا دل رکھنے والے لوگ خود پر مصنوعی سختی کا خول چڑھا لیتے ہیں۔ اسے اتارنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

زید نے چند لمحے ان کا جگمگ کرتا چہرہ دیکھا پھر سمجھنے پر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"صحیح کہا۔"

☆☆☆

"ایک کپ اسٹرونگ سی چائے بنا دیں۔" اگلی صبح اس نے کچن میں مصروف عدن سے کہا تو وہ پلٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ نگاہوں میں نرم سا تاثر تھا۔ زید نے اچنبھے سے ان تاثرات کو نوٹ کیا۔ جس چہرے کو دیکھ اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے تھے اس کے لیے ایسے نرم تاثرات باعث حیرت ہی تو تھے۔

"السلام علیکم کیسے ہیں آپ؟"

"وعلیکم السلام فائن!" وہ سنبھلا۔ "مجھے تمہاری یادداشت پر شک ہے در عدن! کہیں کھو تو نہیں گئی؟ یا پھر میری شکل بھول گئی ہو۔ میں زید ہوں۔" اس اطلاع پر وہ مسکرا دی۔

"میری یادداشت الحمد للہ سلامت ہے بہت دنوں بعد کسی ایسے انسان کو دیکھا ہے جسے سزا کے دنوں سے قبل دیکھا تھا تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

زید کو اس کے لہجے سے خوف آیا۔

"عدن میں ریکویسٹ کرتا ہوں پلیز میرے بھائی کے لیے کبھی بد دعا مت کرنا۔" وہ ملتجی ہوا تو عدن حیران رہ گئی۔

"میں ایسا کیوں کروں گی؟" اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا صفیہ وہاں آ گئیں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ یہاں سے۔"

زید جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔

"اور لڑکی۔" اب انہوں نے عدن کو گھورا۔

"تم احمد کے کپڑے استری کرو۔"

اور اس احمد نام نے دل کی بستی کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

"یا اللہ آج اس شخص سے سامنا نہ کرانا۔ مجھے اس آزمائش میں مت ڈالنا۔ کسی کے نکاح میں ہوتے ہوئے میں نامحرم کو سوچتی ہوں۔" وہ کمرے کی طرف جاتے ہوئے گڑگڑا کر دعا گو تھی۔

"مگر آپ تو جانتے ہیں نا میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔" (گویا صفائی دی)۔ "کاش وہ شخص اس وقت کمرے میں ہی ہو۔ اسے ایک نظر ہی سہی دیکھ تو لوں۔"

دہلیز تک پہنچتے اپنی سابقہ دعا کو فراموش کرتے اس شخص کو دیکھنے کی چاہ نے اسے بے بس کیا تو پھر دعا مانگی۔ اپنی بے بسی پر آنکھیں بے ساختہ نم ہوئیں۔ تیزی سے پلکیں جھپک کر نمی اندر اتارتے کھلے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ نگاہ سیدھی بیڈ کی طرف گئی جہاں کپڑوں کو ہونا چاہیے تھا مگر کمرے کا مکین بھی موجود نہیں تھا۔

"اب کیا کروں؟" وہ کراہی۔ نجانے کیا چیز اسے رُلا رہی تھی۔

تب ہی ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا۔ خوشبو کا مخصوص جھونکا اندر آیا تو نگاہ جھک گئی۔ اس کے سامنے ایک چٹ بیڈ پر پھینکی گئی، عدن نے چٹ اٹھائی جس پر ایک جملہ لکھا تھا۔

"بلیک شرٹ پریس کر دو۔" اس نے نگاہ اٹھائی، وہ رائٹنگ ٹیبل کے پاس کھڑا تھا۔ ٹراؤزر پر سفید ٹی شرٹ بے ترتیب بال الماری سے شرٹ لے کر پلٹی تو وہ برہم تاثرات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ (کیا خطا ہو گئی؟) اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتے خود آگے بڑھ کر نئی شرٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی اور فضا میں ہاتھ سے زگ زیگ کرتے جانے کیا کہا۔ عدن پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ احمد اس سے مخاطب تھا (یا خدا) مگر اس کی بد قسمتی کہ اسے اشاروں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی اور سامنے والے کو بھی اس کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھینس کے سامنے بین بجا رہا ہے، اسی لیے تیزی سے رائٹنگ ٹیبل پر جھکتے لکھ کر اس کے سامنے کیا۔

"جلدی کرو میں لیٹ ہو رہا ہوں۔"

"مم میں ابھی لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکلی اور جب احمد شاور لے کر نکلا عین اسی لمحے وہ بھی اندر داخل ہوئی تھی۔ شرٹ لیتے سر ہلایا (تھینک یو)۔

"ناشتہ یہیں لے آؤں صاحب؟" اس

WOMEN SKILLS GROUP

نے سرکونفی میں جنبش دی۔
احمد نے سوالیہ ابرو اٹھاتے اسے گھورا مگر عدن پر ذرا جو اثر ہوا ہو۔ تاسف سے سر جھٹکتے نوٹ پر جملہ لکھتے اس کی نگاہوں کے سامنے کیا۔
"تم جاؤ۔ مجھے شرٹ چینج کرنی ہے۔" عدن پر گھڑوں پانی پڑا۔ وہ گولی کی سی تیزی سے کمرے کی چوکھٹ عبور کر گئی۔

☆☆☆

"آخر تمہیں ایسی بے مصرف چیزوں کی ضرورت کیوں پیش آ گئی ہے۔"
درعدن نے رومیہ کو بری طرح گھورا۔ وہ عدن کو زبردستی شاپنگ کے لیے گھسیٹ لائی تھی۔ اس نے بہت انکار کیا مگر وہ رومیہ ہی کیا جو کسی کی مان لے۔ فون پر اس کے بابا سے اجازت لے کر وہ اسے اپنے ہمراہ لے آئی تھی۔ ایک دو ڈریسز کے بعد پچھلے پچیس منٹ سے وہ ڈیکوریشن پیسز کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھی جبکہ درعدن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔
زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا ان کی دوستی کو درعدن بلال کا تعلق گوٹھ سیراب نامی گاؤں سے تھا۔ چار بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تو باپ کی جان بھی عدن میں مقید تھی۔ وہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو حویلی کی چار دیواری سے باہر یوں پڑھائی کے سلسلے میں ہاسٹل میں مقیم تھی۔ سرو قد، دبلی پتلی، کھلتی گندمی رنگت، گہری سبز آنکھیں۔ لمبے سیاہ گھنے بال مجموعی طور پر وہ بہت پرکشش تھی جس کی ذات میں باپ بھائیوں —— کا دیا بھروسا جھلکتا تھا۔ اس کا وقار رکھ رکھاؤ اسے سینکڑوں میں ممتاز کرتا تھا۔ صنف مخالف کے لیے درعدن بلال چیلنج تھی۔ جبکہ رومیہ شہر ہی میں رہتی تھی۔ اس وقت رومیہ سیاہ اور زرد پاجامہ فراک میں ملبوس تھی۔
وہ جھنجلا کر ایک جگہ ٹک گئی جبکہ رومیہ آگے بڑھ گئی۔ تب ہی رومیہ نے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اس نے قدم بڑھائے پھر بوکھلا کر سر سے
ڈھلکتی چادر پر ہاتھ رکھ کر روکنا چاہا مگر چادر ڈھلک کر شانے تک آ گئی تھی۔ وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ پلٹی اور اپنے پیچھے موجود لڑکے کے چہرے پر جس کے ہاتھ میں چادر کا پلو تھا پوری قوت سے تھپڑ دے مارا، چٹاخ کی زوردار آواز پر رومیہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی متوجہ ہوئے جبکہ عدن تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ رومیہ بھی تیزی سے پیچھے لپکی۔
"عدن! پلیز رکو۔" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ثناہ کی آواز سے دروازہ بند کیا۔
"مائی گاڈ اتنا غصہ۔" رومیہ نے خود کو سیٹ پر گراتے جھرجھری لی پھر عدن کا سرخ چہرہ دیکھا۔
"تم نے بنا سوچے سمجھے اس لڑکے کو تھپڑ دے مارا۔"
"بنا سوچے سمجھے؟" عدن نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔
"اتنی چھوٹی سی بات کے لیے تم نے اتنا شدید ردعمل دکھایا۔"
"چھوٹی سی بات؟ کسی کے سر سے یوں سرعام چادر اتارنے کا مطلب جانتی ہو تم رومیہ؟" اس نے دانت پیسے۔
"میں جانتی ہوں عدن! مگر وہ لڑکا بے قصور تھا۔ اس نے چادر نہیں کھینچی تھی۔"
"تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو جبکہ پلو میں نے خود دیکھا تھا اس کے ہاتھ میں۔"
"بعض اوقات آنکھوں دیکھا بھی سچ نہیں ہوتا عدن! میں دیکھ رہی تھی تمہاری چادر آرائشی گل دان میں اٹک گئی تھی لیکن اس سے قبل کہ وہ گرتا اس لڑکے نے گل دان سنبھالتے ہوئے پلو چھڑا لیا اور بدلے میں تم نے اسے ہی اتنے لوگوں میں بے عزت کر دیا۔"
"تم جو بھی کہو۔ میں جانتی ہوں۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔"
"یار! میں سچ کہہ رہی ہوں وہ لڑکا ایسا نہیں
ہے۔" رومیہ روہانسی ہوئی۔
"تم اس کی اتنی فیور کیوں کر رہی ہو۔" عدن نے اسے گھورا۔ "وہ تمہارے مامے کا پتر ہے؟"
رومیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
"تم تو واقعی بہت پینڈو ہو۔ میرے ماموں کا ہی بیٹا ہے۔"
اس نے شرارت سے عدن کا گال چھوا تو وہ اونہہ کہہ کر رہ گئی۔
کتابوں کی دکان کی پارکنگ میں گاڑی روکتے رومیہ اسے یہ کہہ کر وہیں چھوڑ گئی تھی کہ تمہیں ساتھ لے جانا رسک سے کم نہیں اسی لیے یہیں انتظار کرو۔
اسے کون سا شوق تھا جانے کا اسی لیے مطمئن سی بیٹھی تھی۔ ان کی گاڑی کے بالکل پاس سے گزر کر سرمئی رنگ کی گاڑی عین سامنے آ کر رک گئی۔ اس نے بلا ارادہ اس طرف دیکھا ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شخص کی سنہری روئیں سے بھری مضبوط کلائی پر بندھی بیش قیمت گھڑی کا ڈائل دھوپ کے باعث چمک رہا تھا۔ دروازہ کھول کر ایک دراز قد وجیہہ نوجوان باہر نکلا۔ ڈریس شرٹ کے کف مڑے ہوئے تھے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتا وہ گاڑی لاک کیے بنا آگے بڑھ گیا۔
درعدن بلال ٹرانس کی سی کیفیت میں اس منظر میں گم تھی۔ کیا خاص تھا اس میں؟ وہ اپنی دھڑکنوں کی بدلتی ردھم پر حیران تھی تبھی رومیہ واپس آئی مگر اپنی گاڑی میں آنے کے بجائے اس گاڑی کے شیشے کے ڈیش پر جھکی فائل کا صفحہ پلٹ رہی تھی تب ہی وہ شخص تیزی سے پلٹ آیا۔ رومیہ کے ساتھ عدن کا چہرہ بھی فق ہوا۔ وہ شخص بہت عجلت میں ان کی طرف دھیان دیے بنا گاڑی بھگا لے گیا۔

☆☆☆

"زید! آج تم شہر جاؤ گے؟" ماں کے پوچھنے پر اس نے فون سے نگاہ ہٹائی۔
"نہیں اماں! خیریت کوئی کام تھا آپ کو؟"
"ہاں بس تھوڑی خریداری کرنی تھی۔" وہ اس کے پاس بیٹھیں تو زید نے فون رکھ دیا۔
"ٹھیک ہے سکندر کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔" زید نے پانی لاتی عدن کی طرف دیکھا سکندر کے ذکر پر بھی اس کا چہرہ بے رنگ ہی رہا تھا۔
"ایک تو یہ لڑکا شہر اور ڈیروں کے چکر میں گھن چکر بنا ہوا ہے، ماں تو شکل دیکھنے کو ترس جاتی ہے۔" زید ان کے شکایتی انداز پر مسکرایا۔
"شکل جو اتنی پیاری ہے، سنو عدن!" اس نے ساختہ پتی عدن کو پکارا۔ تب ہی تائی بھی وہاں چلی آئیں۔ انہوں نے بغور زید کا انداز دیکھا۔
"میرا اسیل چارجنگ پر لگا دو اور کپڑے پریس کرو۔ مجھے اماں کے ساتھ جانا ہے۔"
"جی!" اس نے سعادت مندی سے کہتے موبائل لے لیا۔
"کپڑے استری کرنے سے قبل شریفہ سے کہو۔ سبزی لے آئے اور تم چائے بنا دو۔" عابدہ کے حکم پر سر ہلاتے ابھی پلٹی تھی کہ تائی کے "سنو لڑکی" کہنے پر رکنا پڑا۔ گہری سانس لیتے ان کی طرف دیکھا۔
"چائے بنا کر پچھلے صحن میں کنویں سے دو بالٹی نکال لاؤ۔"
اس حکم پر اس کا چہرہ فق ہوا کیونکہ اسے گہرے پانی سے ڈر لگتا تھا۔
"آپ نے عدن کو کنویں سے پانی نکالنے کا کیوں کہا؟" زید نے اس کے جاتے ہی حیرت سے پوچھا۔
"کیونکہ اس لڑکی کو کنویں سے ڈر لگتا ہے؟"
"یہ جانتے ہوئے بھی آپ نے اسے وہاں بھیجا، کیوں؟" وہ حیران تھا۔
"کیونکہ اسے تکلیف میں دیکھ کر مجھے سکون ملتا ہے۔" ان کے لہجے کی سفاکی پر وہاں سکوت چھا گیا۔

WOMEN SKILLS GROUP

☆☆☆

"شکر ہے اللہ کا۔" گاڑی جب آگے بڑھی تو رومیہ نے کلمہ شکر پڑھا تو عدن بھی چونک کر حواس میں لوٹی۔

"تم نے اتنی غیر اخلاقی حرکت کیوں کی رومی؟ اگر وہ شخص دیکھ لیتا تو؟"

"تو دیکھ لیتا۔" وہ مسکرائی۔ "یار نام معلوم کرنا تھا اس بندے کا۔"

وہ بس نام جاننا چاہتی تھی اس شخص کا جس پر پڑنے والی پہلی نگاہ نے ہی اسے بے بس کر دیا تھا۔ مگر اس کے شانوں پر باپ بھائیوں کی عزت اور بھروسے کا بوجھ تھا اور اس کا زندگی میں ایک ہی اصول تھا جان جاتی ہے چلی جائے مگر بھروسا نہیں ٹوٹنا چاہیے اور نام بنا کوشش کے اگلے روز رومیہ نے اسے بتا دیا تھا۔

وہ دھپ سے عدن کے پاس بیٹھی۔

"بندہ خوب صورت اور ڈیشنگ ہو اور مغرور نہ ہو بھلا کیسے ممکن ہے۔"

"کون مغرور؟" عدن نے جرنل بند کرتے حیرت سے پوچھا۔

"احمد اور کون؟ پہلے تو سینکڑوں لوگوں میں اسے ڈھونڈا پھر بیسیوں فرینڈ ریکوسٹ بھیجیں اور آج موصوف کا انتہائی جارحانہ جواب آیا۔" آئندہ اتنی جرأت نہ کروں کیونکہ موصوف لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتے۔" اس نے منہ پھلایا۔

"کون احمد؟" عدن کی حیرت ہنوز تھی۔

"ارے وہی جو اس روز بک شاپ کے باہر ملا تھا۔"

"اوہ" اس نے خود کو لاپروا ظاہر کرتے ہوئے شانے اچکائے۔

☆☆☆

"تمہیں ہوا کیا تھا؟" احمد نے سامنے بیٹھے زید کا سرخ چہرہ دیکھتے پوچھا جو بمشکل اپنا غصہ ضبط کیے ہوئے تھا ہوا کہ کب سے ضبط کیے بیٹھا ارسل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ زید کو تھپڑ ملنے کے بعد ارسل نے ہی اسے ارجنٹ بلایا تھا اور اب وہ تینوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"ہائے ظالم۔" ہنستے ہوئے ارسل کو زید نے تھپڑ مار کر چپ رہنے پر مجبور کیا۔ "مار ڈالا ظالم کسی دوسرے کا غصہ مجھ پر کیوں نکال رہے ہو؟" پھر احمد کی طرف دیکھا۔

"بہت عزت ہوئی ہے آج آپ کے بھائی صاحب کی۔" زید نے خفگی سے منہ پھلایا۔

"عزت پر منہ کون پھلاتا ہے یار؟" احمد نے حیرت سے پوچھا۔ جبکہ ارسل نے فوراً اسے تمام واقعہ کہہ سنایا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ دونوں نے بہت محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بہت عرصہ ہوا وہ یوں کھل کر ہنسنا بھول چکا تھا آج اس کا بے ساختہ پن انہیں خوشی دے گیا تھا۔ اس نے آنکھوں میں آیا پانی صاف کیا تو ارسل کو مصنوعی تاسف ہوا۔

"پہلا بھائی دیکھا ہے جو بھائی کی بے عزتی پر یوں خوش ہو رہا ہے۔"

"یار! پہلی بار سنا ہے کہ کوئی لڑکی زید صاحب کی پرسنالٹی پر فدا نہیں ہوئی اسی لیے اچھا لگ رہا ہے۔ امپریسو کاش میں وہاں ہوتا۔"

"اگر وہاں ہوتے تو کیا کرتے؟"

"میں تمہاری بے عزتی کا بدلہ لیتا۔" فوری جواب پر ارسل اش اش کر اٹھا۔

"قربان جاؤں آپ کے پیار پر۔" وہ چند لمحے سنجیدہ ہوا پھر شرارت سے دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ویسے محترمہ دیکھنے میں کیسی تھیں؟" چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہاتھ سے سوالیہ اشارہ کیا تو ارسل اور زید بے ساختہ ہنس دیے۔

☆☆☆

"عدن عدن، یار گڈ نیوز۔" رومیہ نے کینٹین میں عدن کو مسرت سے جھنجوڑا۔ دھپ سے اس کے سامنے بیٹھی، چہرہ جوش جذبات سے تمتما رہا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے کیوں اتنی پاگل ہو رہی ہو؟" عدن نے اسے گھورا۔

"یار بات ہی پاگل کرنے والی ہے۔" وہ بہت پرجوش تھی۔

"وہ میرے مامے کا پتر ہماری یونی آیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" عدن حیران ہوئی۔

"مطلب کہ اس روز وہ لڑکا۔" اس نے ہاتھ سے فضا میں اشارہ کیا۔ "ملا تھا نا ہمیں اس کا نام زید ہے اور وہ ہماری یونی میں مائیگریٹ ہو کر آیا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" عدن نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی میرے ماموں کے بیٹے کی یہاں موجودگی سے؟" رومیہ کو صدمہ ہوا۔

"بکواس نہیں۔" عدن نے اسے گھورا۔

"ہائے ظالم میں تو مر رہی ہوں، ماموں کے بچے سے ملنے کے لیے۔"

"رومیہ!" عدن اسے تنبیہ کرتے اٹھی۔

"اوکے اوکے سوری!" رومیہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔ کینٹین سے باہر آتے ہی پہلا سامنا زید سے ہی ہوا تھا۔ ارسل نے بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے تھوڑا سا رخ موڑ لیا۔ عدن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ جبکہ زید کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔

"محتاط رہنا کیونکہ میں اپنی بے عزتی بھلاتا نہیں ہوں۔ اسی لیے وارن کر رہا ہوں۔"

"مجھے اپنی رعایا سمجھ کر دھمکانے کی کوشش نہیں کریں محترم" عدن کون سا کم تھی۔

"ریلیکس بھئی اب آپ لوگ بچوں کی طرح شروع مت ہو جائیں۔" ارسل نے بیچ بچاؤ کروانا چاہا۔

"سمجھنے کی ضرورت آپ کے دوست کو ہے جو سب کو اپنی رعایا سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔"

"میم پلیز! اب آپ زیادتی کر رہی ہیں۔" ارسل نے زید کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھتے ہوئے احتجاج کیا۔

"بولنے دو ارسل! میں بھی تو دیکھوں محترمہ کہاں تک بول سکتی ہیں۔"

"میں آپ جیسے لوگوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی۔" اس بار لہجے میں موجود حقارت نے ارسل اور زید کے ساتھ رومیہ کے چہرے کو بھی سرخ کر دیا۔

"عدن! تم ہوش میں رہ کر بات کرو۔" رومیہ نے بے ساختہ ٹوکا۔

"میں ہوش میں ہی ہوں اور بددماغ مغرور لوگوں کے حواس بھی ٹھکانے لگانا جانتی ہوں۔"

"بہت ہو گیا۔ بہت بول لیا آپ نے۔" زید ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کروایا۔ "یاد رکھنا آئندہ اگر ایسے لہجے میں مجھ سے بات کی تو میں تمہارے لڑکی ہونے کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔"

"اور جب میں لحاظ کرنے کی عرضی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو بے شک مت کیجیے گا کیونکہ میں آپ جیسے لوگوں کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں۔"

اس بار اس کے لہجے میں غرور کا عنصر نمایاں تھا شاید وہ بھول چکی تھی کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے تو اب اس کا غرور اسے زید کے سامنے کیسے جھکانے والا تھا اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہونے والا تھا۔

☆☆☆

گنڈ سہراب کے نام سے مشہور یہ گاؤں جس کے اطراف سرسبز کھیت، آموں، کینو اور امرود کے باغات تھے۔ گاؤں کی مشرقی جانب چوہدری حیات کی حویلی تھی جس میں ان کے بیٹے، سفیان، عارف اور فیروز رہائش پذیر تھے۔ چوہدری حیات اور ان کی بیگم کا عرصہ قبل انتقال ہو چکا تھا اب حویلی میں عارف چوہدری اپنی دو بیٹیوں اور سفیان تین

WOMEN SKILLS GROUP

بیٹیوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے جبکہ فیروز کا ایک ہی بیٹا تھا۔ گوٹھ سہراب کے مغربی جانب چوہدری بلال کی حویلی تھی جس میں وہ اپنے تین شادی شدہ بیٹوں اور بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھے ایک گاؤں میں رہنے اور ایک ہی ذات سے تعلق کے باوجود دونوں خاندانوں میں پچھلے تیئس سالوں سے اختلافات چل رہے تھے۔ فیروز کے لیے چوہدری بلال کی بہن کے رشتہ سے انکار کی صورت میں چلنے والی مخالفت اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے نام سننے کے بھی روادار نہ تھے۔

اس گاؤں میں ہر سال بیل ریس کا مقابلہ ہوتا تھا جس میں آس پاس کے گاؤں سے بھی لوگ شریک ہوتے تھے مگر نگاہیں دونوں چوہدریوں کے بیلوں پر لگی ہوئی تھیں موجودہ سال ریس چوہدری بلال کے بیل پہلوان کے نام رہی تھی۔ جیت کی خوشی میں کی گئی فائرنگ کی زد میں آ کر عارف چوہدری کا چودہ سالہ بیٹا سیف جاں بحق ہو گیا تھا۔

چوہدری عارف نے دیت لینے سے انکار کر دیا کہ پیسے کی کمی نہ تھی۔ اگر عارف اپنے جانے والے بیٹے کو روئے گا تو رونا بلال چوہدری کو بھی پڑے گا اپنی زندہ بیٹی کے لیے، چوہدری بلال کی آنا کانی پر انہوں نے دو ٹوک کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے بیٹی نہیں دینی تو بیٹا دے دو تاکہ اسے اپنے ہاتھوں سے گولی مار کر خون کا بدلہ لے لوں۔"

اور یہاں چوہدری بلال ہار گئے کہ اس صورت بیٹی زندہ تو رہے گی اور یوں درعدن بلال کو آنا فانا بلا کر دو کپڑوں میں چوہدری عارف کی حویلی رخصت کر دیا گیا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ عدن کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ زید اور ارسل اسے بھابھی کے روپ میں دیکھ کر فوراً واپس چلے گئے تھے۔ وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں اس سے نفرت تھی بلکہ وہ اس لڑکی کا جھکا سر نہیں دیکھ سکتے تھے۔

گھر آتے ہی جب اسے تائی کے سامنے کھڑا کیا گیا تو انہوں نے پوری قوت سے اسے تھپڑ مارا وہ گر گئی۔ صفیہ تائی نے اسے بالوں سے گھسیٹ کر دوبارہ سامنے کھڑا کیا۔ عابدہ نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر لب بھینچ لیے اس وقت مرد حضرات گھر میں نہیں تھے۔

"بھابھی پلیز۔" عابدہ نے عدن کے نرم و نازک گالوں پر انگلیوں کا نشان دیکھتے انہیں روکنا چاہا "تم مت بولو عابدہ! یہ میرے بیٹے کے قاتلوں کی بیٹی ہے۔ اسے تکلیف ہو گی تو وہ بھی تڑپیں گے جیسے میری مامتا تڑپی ہے" انہوں نے عدن کی چوٹی کو جھٹکا تو وہ بلبلا کر رہ گئی۔ اس کی ازلی ضد اور غصہ عود کر آیا۔ تو صفیہ کے ہاتھ ایک دم جھٹکے۔

"آپ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتیں۔ ایک لمحے کے لیے تو دونوں خواتین اس کی جرات پر ہکا بکا رہ گئیں۔

"اگر آپ نے آئندہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی کوشش کی تو پھر دیکھیے گا۔ میں کوئی کمی کمین نہیں ہوں جسے آپ ٹارچر کریں۔"

"ورنہ کیا کر لو گی تم؟" صفیہ غرائیں۔

"یہ تو آپ کو وقت ہی بتائے گا۔" اس کا انداز چیلنجنگ تھا۔

"وقت کو چھوڑو تم مجھے ابھی بتاؤ کیا کر لو گی تم؟" انہوں نے اسے جھنجھوڑا۔ پھر ایک جھٹکے سے چھوڑ کر رضیہ کو پکارا جو اگلے ہی پل حاضر ہو گئی۔

"جی بی بی!"

"لے جاؤ۔ اسے اور کام پر لگاؤ اپنے ساتھ رہے گی بھی تمہارے ہی ساتھ۔" عدن بھی جانے کیا سوچ کر چپ رہ گئی، وہ رضیہ کے ساتھ جو تقریباً اس کی ہم عمر تھی اور حویلی کی کل وقتی ملازمہ تھی اس کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ حویلی کی پچھلی جانب اس کا کمرہ تھا جہاں کنواں اور انواع و اقسام کے پودے تھے۔ پانچ روز اس نے بنا چوں چرا اس طرح کے تمام کام رضیہ کے ساتھ سرانجام دیے اس نے کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اپنی حویلی میں اور اب جب کر رہی تھی تو ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے۔ پانچویں دن گیارہ بجے وہ اڑیل گھوڑی کی طرح تائی کے سامنے کھڑی تھی۔ رضیہ کا خستہ سا سرمئی سوٹ پہنے الجھے بال، بے رونق چہرہ۔

"مجھ سے نہیں ہوتے یہ سب کام۔" اس کے انداز پر عابدہ نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے بے ساختہ چہرہ جھکا لیا۔ تب ہی فیروز چاچو وہیل چیئر پر وہاں آئے عدن انہیں دیکھ کر نروس ہوئی کہ بہر حال حویلی میں اس کا آج پہلی بار سامنا ہوا تھا کسی مرد سے۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے رسانیت سے پوچھا۔ بادامی شلوار سوٹ میں ملبوس باوقار سے وہ بہت وجیہہ انسان تھے البتہ ان کی معذوری نے عدن کو ایک پل کے لیے ساکت کر دیا۔ پھر سر گوشی میں کچھ کہا۔

"کیا بات ہے، ابھی کچھ کہہ رہی تھیں آپ؟" انہوں نے اتنی نرمی سے پوچھا تو عدن نے ان کی طرف دیکھا تو جانے کیوں اسے لگا وہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہے۔ خیال کو جھٹکتے اس نے اپنے ہاتھ ان کے سامنے پھیلا دیے۔

"مجھ سے گھر کے کام نہیں ہوتے اور تائی جان۔"

"بکواس بند کرو۔" صفیہ چلائیں "میں کوئی تائی نہیں ہوں تمہاری اور نہ ہی تمہارا کوئی رشتہ ہم سے۔ اس گھر میں سب تمہارے لیے صاحب اور بی بی کا درجہ رکھتے ہیں۔ آئندہ ایسی غلطی مت کرنا۔"

"بھابھی پلیز۔" فیروز صاحب نے اس کی گلابی نرم ہتھیلیوں پر آبلے دیکھتے افسوس سے کہا۔

"تم مت بھولو فیروز! یہ میری مجرم ہے۔ میرے بیٹے کے قاتلوں کی بیٹی تو اسے سزا دینے کا حق بھی میرا ہے اور جب سکندر کو کوئی اعتراض نہیں تو تم کیوں اس معاملے میں بول رہے ہو۔" فیروز حیران رہ گئے اور بے ساختہ پلٹے مگر سکندر کا نام سنتے درعدن جھٹکے سے پلٹ کر دہلیز پھلانگ گئی۔

عدن کا ضدی پن عود کر آیا۔ وہ دھپ سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی۔ "کیوں؟ جب میں نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تو سزا کیوں بھگتوں؟ میں بھی دیکھتی ہوں کیا کر لیتی ہیں بڑی بی بی۔"

وہ جھٹکے سے اٹھ کر کچن میں آئی جہاں رضیہ برتن دھو رہی تھی، ٹھنڈے پانی کا گلاس پیتے ہوئے اس نے رضیہ کو پکارا۔ موجودہ حیثیت کے باوجود اس کے لہجے اور انداز میں مالکانہ استحقاق تھا۔ رضیہ فوراً متوجہ ہوئی۔

"جی بی بی۔"

"وہ تمہارے صاحب کہاں ہوتے ہیں؟" نجانے وہ سکندر کا نام لیتے ہوئے کیوں جھجک گئی تھی۔

"کون سے صاحب بی بی؟" اس سے قبل کہ وہ کچھ بتاتی۔ صفیہ نے اسے پکار لیا۔ عدن نے بے جان ٹانگوں سے فرش پر بیٹھتے ہوئے گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے تھکان سے پلکیں موندیں تو جھم سے ایک دلکش چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تب ہی رضیہ واپس آ گئی۔

"توبہ احمد صاحب کے غصے سے تو اللہ ہی بچائے۔"

"کون احمد؟" عدن جھٹکے سے اٹھی۔

"چھوٹے صاحب اور کون؟" وہ نروٹھے پن سے بولی۔ "جتنے اچھے ہیں اتنے غصے والے بھی ہیں۔"

"میں آج کچھ بھی نہیں کروں گی رضیہ۔"

"ٹھیک ہے بی بی! میں کر لوں گی۔"

"تمہارے پاس کپڑے ہوں گے رضیہ؟ دراصل مجھے شاور لینا ہے۔"

"ہاں جی بالکل ہیں بلکہ ٹرنک میں پڑے ہیں نئے کپڑے پچھلے دنوں ہی احمد صاحب نے دلائے

WOMEN SKILLS GROUP

تھے۔ میں نے نہیں پہنے آپ پہن لیں۔''

''تم نے کیوں نہیں پہنے؟''

''قیمتی ہیں ناجی اس لیے۔ قیمتی لباس تو مالکوں کے لیے ہوتے ہیں۔''

''ایسے نہیں کہتے رضیہ! صاحب نے دلائے ہیں تو تم کو پہننے چاہیے تھے۔ وہ کتنے پیار سے لائے ہوں گے۔'' عدن نے نرمی سے سمجھایا تو وہ مسکرادی۔

''آپ بھی بالکل صاحب جیسی باتیں کرتی ہیں بی بی، مالک ہیں جی آپ لوگ۔''

''اگر تم غور کرو تو میں مالک نہیں ملازمہ ہی ہوں تمہارے ساتھ رہتی ہوں، نیچے سوتی ہوں اور تمہارے ہی کپڑے پہن رہی ہوں۔ تو مالک کیسے ہوئی؟''

''یہ تو جی ابھی بی بی صاحبہ کو غصہ ہے اسی لیے۔ جب ان کا غصہ اتر جائے گا تو آپ مالکن بن جائیں گی۔'' رضیہ پُریقین تھی۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔ دوبارہ وہ حویلی نہیں گئی۔

شام ڈھلے اس نے کھڑکی کھولی جہاں سے حویلی کا پچھلا صحن صاف نظر آتا تھا۔ سرسبز لان، کنواں اور پھولوں کی بہتات تھی۔ آج وہ شخص جانے کیوں بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ بار بار اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آرہا تھا جسے وہ بار بار جھٹک رہی تھی۔

اس نے تھک کر کھڑکی میں نصب سلاخوں پر پیشانی ٹکائی چند لمحوں بعد کسی عجیب احساس کے تحت نگاہ اٹھائی تو ششدر رہ گئی۔ سرمئی کاٹن کے شلوار سوٹ میں ملبوس وہ شخص اسے اپنا وہم ہی تو لگا تھا۔ بار بار پلکیں جھپکنے کے باوجود بھی وہ نگاہوں کے سامنے جوں کا توں موجود رہا تو اس نے بے ساختہ دونوں ہاتھ سختی سے لبوں پر جمالیے۔ وہ واقعی احمد ہی تھا۔ پھولوں کے جھنڈ کے پاس کان میں ہینڈ فری پھنسائے — وہ کچھ سن رہا تھا یا کسی سے بات کر رہا تھا۔ تب ہی اس نے رضیہ کو اس کی طرف دیکھا۔ نجانے وہ کیا بات کر رہے تھے پھر وہ پلٹ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

عدن تیزی سے حویلی کی طرف گئی نہایت دل جمعی سے بنا کوئی غلطی کیے رضیہ کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ لبوں پر دھیمی سی مسکان کھیلتی رہی۔

''حویلی میں تو جی صرف دونوں بیگم صاحبہ ہی ہوتی ہیں۔ بڑے صاحب اپنے کاموں پر ہوتے ہیں (عارف) وہ سرپنچ ہیں ناں اپنے گاؤں اور اردگرد کے بارہ گاؤں کے تو اسی لیے گھر بہت کم آتے ہیں۔ سکندر صاحب بھی ان ہی کے ساتھ مصروف ہوتے ہیں جب کہ چھوٹے صاحب شہر میں رہتے ہیں۔'' رضیہ مسلسل بولتے اسے آگاہ کر رہی رہی۔

آج عدن کو اس کا بلاوجہ بولنا برا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کی بتائی تفصیل سن رہی تھی۔ کھانے کی میز پر اس نے صفیہ تائی سے اپنی صبح والی بدتمیزی پر معذرت کی اور اپنی موجودہ حیثیت بطور ملازمہ قبول کرلی۔ ایک شخص کی موجودگی نے اس کے باغیانہ انداز، اکھڑ پن کو دبا دیا تھا۔

وہ اس حویلی کا مکین تھا عدن اس سے جڑے رشتوں کے درمیان موجود تھی۔ وہ شخص اسی حویلی میں پلا بڑھا تھا۔ یہ اس کی خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ اب اس کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔

رات جب وہ رضیہ کے پاس سونے کے لیے لیٹی تو آنکھیں بند کرتے ہی چھم سے وہ نگاہوں کے سامنے آگیا تو ______ وہ پل پوری جزئیات سمیت در آئے

''رضیہ!'' چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے دھیمے سے پکارا۔

''جی بی بی!''

''یہ جو احمد صاحب ہیں، کیا کرتے ہیں؟'' اس نے کروٹ بدل کر رضیہ کو دیکھا جس نے بے یقینی سے عدن کو دیکھا تھا۔

''کیا کرتے ہیں مطلب بی بی صاحبہ! شام کو بتایا تو تھا۔'' وہ حیران اور بے یقین تھی۔ اس کی اتنی لمبی تقریر کا شاید ایک لفظ بھی عدن نے نہیں سنا تھا۔

''تو دوبارہ بتادو ناں، وہ کیا کرتے ہیں؟'' عدن کو قدرے شرمندگی محسوس ہوئی۔

''شہر میں ہوتے ہیں جی پڑھاتے ہیں وہاں، بچوں کو جو بول اور سن نہیں سکتے۔''

''اسپیشل بچوں کو؟'' عدن متاثر ہوئی۔ ''واؤ۔''

''ان کے ایک اور بھائی بھی ہیں۔'' رضیہ نے پھر سے اسے آگاہ کرنا چاہا۔ ''ارقم نام ہے ان کا۔ اپنی ماں کے پاس ہیں تھوڑے دنوں تک آجائیں گے۔'' عدن حیران ہوئی، حویلی میں کتنے لوگ تھے جنہیں وہ نہیں جانتی تھی۔

''ارقم اور اماں کے پاس۔ کیا مطلب ہے تمہارا رضیہ؟''

''وہ ارقم صاحب فیروز صاحب کے پتر ہیں جب ان کی دو سکیں کی تھیں ناں تب ان کی بیوی نے طلاق لے لی۔ شہری کڑی تھی اب ارقم صاحب ہر ہفتے وہاں ماں سے ملنے جاتے ہیں۔ اس بار کچھ زیادہ عرصہ وہاں رہ گئے ہیں۔'' رضیہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

''اس کی عمر کتنی ہے؟'' عدن نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بارہ یا تیرہ سال کے ہوں گے۔''

''تو صاحب کھانے کے وقت کہاں گئے ہوئے تھے؟''

''وہ تو جی شام کو ہی چلے گئے تھے۔ کسی کام سے آئے تھے۔''

''اوہ۔'' اسے مایوسی ہوئی پھر کچھ یاد آنے پر رضیہ کی طرف دیکھا۔ ''صاحب تمہیں اشارے سے کیا دکھا رہے تھے؟'' اس بار رضیہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ اس نے حیرت سے عدن کی طرف دیکھا تھا۔

''دکھا نہیں رہے تھے بی بی بتا رہے تھے کہ وہ ادھر سے ہوتے ہوئے شہر چلے جائیں گے۔ بی بی صاحبہ کو بتادوں۔''

''مگر وہ بول تو نہیں رہے تھے، میں نے دیکھا تھا ان کے لب خاموش تھے۔'' عدن حیران ہوئی۔

''بی بی آپ کو نہیں پتا؟'' رضیہ اس سے زیادہ حیران تھی۔

''کیا نہیں پتا؟'' عدن بھی اٹھ بیٹھی۔

''یہی کہ احمد صاحب بول نہیں سکتے۔''

''کک...... کیا کہہ رہی ہو؟'' اس نے تیزی سے نم ہوتی آنکھوں کو پونچھا۔

''ہاں جی وہ بول نہیں سکتے، اشاروں سے بات کرتے ہیں اور جو اشارے نہیں سمجھتے، انہیں لکھ کر بتادیتے۔ مجھے تو بڑی اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے ان کی بات۔''

رضیہ فخریہ بتا رہی تھی۔ عدن نے لیٹ کر اس کی طرف سے کروٹ لے لی کہ تیزی سے بہتے اشک اس کے دل کی کیفیت عیاں کر رہے تھے، رضیہ چونکی۔

''کیا ہوا بی بی؟''

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' گرلاتا — لہجہ رضیہ ساکت رہ گئی۔

''آپ رو رہی ہیں؟'' اس نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور وہ روتی رہی۔ یہ حقیقت اس کے دل پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔ عجیب نہ تھا کہ دل شدت غم سے پھٹ جاتا۔ ضبط کی انتہا کو چھوتے وہ جھٹکے سے اٹھ کر رضیہ کے گلے لگ کر بلک اٹھی۔ رضیہ ساکت رہ گئی۔ وہ لڑکی تھی اور اس کا غم لمحے میں سمجھ گئی تھی۔

وہ جو صبح حویلی سے نکلی تھی، ضد اور غصے سے بڑی بیگم صاحبہ کو بنا ڈرے سنا آئی تھی۔ کیوں سر شام چہکتی ہوئی واپس آئی تھی جس کے چہرے کو الوہی سی چمک نے روشن کر رکھا تھا۔ وہ احمد نام کو اتنی محبت سے کیوں پکار رہی تھی اور اب وہ اس کے گویائی سے محرومی کا سن کر یوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی گویا ابھی کسی عزیز کی موت ہوئی ہو، رضیہ نے نرمی سے

WOMEN SKILLS GROUP

اس کے گرد حصار کھینچا۔

☆☆☆

"سیریسلی۔" احمد نے حیرت و بے یقینی سے ارسل اور زید کی طرف دیکھا۔

"بالکل۔" ارسل نے حلفیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ پچھلی بار احمد کے چہرے کے بھرپور تاثرات کے باعث انہوں نے عدن سے ملاقات سنسر کر کے سنائی تھی۔

"اف۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ بچپن کا ساتھ تھا، وہ اس کے تمام اشارے بخوبی سمجھ جاتے تھے۔

"آئی لو ہر۔" اس نے مصنوعی آہ بھرتے ہاتھ پیچھے باندھے کرسی کی پشت سے کمر ٹکائی۔

"تم سنجیدہ ہو؟" ارسل نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں بالکل، کاش وہ میرے سامنے آ جائے تو۔" اس بار وہ سنجیدہ ہوا تو دونوں چونکے۔ اب وہ اشاروں کے بجائے چند جملے لکھ کر ان کے سامنے کر چکا تھا۔

"اگر وہ میرے سامنے آ جائے تو اپنے بھائی کی بے عزتی کے بدلے میں لمحہ ضائع کیے بنا اسے شوٹ کر دوں گا۔" دونوں نے بے یقینی سے اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھا۔

"ریلیکس یار! ہم لوگ تو مذاق کر رہے تھے۔" زید سنبھلا۔ "بھلا کوئی لڑکی اتنی جرأت کر سکتی ہے کہ اتنے ہینڈسم لڑکے کی انسلٹ کرے؟"

"تم مجھے بہلا نہیں سکتے۔ کل آ رہا ہوں میں تمہاری یونی۔"

اس کا انداز دوٹوک تھا۔ زید اور ارسل کے پسینے چھوٹ گئے مگر وہ کل کبھی نہیں آئی تھی۔ گزرے تین ماہ میں ان کی زندگیاں اس حد تک بدل چکی تھیں کہ وہ بھول چکا تھا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کے لیے کچھ کہا بھی تھا۔

☆☆☆

ان دنوں حویلی میں خاصی چہل پہل تھی کہ زید اور ارسل گاؤں آئے ہوئے تھے اور وہ زید کے ظرف پر حیران تھی۔ اس کے اتنے انسلٹنگ رویے کے باوجود وہ نہ صرف اسے معاف کر چکا تھا بلکہ اس کی خاطر اپنے بھائی کے سامنے بھی کھڑا ہوا تھا۔ اس حویلی میں زید اور فیروزا ایسے وجود تھے جن کی وہ دل سے بہت عزت کرتی تھی۔

تین ماہ قبل والی عدن بلال جس کا وقار اور شاہانہ انداز شاہ زادیوں سا تھا اب اس کی حالت کسی بھکاری سے کم نہ تھی۔ جس کا کاسہ فقط اک نگاہ الفت کا پیاسا تھا اور وہ تھا کہ اس کی طرف دیکھتا ہی نہ تھا۔

"میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تو یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟" وہ روز اللہ سے یہ سوال کرتی تھی۔ "یا اللہ میری آزمائش ختم کر دے، احمد کو میرے دل سے نکال دے۔ میرا دل بدل دے، تو قادر ہے، تو کر سکتا ہے۔"

ہر رات سونے سے قبل وہ یہی دعا مانگتی اور ہر صبح اس کی ابتدا ایک ہی دعا سے ہوتی۔

"یا اللہ آج وہ شخص حویلی آ جائے۔" کلف لگی اس مغرور لڑکی کو محبت نے اس حد تک بدل ڈالا تھا کہ اس کی ذات کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اب صرف ایک حقیقت تھی کہ وہ احمد کے پیارے رشتوں کی مرضی کے مطابق موم کی مانند ان کی منشا کے پیش نظر ڈھلتی جا رہی تھی۔ وہ یہ تک فراموش کر چکی تھی کہ اس کا سکندر نامی کسی شخص سے کوئی تعلق بھی ہے۔

گئے دنوں کی عزیز باتیں
نگار جیسی، گلاب راتیں
بساط دل بھی عجیب شے ہے
ہزار جیتیں، ہزار ماتیں
جدائیوں کی ہوائیں لمحوں کی
خشک مٹی اڑا رہی ہیں
گئی رتوں کا ملال کب تک
چلو کہ شاخیں ٹوٹتی ہیں
چلو کہ قبروں پر خون رونے سے
اپنی ہی آنکھیں پھوٹتی ہیں

صبح جب وہ کسی کام سے حویلی کی پچھلی طرف آئی تو قدم ٹھٹک کر ساکت ہو گئے۔ صبح کی پُرنور ساعتوں میں اس شخص کو دیکھنا کس قدر دلفریب تھا۔ ٹانگیں کنویں میں لٹکائے، وہ منڈیر پر بیٹھا تھا۔ کان میں بلیوٹوتھ تھا (وہ اس کا آلہ سماعت تھا)۔ وہ نہ جانے کب تک اس کی پشت پر نگاہیں جمائے کھڑی رہتی، جب اس نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ چونک کر اس کی طرف بڑھی۔ احمد نے بغور اسے دیکھا سرخ اور مہندی رنگ کی لانگ شرٹ جس کی آستینیں شیفون کی تھیں اور دوپٹہ بھی (یہ سوٹ وہی لایا تھا)۔

"السلام علیکم صاحب!" سر کے اشارے سے جواب دیا گیا، پھر وہ منڈیر سے اتر کر اس کے روبرو کھڑا ہوا۔

"آپ ناشتے میں کیا لیں گے؟" احمد نے بغور اس کا انداز دیکھا، تو کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ وہ کیوں اس کے سامنے بے خود ہو جاتی ہے کہ نظر اٹھاتی ہے تو پلک جھپکنا بھول جاتی ہے اور جب حواس میں لوٹ کر نگاہ جھکاتی ہے تو اٹھانا بھول جاتی ہے۔ کہیں جو وہ سمجھ رہا ہے وہ حقیقت تو نہیں؟ عدن نے نگاہ اٹھائی پھر فوراً جھکائی کہ وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔

"آپ بتا دیں کیا لیں گے؟" وہ روہانسی ہوئی۔ گھر میں سب کی پسند اسے معلوم تھی سوائے اس شخص کے۔ اس نے گہری سانس لیتے سر کو نفی میں جنبش دی اور قدم حویلی کی طرف بڑھائے۔

"صاحب پلیز بتائیں نا، کیا پسند ہے آپ کو کھانے میں؟" وہ بھاگ کر اس کے پیچھے لپکی، وہ ایک دم پلٹا تو عدن سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، جھنجلا کر اس بے وقوف لڑکی کو دیکھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کچھ نہیں کھانا مجھے۔" تیزی سے موبائل پر ٹائپ کرتے سامنے کیا۔

"آپ مجھے اشارے سے بتا سکتے ہیں۔ لکھنا ضروری نہیں۔ میں سمجھ لوں گی۔" نہ جانے اس نے کس زعم میں کہا۔

"واقعی؟" استہزائیہ ابرو اٹھاتے گویا عدن کو چیلنج کیا۔

"آپ کو یقین نہیں ہے میری بات کا؟" وہ جوش میں آئی۔ "ٹھیک ہے، آپ کچھ کہیں پھر میں بتاتی ہوں۔ آپ نے کیا کہا؟"

احمد سینے پر بازو لپیٹے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ اس نے بغور ان سرخ ہوتے عارض اور لرزتی پلکوں کو دیکھا۔

"میری طرف دیکھو۔ یوں سر جھکا کر تم کیا سمجھ سکو گی۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ بات سمجھنے کے لیے میری طرف دیکھنا ضروری ہے۔" تیزی سے ٹائپ کرتے عدن کے سامنے کیا تو اس نے نگاہ اٹھائی۔

"اف۔" اس چہرے کی طرف دیکھنا کسی امتحان سے کم تھوڑا ہی تھا اس کے لیے۔ اس نے انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا پھر اس کے دو رنگوں کے دلکش دوپٹے کی طرف۔ انگلی انگوٹھے کی مدد سے نوٹ گننے کا سائن پھر دائیں ہاتھ سے اپنے چہرے کو فوکس کرتے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو راؤنڈ کیا (تم نے میرا دلایا سوٹ پہن رکھا ہے اور اچھی لگ رہی ہو)۔

پچھلی طرف آتی رضیہ نے اس منظر کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ عابدہ کے کہنے پر اسے بلانے آئی تھی، معلوم نہیں تھا کہ عدن اس وقت یہاں ہو گی۔

"میں سمجھ گئی۔ میرا دوپٹہ اچھا ہے ناں؟" عدن کا چہرہ تمتمایا مگر وہ تاسف سے سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا جب کہ رضیہ ہنس پڑی۔ وہ بخوبی سمجھ چکی تھی۔ کہنے والا کیا کہہ گیا ہے، عدن نے اسے گھورا۔

"آ جائیں بی بی! سب لوگ ناشتے کے لیے بیٹھ گئے ہیں۔" عدن کو شبہ ہوا۔ رضیہ کی سمجھ میں احمد کی بات آ گئی ہے، اس نے پوچھا مگر رضیہ ٹال گئی۔

☆☆☆

تیئس برس بعد سفینہ پھوپھو اپنی دو بیٹیوں اور

WOMENSKILLS GROUP

شوہر کے ہمراہ حویلی آئی تھیں۔ اتنے برسوں بعد عارف صاحب کا غصہ بھی ختم ہو ہی گیا تھا جب کہ عدن سکندر، رومیہ کو دیکھ کر حیران تھی۔ کانوں میں ایک جملہ متواتر سے گونج رہا تھا۔

"زید میرے ماموں کا بیٹا ہے۔" گویا وہ سچ کہتی تھی جب کہ عدن اسے مذاق سمجھی تھی۔

"میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ میں تمہیں دیکھ کر کس قدر ایکسائٹڈ ہوں۔"

رومیہ، عدن کے دونوں ہاتھ تھامے نان اسٹاپ بول رہی تھی جب کہ وہ مسکراتے ہوئے رومی کی بے سروپا باتوں کو سن رہی تھی۔ "پہلی بار اپنے ماموں اور کزنز سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ جنہیں صرف تصویروں میں دیکھا تھا۔" رومیہ کی آنکھیں نم تھیں۔

"یہ سب سکندر بھائی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے، انہوں نے ماموں کو منایا۔ عدن تم بہت لکی ہو چاہے جیسے حالات ہی کیے مگر تم ان کی بیوی ہو۔ اگر میری زندگی میں کسی اور کے لیے گنجائش ہوتی تو میں سکندر کو تم سے چھین لیتی۔" عدن جو حیرت سے اس کی خوشی دیکھ رہی تھی، آخری بات پر چونکی۔

"کسی اور کی گنجائش مطلب تم نے مجھ سے کچھ چھپایا۔" رومی ہنس دی۔

"سوری۔ میں بتانے والی تھی مگر وہ حادثہ ہو گیا۔" وہ سنجیدہ ہوئی۔

"تم ٹھیک تو ہو عدن؟" اس نے عدن کی کملائی رنگت اور پھیکا سا چہرہ دیکھتے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

"اور یہاں خوش ہو؟" رومیہ نے کھوجا۔

"ہاں، بہت خوش ہوں۔" عدن نے مسکراتے ہوئے دل سے کہا۔

"تم بہت بدل گئی ہو عدن۔" رومیہ نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"وقت کے ساتھ لوگ بدل ہی جاتے ہیں رومی اور جو نہ بدلیں۔ قسمت انہیں بے رحمی سے بدل دیتی ہے۔" عدن نے یاسیت سے کہا۔

"دو ہی جذبے انسان کو بدلنے پر قادر ہوتے ہیں عدن! نفرت یا محبت۔ اب تم بتاؤ۔ موجودہ حالات کے پیش نظر تم نفرت سے بدلی ہو یا محبت سے۔" عدن اس کے اندازے پر ہکا بکا رہ گئی مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ بولتی، ارسل نے رومیہ کو پکار لیا۔ وہ اگلے ہفتے آنے کا عہد دے کر اٹھی تھی جب کہ عدن کے دل کو پنکھ لگ گئے تھے۔

اسے رومیہ کا احمد کی فائل کھولنا پھر اسے فرینڈ ریکوئسٹ بھیجنا اور اب اعتراف ہولا رہا تھا، اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ کاش رومیہ دوبارہ یہاں کبھی نہ آئے۔

☆☆☆

کوئی نظر بھی اٹھائے اس پر تو یہ دل دھڑک جاتا ہے
میں اس شخص کو چاہتا ہوں آبرو کی طرح

ان دنوں حالات نے ایک دم سے گویا پلٹا کھایا تھا کیونکہ نامہرباں چہرے جن میں سرفہرست تائی تھیں۔ عدن پر مہربان نظر آ رہی تھیں اور وہ جو ہمیشہ اس کے لیے آسانیاں ڈھونڈتے تھے لاتعلق نظر آ رہے تھے جن میں زید، ارسل اور فیروز چاچو شامل تھے۔ انہیں اپنے ہر کام کے لیے عدن کی ضرورت ہوتی اگر وہ کھانا بناتی تو کئی نقص نکالتے، اگر کسی کام میں معمولی سی دیر ہو جاتی تو بلا جھجک جھڑک بھی دیتے۔ تائی اور عابدہ حیرت سے ان کے بدلے ہوئے انداز نوٹ کر رہی تھیں۔ آخر کیا ہو گیا تھا ان تینوں کو جو یوں اچانک بدل گئے تھے۔

اس روز صبح پراٹھے بناتے عدن کے ہاتھ کی پشت اور ہتھیلی پر گرم تیل گرنے سے آبلے پڑ گئے تھے، تکلیف کی شدت سے آنکھیں لبالب بھری ہوئی تھیں۔ عابدہ نے اس کے ہاتھ پر دوائی لگا کر اسے کام نہ کرنے کا کہا تھا۔ چھٹی کا دن تھا سوائے تایا اور سکندر کے سب ہی مرد گھر پر تھے۔ زید اور ارسل کو کہیں جانا تھا، اسی لیے عدن کو بلایا۔

"ہمارے کپڑے پریس کر دو۔" انداز حاکمانہ تھا۔ احمد کے علاوہ عابدہ بھی لاؤنج میں ہی موجود تھیں۔

"رضیہ سے کہو وہ کر دے گی، دیکھ نہیں رہے اس کا ہاتھ کتنا جل گیا ہے۔ استری کیسے پکڑے گی۔" عابدہ نے دونوں کو گھورا، جب کہ عدن سر جھکائے کھڑی تھی۔ دل کی حالت بہت قابل رحم تھی۔ احمد نے اس کا سرخ چہرہ دیکھنے کے بعد ہاتھ کو دیکھا جو اچھا خاصا جل گیا تھا۔ اماں زید سے کہتے باہر نکل گئیں، تو زید نے عدن کو گھورا جو پلٹنے والی تھی۔

"سنو میڈم!" اس کے انداز پر احمد حیران رہ گیا۔

"یہ تو طے ہے کہ میرے کپڑے تم ہی پریس کرو گی۔" وہ اٹھ کر اس کے مقابل آیا تو لبالب بھری آنکھوں کو دیکھ کر ایک پل کے لیے بے چین ہوا مگر پھر سر جھٹکا۔

"ایک ہاتھ جلا ہے، وہ بھی معمولی سا۔ دوسرا تو سلامت ہے نا، اب جاؤ۔"

احمد جھٹکے سے اٹھ کر ان کے قریب آیا۔ ارسل مزے سے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا گویا ابھی کسی من پسند ڈرامے کا پسندیدہ سین دیکھنے جا رہا ہو۔

"تم نے سنا نہیں اماں نے کہا، رضیہ کر دے گی کپڑے پریس۔" سفید شلوار سوٹ میں ملبوس احمد پورے قد سے عدن کے پہلو میں کھڑا بھائی سے مخاطب تھا۔ جب کہ عدن سکندر مرنے والی [illegible]۔

"کیوں؟ یہ کیوں نہیں کر سکتی؟" زید تلملایا۔

"مجھے اسی سے کروانے ہیں۔"

"زید!" اگر جو وہ بول سکتا تو پوری حویلی اس کی گرج سے لرز اٹھتی۔ "آئندہ میں نہیں دیکھوں کہ تم اپنے فضول کاموں کے لیے عدن کو پکار رہے ہو۔ رضیہ سے کہو اور تم جاؤ یہاں سے۔" احمد نے ہاتھ کے اشارے سے عدن کو وہاں سے ہٹایا تو وہ تیزی سے پلٹی۔

"واہ صاحب! کیا آپ کے کام نہیں کرتی وہ۔" ارسل کو ایک دم غصہ آیا۔

"یا آپ کو سات خون معاف ہیں؟"

"مجھے خود سے کمپیئر مت کرو اور آئندہ اگر اسے تنگ کیا تو یاد رکھنا بری طرح پیش آؤں گا۔" اس نے سختی سے کہا۔

"یا حیرت یہ میری گناہ گار بصارتیں کیا دیکھ رہی ہیں کہ ذرا عدن بلال کے لیے اس گھر کے شہزادوں کو ڈانٹا جا رہا ہے۔"

زید اور ارسل پر ہنسی طاری ہوئی تو وہ پلٹا مگر اپنے پیچھے جناتی قہقہے سن کر خود بھی مسکرا دیا جب کہ ہال کی دیوار سے ٹیک لگائے عدن کی نگاہیں دور جاتے اس شخص کی پشت پر جمی تھیں۔

☆☆☆

تیری کوشش تیری تدبیر ہونا چاہتا ہوں
میں تیرے ہاتھوں کی تحریر ہونا چاہتا ہوں

تو میرے پاس آئے اور پلٹ کر نہ جائے
میں تیرے پاؤں کی زنجیر ہونا چاہتا ہوں

میں اسی لیے خود کو تباہ کر رہا ہوں
کہ تیرے ہاتھ سے تعمیر ہونا چاہتا ہوں

رات ارقم کی واپسی ہوئی تھی اور صبح عدن سے ملاقات۔ وہ حویلی کا پہلا فرد تھا جس نے اسے اس کے رشتے سے بھابھی کہہ کر پکارا تھا۔ وہ تیرہ سالہ صحت مند خوبرو بچہ تھا، جسے عدن بہت پسند آئی تھی۔ وہ صبح سے اس کے ساتھ ساتھ تھا، اس وقت جب وہ لوگ شام کے کھانے کے لیے کچن میں تھیں، ارقم ماربل ٹاپ پر بیٹھا پاستا کھا رہا تھا۔ ساتھ ہی مسلسل بول رہا تھا۔

"آپ مزے کی کوکنگ کرتی ہیں جب کہ رضیہ آپا کو تو [illegible] نہیں بنانا آتا۔" اس نے منہ بنایا تو دونوں مسکرا دیں۔ "میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ بڑی بہن ہو اور دیکھیں اب آپ آ گئی ہیں۔"

عدن ہنس پڑی۔ پھر اس کا سرخ چہرہ پیار سے

WOMEN SKILLS GROUP

دیکھا۔

"تم اتنے ماہ شہر رہ کر آئے ہو، یہاں کسی کو مس نہیں کیا۔" اس نے ارقم کے سلکی بال بگاڑے۔

"بہت مس کیا سب کو۔ دل چاہتا تھا فوراً آجاؤں لیکن پھر بھائی کا چیلنج یاد آجاتا۔ وہ کہتے تھے میں اتنا عرصہ وہاں نہیں رہ پاؤں گا، بس اسی لیے۔" اس نے بات کے اختتام پر پیالہ اٹھالیا۔

"کون سے بھائی نے چیلنج کیا تھا۔"

"احمد صاحب!" ارقم سے قبل رضیہ بول پڑی۔ برنر جلاتے عدن کے ہاتھ تھمے۔ رضیہ مسکراتے ہوئے بتارہی تھی۔

"چھوٹے صاحب سب بھائیوں کے ساتھ بچوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں، آپ نے انہیں دیکھا ہے نا؟" رضیہ نے سبزی کاٹتے ہاتھ روک کر عدن کی طرف دیکھا جو بغور اس کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔

"خود بھی اتنے بڑے نہیں ہیں مگر۔" تب ہی ارقم بھائی پکارتے تیزی سے باہر لپکا، دونوں نے دیکھا۔ وہ احمد کی پشت سے لپٹا کہہ رہا تھا۔

"ٹیسٹ کریں بہت مزے کی ہیں۔ بھابھی نے بنائی ہیں۔" وہ اسے کچن میں لے آیا اور چمچہ بھر کر احمد کی طرف بڑھایا۔ لقمہ لیتے اس نے سر ہلاتے تعریف کی۔ پھر رضیہ کی طرف دیکھا۔ پہلے ہاتھ سے فضا میں زگ زیگ کیا پھر مونچھوں کو تاؤ دیتے اپنے پیچھے اشارہ کیا۔ عدن نے اس کے اشارے دیکھے جب وہ دونوں بھائی باہر نکلے تو اس نے کب سے رکی سانس بحال کرتے رضیہ سے پوچھا۔

"وہ کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہہ رہے تھے، زید صاحب سو رہے ہیں۔ جب اٹھیں تو ان سے کہوں ڈیرے پر آجائیں، وہ لوگ وہیں جارہے ہیں۔" اس نے یوں فرفر بتایا، گویا وہ بول کر گیا ہے۔ عدن کو رضیہ پر رشک آیا۔

☆☆☆

"صاحب! وہ بی بی۔"

وہ لوگ شام کی چائے پی رہے تھے جب حواس باختہ رضیہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا رضیہ؟" عابدہ نے حیرت سے اس کا زرد چہرہ دیکھا۔

"بی بی جی! وہ چھوٹی بی بی کنویں میں گر۔" ابھی اس کے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ زید، ارسل اور احمد کرسیاں دھکیلتے باہر دوڑے جب کہ باقی لوگ ان کے پیچھے تھے۔ کنویں میں کودنے والا احمد تھا۔

وہ غوطہ لگاتے اسے سطح پر کھینچ لایا تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ پانی اس کے شانوں تک تھا اس نے بے تابی سے عدن کا چہرہ تھپتھپایا باقی لوگ منڈیر پر جھکے تھے۔ زید اور ارسل سیڑھی لے آئے، صفیہ کے کہنے پر رضیہ اندر سے چادر لے آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جب کہ باقی لوگ بھی پریشان تھے۔

احمد دائیں بازو کے حصار میں عدن کے بے جان وجود کو کندھے سے لگائے باہر آیا تو عابدہ نے چادر اس پر ڈال دی۔ ابتدائی طبی امداد کے بعد اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ صفیہ، عدن کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔ پپڑی زدہ ہونٹ، کملایا ہوا چہرہ۔ وہ کتنا بدل گئی تھی۔ "جب یہاں آئی تھی تو کیسا دل موہ لینے والا دل کش چہرہ تھا اور اب۔" انہیں دکھ ہوا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس حویلی کا کوئی بھی مکین سخت دل نہیں تھا۔ بس ایک حادثے نے وقتی طور پر ان کے دل سخت کردیئے تھے جو رفتہ رفتہ اس خول سے باہر آرہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تائی کا رویہ اس کے ساتھ بہتر ہورہا تھا۔

"کیوں گئی تھی یہ وہاں؟ کس کے کہنے پر؟" عابدہ نے رضیہ کو ڈپٹا۔

"جب سب کو معلوم ہے اسے پانی سے ڈر لگتا ہے تو اسے وہاں بھیجنے کا کیا مطلب ہے۔ جان لینی تھی؟" انہیں رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔

"کسی نے نہیں کہا تھا جی۔" رضیہ نے سر اٹھایا۔ "بی بی خود گئی تھیں۔" اندر آتے احمد نے اس کا

جواب دھیان سے سن کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

"مگر کیوں؟" انہیں حیرت ہوئی۔ رضیہ نے آنے والے کو دیکھا۔

"میں نے منع کیا تھا کہ بی بی یہاں نہ بیٹھیں۔"

"اگر تم روکتیں تو وہ رک جاتی۔ بہانے مت بناؤ اور سچائی بتاؤ۔" اماں کو اس کی بات پر بھروسا نہیں تھا، انہیں لگا وہ صفیہ کا نام لینے سے ہچکچا رہی ہے۔ رضیہ روہانسی ہوئی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بی بی! اس روز سکندر صاحب وہاں بیٹھے تھے کنویں پر تو انہوں نے کہا۔ اب مجھے کنویں سے ڈر نہیں لگتا مگر وہ گر گئیں۔" احمد تیزی سے باہر نکل گیا جب کہ دونوں خواتین ہکا بکارہ گئیں۔

☆☆☆

ان کی روٹین تھی جب وہ بھائی فارغ ہوتے تو حویلی کی پچھلی طرف پر کرسیاں بچھا کر کارڈز کھیلتے تھے۔ ایک روز بھی وہ کھیل رہے تھے جب انہیں دیکھتے ارقم کو کچھ خیال آیا۔

"صائم کی بھابھی بے بی لے کر آئی ہیں۔ ہمارا بے بی کب آئے گا بھائی؟" اس نے جس قدر اشتیاق سے پوچھا تھا، سب ہی لڑکوں کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔

"ارقم! ایسی باتیں نہیں کرتے یار!" احمد نے اس کا گال چھوا تو وہ او کے کہتا اٹھ کر حویلی چلا آیا اور سیدھا کچن میں آیا جہاں عدن آٹا گوندھ رہی تھی۔ رضیہ، تائی کے پاس تھی۔ ارقم کے پیچھے ہی وہ بھی کچن میں آئی تھی۔

"بھابھی!" وہ جمپ لگا کر ٹاپ پر بیٹھا۔

"جی ارقم! کچھ کہنا ہے۔" آٹا ڈھک کر ہاتھ دھوتے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"ہمارا بے بی کب آئے گا؟"

"ہمارا بے بی؟" عدن کے ہاتھ ساکت ہوئے، پلٹ کر حیرت سے ارقم کا پرجوش چہرہ دیکھا۔

"کیا مطلب؟" اسے ارقم کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ کس کے بے بی کا ذکر کررہا تھا۔

"صائم کی بھابھی لائی ہیں، بے بی ہاسپٹل سے۔ بھابھی! آپ کب لائیں گی؟" عدن نے ایک دم سے اس کی طرف سے رخ موڑا، رضیہ مسکرادی۔

"ارقم تو ڈلر بنادوں بیٹا؟" چند لمحوں بعد اس نے بات ہی پلٹ دی۔

"جی بنادیں۔ میں بڑی اماں کے پاس ہوں، وہیں لے آئیں۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا تو عدن نے گہری سانس لی۔ رضیہ کھلکھلا کر ہنسی تو وہ خود بھی مسکرادی۔

☆☆☆

ان دنوں عدن سکندر کی زندگی دہری اذیت میں تھی، جب رومیہ کی حویلی آمد ہوئی۔ اسے رضیہ نے بتایا کنویں سے اسے سکندر نے نکالا تھا۔ وہ حویلی میں ہی تھے جب کہ اسے یاد تو نہیں پڑتا تھا کہ اس نے کسی نئے چہرے کو دیکھا ہو۔

"بڑی بیگم صاحبہ نے مجھے بہت ڈانٹا تھا جی؟" رضیہ بارہا اسے تفصیل بتا چکی تھی۔

وہ غائب دماغی سے رومیہ کو سن رہی تھی۔

"میں نے اس روز زید کو پہچان لیا تھا۔ تصویریں دیکھ رکھی تھیں میں نے، پھر احمد مل گئے۔ میں ان کے پیچھے نہیں تھی، وہ کوئی اور تھا۔" وہ مسکرائی۔ "اور وہ زید ہے۔"

"تم زید کو پہلے سے جانتی تھیں؟" عدن نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

"روبرو نہیں ملی تھی، سکندر کے ساتھ دیکھا تھا پھر ان سے ملنا بھی تھا کہ وہ ماموں کو منائیں کیونکہ ماموں ان کی بات نہیں ٹالتے۔"

"سکندر تمہیں کہاں ملے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا تو رومیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

WOMENSKILLS GROUP

"ابھی بتایا تو ہے بلکہ پہلے بھی بتایا تھا کہ پچھلے چار ماہ سے احمد باقاعدگی سے ہمارے ہاں آ رہے ہیں۔"

"پہلے تو تم سکندر کہہ رہی تھیں اور اب احمد۔" عدن رو دینے کو تھی۔ (یہ انکشاف جان لیوا تھا۔ کیا احمد ہی دراصل سکندر ہے؟)۔

"مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" رومیہ نے تشویش سے اس کا زرد چہرہ دیکھتے ہاتھ تھامے۔

عدن نے آنکھوں میں نمی لیے بے بسی سے اسے مخاطب کیا۔

"مجھے بتاؤ رومی! احمد اور سکندر کون ہیں؟"

"کیا ہو گیا ہے یار! تم اپنے شوہر کو نہیں جانتیں؟" رومیہ نے اسے ڈپٹا۔

"بی بی اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔" رضیہ نے وہاں آ کے ان پر پہاڑ گرا دیا۔ دونوں نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "چھوٹے صاحب نے منع کیا تھا کہ بی بی کو پتا نہ چلے، وہ دراصل سکندر ہی ہیں۔"

عدن کی آنکھ سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا جب کہ رومیہ بھی حیران تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ جب عدن رو رو کر نڈھال ہو گئی تو رومیہ خود بھی رونے والی ہو گئی اور یہی حال رضیہ کا تھا۔

"عدن پلیز، چپ ہو جاؤ۔" رومیہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔ "میں جانتی ہوں، تمہیں جان کر بہت دکھ ہوا ہے مگر تم رو مت، بدلہ لو اس سے۔ اسے معلوم ہی نہ ہو کہ تم حقیقت جان گئی ہو۔" وہ اسے چپ کروانے کے جتن کر رہی تھی۔

"میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں رومی؟"

"کیوں نہیں کر سکتیں، اگر وہ حقیقت چھپا کر تمہیں اذیت دے سکتا ہے تو تم کیوں نہیں؟"

"کیونکہ میں مجبور ہوں۔" اس نے چہرہ رگڑا۔

"کیسی مجبوری؟" رومیہ چونکی۔ جب کہ رضیہ مسکرا دی۔

"تم نے پوچھا تھا مجھے کس جذبے نے بدلا؟ حقیقت سے ناآشنائی کے باوجود میرا دل خود بخود اس کی طرف کھنچتا تھا۔ مجھے سکندر نام سے کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ تم جانتی ہو نا رومی! میں کچھ غلط برداشت نہیں کر سکتی۔ بعید نہ تھا کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتی اگر جو اس شام میں نے احمد کو نہ دیکھا ہوتا۔ اس کی دی کوئی سزا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں۔ وہ میری نگاہوں کے سامنے تھا تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھی اور اب جب کہ میں حقیقت جان گئی ہوں کہ احمد ہی میرا بخت ہے، تو کیسے لاتعلق ہو جاؤں؟ وہ اتنے اچھے اور پیارے کیوں ہیں رومی؟"

"بے شرم لڑکی!" رومیہ نے مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے اسے چپت لگائی۔ "کس قدر بے شرمی سے نند کے سامنے داستان محبت سنا رہی ہو۔"

"نند کو نہ سناؤں تو کسے سناؤں یار!" وہ روہانسی ہوئی۔

"اف یہ رضیہ کی بچی بھی اس راز سے واقف ہو گئی ہے۔" اسے مسکراتے دیکھ کر رومیہ چلائی۔

"مجھے بھی نند ہی سمجھ لیں کیونکہ صاحب بالکل بہنوں کی طرح ہی خیال رکھتے ہیں میرا۔" اس نے فخریہ بتایا۔ "اور یہ راز جو آپ کو ابھی معلوم ہوا، میں پہلے سے جانتی ہوں۔" رومیہ اور عدن نے حیرت سے اس جیمز بانڈ کی جانشین کو دیکھا۔ وہ راز داری سے کہتے ہوئے ان کے قریب ہوئی۔ "ابھی بھی زید صاحب، احمد صاحب کو بتا رہے تھے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا۔ مجھے اس سے پیار ہو گیا ہے۔" رضیہ نے آنکھیں مٹکائیں جبکہ عدن نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھا۔ رومیہ چلائی۔

"تمہارا مطلب سکندر احمد، عدن بلال سے محبت کرتا تھا۔ مائی گڈنیس۔ یہ کیا مسٹری ہے بھئی؟"

اس نے عدن کی طرف دیکھا مگر وہ تو خود شدید

حیرت کے باعث سکتے کی حالت میں تھی۔ رومیہ کو اس پر ترس کے ساتھ پیار آیا تو دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامتے پیشانی چوم لی۔

"سدا سہاگن رہو۔" عدن کی آنکھ سے بے ساختہ آنسو رواں ہوئے۔ "تمہاری قسمت کو سلام۔ یار میں تو پکی پکی ٹاپ روایتی نند ثابت ہونے والی تھی تمہاری، مگر اب جب کہ میں حقیقت جان گئی ہوں کہ میرے گڈے کو تم سے محبت ہے تو ارادہ بدلنا پڑے گا۔" اس نے مصنوعی بے چارگی سے کہا پھر بہت پیار سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" عدن اس کے انداز پر نروس ہوئی تو وہ مسکرا دی۔

"پیار سے دیکھ رہی ہوں، میرا بھائی بھی تو اس چہرے کو اتنے ہی پیار سے دیکھتا ہوگا۔" اس کے شرارتی انداز پر عدن کا چہرہ سرخ ہو گیا جب کہ رضیہ مسکرا دی۔

"ہمیں جن سے محبت ہوتی ہے ان سے وابستہ رشتوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے عدن ڈیئر!" رومی نے فلسفہ بگھارا۔ "مجھے سکندر احمد سے محبت ہے اور اسے تم سے، تو اس لحاظ سے مجھے عدن سکندر احمد سے ٹرپل محبت ہے۔"

"ٹرپل محبت؟" رضیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ٹرپل ایک دوستی والی، دوسری بھابھی والی اور تیسری۔" اس نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"اور تیسری احمد والی۔" عدن اور رضیہ نے چند لمحوں تک اس کا ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ پڑتا چہرہ دیکھا پھر تینوں کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔

☆☆☆

"میں نے اپنی حقیقت تم سے اس لیے نہیں چھپائی تھی کہ میرا مقصد تمہیں سزا دینے کا تھا کیونکہ میری نظر میں سزا بھی اسے ہی ملنی چاہیے جو خطا کرتا ہے، بے قصور کو نہیں۔ جس روز تم حویلی آئیں۔ میں تمہارے پیچھے ہی آیا تھا اور سب دیکھ رہا تھا لیکن اس سے قبل کہ میں بڑی اماں کو روکتا تم نے خود ہی ان کا ہاتھ روک لیا۔ سچ بتاؤں تو مجھے اچھا لگا تھا تمہارا انداز۔"

عدن کو ایک خط پرچا آج ہی رضیہ نے دیا تھا اور اس وقت وہ کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے نم آنکھوں سے پڑھ رہی تھی۔

"تمہارے لیے شاپنگ بھی کی تھی، رضیہ نے شاید تمہیں بتایا ہو کیونکہ تمہارے اور اس کے الگ کپڑے تھے۔ چوتھے روز جب تم کاموں سے انکار کر رہی تھیں اور میرا (یعنی سکندر) نام لینے پر جب چاچو نے پلٹ کر دیکھا۔ میں تب ہی فوراً پیچھے ہٹ گیا پھر میں جب اٹھارہ روز بعد آیا تو تمہاری حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تم اتنا کیسے بدل گئی تھیں اور مجھے تمہارا ہارا ہوا وجود بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ مجھے شدید غصہ آیا تم پر اور یہی غصہ میں نے زید پر نکال دیا (جس کا مجھے ابھی تک دکھ ہے)۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود کرتے ہیں۔ تو یہی وجہ تھی میری تم سے لاتعلقی کی۔ اگر میں نے تمہارا نڈر انداز نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تمہیں یوں تنہا نہ چھوڑتا۔ میں تمہیں اپنے برے رویے سے اکساتا تھا کہ آواز اٹھاؤ۔ میں منتظر تھا، تمہاری آواز پر لبیک کہنے والا پہلا شخص سکندر احمد ہوتا۔ مجھے دن بہ دن تمہارے شکست خوردہ وجود سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ پھر میں نے غور کیا تو حقیقت کا ادراک ہوا کہ تمہارے اس قدر بدلنے کے پیچھے میری ذات تھی۔"

عدن نے بے ساختہ سسکی روکی۔

"عجیب بات ہے نا عدن سکندر! میں جس ہستی کو سر اٹھا کر پورے حق سے اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا تھا، وہ بس میری ہی وجہ سے بے توقیر ہوئی۔ تائی اماں، زید حتیٰ کہ رضیہ تک مجھے تمہاری طرف متوجہ کرنے کے جتن کرتے رہے۔ بھلا انہیں کیا خبر تھی کہ میں تو کبھی تم سے غافل ہوا ہی نہیں تو متوجہ ہونے کا کیا جواز؟"

عدن نے ہتھیلی سے آنسو رگڑے۔

WOMEN SKILLS GROUP

"پھر وہ حادثہ جب تم کنویں میں گریں، اف مجھے لگا میں سانس نہیں لے پاؤں گا۔ تم میری وجہ سے تکلیف میں تھیں، تب ہی زید نے مجھے یاد دلایا۔ بھائی، یاد ہے آپ نے ایک بار ایک لڑکی کے لیے کہا تھا کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔"

عدن اس جملے پر ٹھٹکی۔ دل ڈوب کر ابھرا، سکندر احمد کی زندگی میں کوئی اور تھا (وہ رضیہ کی بتائی بات بھول گئی تھی)۔

تب میں چار ماہ بعد چونکا۔ "ہاں یہ سچ تھا کہ مجھے تم سے محبت تھی۔" عدن کے لبوں کو بے ساختہ مسکراہٹ چھوگئی، وجود ہلکا پھلکا ہوگیا۔

"وہ جملہ میں نے غصے سے کہا تھا لیکن اب یہی حقیقت کیا تم مجھے معاف کرسکو گی عدن سکندر احمد؟"

آگے صفحہ خالی تھا۔ عدن اسے سینے پر رکھے مسکراتے ہوئے لیٹ گئی۔

"معافی کیسی احمد! میں تو کبھی آپ سے ناراض تھی ہی نہیں۔"

☆☆☆

احمد کے دوست کی شادی تھی، پچھلے تین روز سے وہ شہر میں تھا۔ درحقیقت وہ عدن پر تمام سچائی ظاہر کرنے کے بعد سامنے جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ عدن نے صرف ایک ہی بات کہی تھی جب تائی عابدہ اور زید اسے رضیہ کے کمرے میں لینے آئے تھے۔

"کیا مجھے اتنا حق مل سکتا ہے اماں!" اس نے ایک ہاتھ سے صفیہ اور دوسرے سے عابدہ کا ہاتھ تھاما۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ زید باہر نکل گیا۔ وہ آج بھی اس لڑکی کو بے بس نہیں دیکھ سکتا تھا، اسے بھائی سے عشق تھا اور اس لڑکی کو بھی۔ ان کی ذات کا محور ایک ہی ہستی تھی تو دونوں کا رشتہ بھی بہت پاکیزہ تھا۔

"بولو بیٹے۔" اماں نے اس کے آنسو پونچھے۔ تو اس نے دونوں ہاتھ تائی کے سامنے جوڑ دیے۔

"مجھے معاف کردیں پلیز۔"

"ایسے مت کہو بیٹا! تم تو بے قصور ہو۔" تائی نے اسے سینے سے لگالیا۔

"تم کون سا حق مانگنا چاہتی ہو عدن؟" چند لمحوں بعد تائی نے اس کا چہرہ سامنے کیا جو آنسوؤں سے تر تھا۔

"اگر آپ دونوں کہیں گی تو میں ابھی آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی مگر اماں۔" اس نے عابدہ کی طرف دیکھا۔

"بولو میرا بچہ۔"

"میں چاہتی ہوں، میں جس کے نام سے وابستہ ہوکر یہاں آئی ہوں، وہی مجھے یہاں سے لے جائے۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا تو دونوں مسکرادیں۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا تھا۔

سکندر احمد کو گئے ہفتہ ہونے والا تھا اور پچھلے تین روز سے عدن سکندر بخار میں مبتلا تھی اور صبح سے گویا حواس جواب دے رہے تھے۔

فیروز چاچو نے فون کرکے سکندر احمد کو جلد پہنچنے کو کہا تھا۔ عدن کا مطالبہ بھی اس تک پہنچ چکا تھا۔

ارقم نے عدن کو سیل گفٹ کیا تھا۔ تائی ابھی اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں۔ وہ نڈھال سی دیوار کے سہارے بیٹھی تھی، آنکھیں بند تھیں۔ رضیہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ تب ہی سیل کی آواز پر دھڑکتے دل کے ساتھ فون اٹھایا۔ اسے ایک دم اپنے پاس کسی محبوب ہستی کا گمان ہوا تھا، ایک تصویر موصول ہوئی تھی۔

وائٹ برائڈل ڈریس میں انتہائی خوب صورت برائڈ جس کے قدموں میں دولہا دونوں ہاتھ پھیلائے، گھٹنے ٹیکے، پنجے کے بل سر اٹھائے، اس شہزادی کی مسکراہٹ پر نثار ہوا تھا۔ ساتھ نظم تحریر تھی۔

"بس ایک معافی ہماری
توبہ جو کبھی ستائیں تم کو
لو ہاتھ جوڑے، کان پکڑے
اب اور کیسے منائیں تم کو
جو سچ کہیں تو تمہیں تو
غصے نے اور دلکش بنادیا ہے
ہمارے من کو تو سوجھتی ہے
کہ اور غصہ دلائیں تم کو
تو کیا اب تک ہماری نظروں کے
سب تقاضوں سے بے خبر ہو
ہمیں تم سے محبت ہے پگلی
اور اب کیسے بتائیں تم کو"

اس کا چہرہ بے انتہا سرخ ہوا، لبوں پر مسکان لیے نگاہ اٹھائی تو سامنے دیوار سے پشت ٹکائے سینے پر بازو لپیٹے، دلکش مسکان اور آنکھوں میں محظوظ اور دلچسپ سی کیفیت لیے وہ پوری طرح اسی کی طرف متوجہ تھا۔ عدن سکندر نے بوکھلا کر نگاہ جھکالی۔

"شکر خدا کا یہ شخص بول نہیں سکتا۔" بے قابو ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے کلمہ شکر ادا کیا اور سکندر احمد جیسے اس کے چہرے پر لکھی تحریر پڑھ کر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

☆☆☆

گیارہ ماہ بعد۔

حویلی میں اس روز خوشی کا سماں تھا کیونکہ اس روز احمد کی بیٹی کا عقیقہ تھا۔ عنایا سکندر کی صورت حویلی کے مکینوں کے ہاتھ جیتا جاگتا کھلونا آچکا تھا۔ ارسل، زید، صفیہ، چاچو، عابدہ بیگم پورا دن ایک ہاتھ سے دوسرے میں سفر کرتی جب کہ ارقم تو خوشی سے پاگل ہوچکا تھا۔ وہ ہمہ وقت اسے گود میں لے کر بیٹھے رہنا چاہتا تھا۔

"یہ میرا بے بی ہے۔" پہلی بار اسے گود میں لیتے گویا اعلان کیا تھا۔ سکندر احمد کو وہ صرف رات کو میسر ہوتی تھی جب وہ اسے گود میں لے کر پیار کرتا، وہ بھی تب جب ارقم سو چکا ہوتا کیونکہ وہ جب تک نیند سے بے حال نہیں ہوجاتا تھا، ان کے کمرے میں عنایا کو گود میں لیے بیٹھا رہتا۔ پانچ ماہ قبل زید اور رومیہ کا نکاح ہوچکا تھا، رخصتی ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد قرار پائی تھی۔ اس وقت چاچو اور سکندر احمد ہال کمرے میں تھے جب انہوں نے بھتیجے کا چہرہ دیکھا۔

"برخوردار کیسا محسوس ہورہا ہے والد محترم کے عہدے پر فائز ہوکر۔"

"بلیسڈ" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوں، تو تم نے مجھ سے کیوں چھپایا کہ تمہیں عدن سے محبت تھی۔"

"کیا مطلب؟" احمد حیران ہوا۔ "آپ سے کس نے کہا؟"

"کیوں تم نے ہی تو زید اور ارسل کو بتایا تھا۔" وہ حیران ہوئے۔

"وہ تو اس روز غصے سے منہ سے نکلا تھا۔" اس کا چہرہ عدن کو دیکھ کر سرخ ہوا۔ جس کی گود میں عنایا تھی جب کہ رضیہ چائے لے کر آرہی تھی۔

"میں نے اسے کون سا پہلے دیکھ رکھا تھا۔" اس نے اٹھ کر بیٹی کو گود میں لیتے اس کی پیشانی چومی۔

"سبحان اللہ' غصہ اتنا دلنشین ہے تو پیار کیسا ہوگا۔" چاچو اش اش کر اٹھے، احمد نروس ہوا۔

"مجھے کسی سے محبت نہیں ہے۔" وہ جھنجھلایا۔

"تو پھر اس روز کیوں کہہ رہے تھے بھابھی سے کہ انہوں نے آپ کا دلایا جوڑا پہن رکھا ہے اور اچھی لگ رہی ہیں۔" رضیہ نے ٹھنک کر کہا تو سکندر نے بے یقینی سے اسے دیکھا جب کہ چاچو ہنس پڑے۔ عدن مسکرادی۔

"بیٹا! اسے کہتے ہیں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔" فیروز بہت محظوظ ہوئے تو وہ خود بھی مسکرادیا۔

بعض اوقات ہم نہیں جانتے کہ جو الفاظ ہمارے لبوں سے ادا ہوتے ہیں، وہ ہماری تقدیر لکھ رہے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سکندر احمد کے ساتھ ہوا تھا۔

☆

WOMEN SKILLS GROUP

Women Skills

نعیمہ ناز

رزق تا زوال

بیگم زرتاج مہر اسپتال میں داخل ہیں، کومے میں ہیں۔ ان کے چاروں بیٹے ان کے سامنے آ کر اپنے اپنے دل کا حال کہہ رہے ہیں وہ کوئی جواب دے نہیں رہی تھیں، بیگم زرتاج سن سب رہی تھیں۔

مہر ولی زرتاج بیگم کے شوہر ایک ایسے خانوادے کی تیسری نسل سے تھے جنہوں نے انگریزوں سے وفاداری نبھائی اور انگریز سے وفاداری ان کی گھٹی میں شامل تھی۔ مہر ولی نے پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد کالونی میں جائیداد خریدی۔

زرتاج بیگم ایک نامور مصورہ تھیں۔ ان کا تعلق جس گھرانے سے ہے انہوں نے اپنے ملک سے غداری کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا اور جاگیریں حاصل کیں۔

بیگم زرتاج کی تین نسلوں پہلے 1857 کی جنگ آزادی کا زمانہ ہے۔

میر وجاہت حسین کا گھرانا جس میں ان کے دو بیٹے میر شجاعت حسین، میر سعادت حسین اور یتیم بھتیجے میر سلامت حسین کھانے کے بعد ملکی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہیں۔

پانچ بڑھیا عورتیں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہیں کہ یہ بنیا گیری کرنے آئے تھے، محل میں گھس کر قلعے کے داروغہ بن گئے۔

شاہی خانوادے کے شہاب الدین دہلی میں ہی رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور میر وجاہت حسین کے گھر پناہ کے لیے آتے ہیں۔

مکمل ناول

WOMEN SKILLS GROUP

گھر کی خواتین کو بتائے بغیر انہیں تہ خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے گھر کے مردوں اور رحمت بوا کے بیٹے قاسم کے علم میں یہ بات ہے۔ بہادر شاہ کے بعد دلی پھر تباہی کی زد میں تھی۔ انگریز سپاہی میر وجاہت حسین کے گھر آتے ہیں اور شہاب الدین اور ان کے گھر والوں کو پناہ دینے کے جرم میں میر وجاہت حسین اور ان کے خاندان کے ساتھ ساتھ شہاب الدین اور ان کے خاندان کو بھی ختم کر دیا جاتا ہے۔

عبدالمعید ایک معمولی عورت سارہ کولسن سے شادی کرنا چاہتا ہے جو غیر مسلم بھی ہے۔ میر ولی اور زرتاج کے منع کرنے پر گھر بار، جائیداد چھوڑ کر ایک انتہائی نچلے علاقے میں ایک کمرے کے فلیٹ میں جو سارہ کا تھا رہنے لگتا ہے۔ ایک دن وہ فلیٹ میں آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ سارہ ایک مرد کے ساتھ بیٹھی ہے، وہ اس کا شوہر ہونے کا دعوے دار ہے۔ معید وہاں سے بھاگ جاتا ہے اور والدین کی پسند کی ہوئی لڑکی زہرہ پروین سے شادی کر لیتا ہے۔ سارہ اسے صفائی دینے کی کوشش کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ پریگنینٹ ہے لیکن وہ یقین نہیں کرتا۔

انگریز سرکار وجاہت حسین کے ملازم قاسم کو مخبری کرنے پر خان بہادر کا لقب اور جاگیر سے نوازتی ہے جو اسے کم لگتا ہے۔

نور فاطمہ اپنے گرینڈ پا کے ساتھ رہتی ہے۔ گرینڈ پا ایک کتاب لکھ رہے تھے، نور فاطمہ ریسرچ میں ان کی مدد کر رہی ہے۔

ایک لڑکی ماریہ عبدالمعید کو بلیک میل کرتی ہے کہ وہ ان کی اور سارہ کولسن کی بیٹی ہے۔

قاسم کی ماں رحمت بوا وجاہت حسین کی خاندانی ملازمہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتیں کہ ان کا بیٹا انگریز کا وفادار ہے۔

عبدالمعید بیوی سے مل کر اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ اور ماریہ کے بلیک میل کرنے پر اسے پیسے دینا بند کر دیتے ہیں۔

مہابت خان کو قاسم علی نے اپنے لیے لڑکی تلاش کرنے کا کہتے ہیں۔ ایک کم عمر لڑکی کو وہ تلاش کر لیتے ہیں اور رشتہ ڈال دیتے ہیں۔

گرینڈ پا اپنے دوست کو فارسی کے مسودے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کا ترجمہ کر دیں۔

دوسری جانب ماریہ مرنے سے پہلے عبدالمعید کی بیوی پر سچائی آشکار کر دیتی ہے۔ نتیجتاً وہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

مرزا اسکندر بیگ طیبہ اور رفعت کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

ہیڈی ماں سے ملنے کے لیے آتا ہے اور ان سے اپنے خوابوں کا ذکر کرتا ہے

(اب آگے پڑھیے)

تیسری قسط

گھر آ کر وہ اپنی لکھنے کی میز پہ بیٹھ گئے اور مسودہ کھول کر بے تابی سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ ان کے لیے ایک چھپے خزانے کے راز کی مانند تھا۔ جس کی چابی کل جا کر انہیں آج مل گئی تھی، وہ کاغذات پہ نظریں دوڑاتے ایک ایک لفظ پڑھتے اس خزانے کو دریافت کر رہے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

ہمیں اس عالم فانی میں وارد ہوئے قریباً ستر برس گزر چکے ہیں۔ ہمارے پوتے مرزا کاظم بیگ دو ماہ پہلے علی گڑھ کالج سے ہمارے پاس آئے تھے۔ وہ اپنی چھٹیاں ہر سال ہمارے ساتھ ہی گزارتے ہیں اور ہر بار ہمارے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ بھی لاتے ہیں۔ اس بار ایک ڈائری ہمارے لیے لے کر آئے اور انگریزی فیشن کا قلم بھی، انہوں نے ہم سے فرمائش کی کہ اپنے بچپن سے لے کر آج تک کے جو حالات ہم پہ بیتے اور ہمیں یاد ہیں، جو عمر ہم نے گزاری وہ ساری یادیں ان صفحات پہ رقم کریں۔

ہمارے لیے یہ ذرا اچنبھے کی بات تھی عورت کے ہاتھ میں سوئی دھاگہ دیا جاتا ہے یا ڈوئی، کفگیر اور چمٹا۔ قلم دینے کا رواج نہیں تھا، گوکہ ہمارے والدین نے ہمیں گھر پر اردو کے ساتھ عربی اور فارسی کی تعلیم دلوائی ہے۔ گھر کے مردوں کو لکھنے سے شغف ہے اور ایسے مردوں کے لیے ایک اچھا شغل سمجھا جاتا ہے مگر ہم عورتوں کے لیے یہ بات یقیناً پسندیدہ نہیں سمجھی جائے گی۔ ہم نے مرزا کاظم بیگ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

وہ مسکرائے اور کہنے لگے ”دادا جان نے اپنے سارے بچوں کے لیے پند و نصائح کے رسالے لکھے ہیں۔ وہ اپنی جگہ مفید ہیں مگر اپنی زندگی، حالات اور ماضی کے بارے میں آگاہی بھی اہم ہے، اگر دادا حضور دنیا میں ہوتے تو ہم ان سے درخواست کرتے، اب آپ سے ساری امیدیں وابستہ ہیں۔“

اور واقعہ یہ ہے کہ خاندان بھر میں ایک بڑے بوڑھے ہم ہی ہیں جو حیات ہیں، باقی سب اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں اور ہم جب لکھنے بیٹھے تو سوچا کہ ریختہ میں لکھیں؟ جو اب اردو کہلانے لگی ہے اور جس کا چلن اب زور پکڑ گیا ہے یا فارسی میں، جسے ہمارے بڑوں نے لکھنے پڑھنے کے لیے منتخب کیا ہے، تو ہم اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر ہی چلتے ہیں۔

ہماری پیدائش اس مشہور واقعے کے چند ماہ بعد ہوئی جسے غدر کا نام دیا گیا۔ ہماری یادداشت میں جو چند چہرے اور نام نمایاں ہیں۔ ان میں ہماری والدہ رفعت جہاں، خالہ جان طیبہ جہاں جنہوں نے والدہ کی وفات کے بعد ہمیں ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی، بوا جی، ہماری والدہ اور خالہ ہی کہلائیں جو ہم سے بے پناہ الفت و چاہت رکھتی تھیں۔ ہمارے ماموں جان مرزا اسکندر بیگ جن کے رعب اور دبدبے میں بھی محبت جھلکتی تھی۔

بچپن کی کچھ یادیں ایسی ہیں جو جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں، بوا جی، پیالے میں ملائی پہ کھانڈ ڈالے پراٹھے سے نوالے بنا بنا کر ہمیں کھلا رہی ہیں اور ہم منہ بنا کر کھا رہے ہیں کہ انکار کی جرأت نہیں ہے یا پھر خالہ جان رات میں سونے سے قبل چڑیا کی مظلوم کہانی سناتی ہیں جو کچھ یوں شروع ہوتی تھی۔

چڑیا ری چڑیا، تو ہم سے روٹھی کیوں

سب کتنے چالاک تو اتنی بھولی کیوں

آگے کچھ یاد نہیں کیا سناتی تھیں۔ بڑے ماموں جان اکثر گود میں اٹھا کر باغ لے جاتے تھے، آم کے درختوں پہ شاخوں سے لٹکتے ہرے پیلے آم خوب یاد ہیں۔ انہی درختوں پہ، برسات میں جھولے ڈال کر پینگیں لی جاتی تھیں، کڑھائیاں چڑھتی تھیں، ساون منایا جاتا تھا، بوا جی کو ساون کے بہت سے گیت یاد تھے جنہیں وہ اپنی بوڑھی لرزتی آواز میں گاتی تھیں اور لڑکیاں بالیاں ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جاتی تھیں۔

ہم چھوٹے تھے، ہماری ممانی جان ایک بار منہارن سے چوڑیاں پہن رہی تھیں، رنگ برنگی چوڑیاں ایسی بھائیں کہ ان میں سے ڈھیر ساری چوڑیاں ہم نے اٹھا لیں۔ ”یہ ہماری امی جان کو پہنائیے، ہم انہیں بلا لاتے ہیں۔“ ہمارے اعلان پر ممانی جان نے ہاتھ پکڑ کر ہمیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ ”یہیں بیٹھی رہو بٹیا، تمہاری امی چوڑیاں نہیں پہنتیں۔“

”کیوں؟“

”بڑی ہو جاؤ گی تو بتائیں گے، یہ لو، یہ تمہارے لیے ہیں۔“ انہوں نے یقیناً ہمارا دھیان بٹایا تھا، اس وقت بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھیں، جو بڑے ہونے پر سمجھ میں آئیں۔ مگر ایک بات ہمیں آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ اس بڑھاپے میں پہنچ کر بھی ہم وہ عقدہ حل نہیں کر سکے، ہماری والدہ کی وفات ایک عجب سانحہ تھا جو ہم پہ گزرا، اس کی کہانی ہم سناتے ہیں۔

☆☆☆

موسیقی کا کان پھاڑ دینے والا شور تھا، جس پہ نوجوان جوڑے بڑی مستی کے عالم میں تھرک رہے تھے۔ پارٹی اپنے عروج پر تھی، دو چار کے پاس سگریٹ تھیں جن سے سب باری باری کش لگا رہے تھے۔ ڈرنکس وافر مقدار میں تھیں اور بے تحاشا ہی پی جا رہی تھیں، حالانکہ اس پارٹی میں کئی لڑکے لڑکیاں اٹھارہ

WOMEN SKILLS GROUP

سال سے کم عمر تھے جن کے لیے ڈرنک کرنا غیر قانونی ہے مگر پارٹیز میں ان سب باتوں کی پروا کون کرتا ہے؟

ناچ ناچ کے تھک گئے تو ڈانس کمپیٹیشن شروع ہوگیا، وہ پارٹنر، وہ آؤٹ پارٹنر، ہپ ہاپ، ریپ، جاز، ہر ریکارڈ پہ سب اپنی اپنی مہارت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ہیڈی کی باری آئی اس نے اپنی پرفارمنس دکھانی شروع کی۔ اس کی شروعات ہی ایسی تھی کہ ہر کوئی بے حد دلچسپی اور حیرانی سے دیکھ رہا تھا، جس طرح وہ رقص کر رہا تھا، وہ ایک الگ ہی انداز تھا۔ بالکل منفرد، اپنی خواہش اور توقع کے عین مطابق وہ مرکز نگاہ بن چکا تھا، سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کی طرف متوجہ تھے، اور یہی وہ چاہتا تھا، یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی، ہر نظر میں اپنے لیے ستائش کی تمنا، ہر نگاہ کا مرکز بننے کی خواہش، ہر ایک کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کی آرزو، شہرت کی تمنا عموماً ہر دل میں فطری طور پہ ہوتی ہے۔ تمنا خواہش یا آرزو آگے بڑھ کر جنون بن جائے تو مشکل اور پھر مصیبت بن جاتی ہے۔

ہیڈی کا جنون اس سے جو رقص کروا رہا تھا، اسے دیکھ کر سلمان پہلے تو چونکا پھر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا، برداشت نہیں ہوا تو اس نے سب سے پہلے میوزک سسٹم بند کیا۔

''کیا ہوا؟'' سب کی حیران نظریں سلمان پہ تھیں اور اس کی غصہ چھلکاتی آنکھیں ہیڈی پہ تھیں۔

''یہ تم کیا کر رہے تھے؟''

''ڈانس، کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا اور تم نے میوزک کیوں بند کیا ہے۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو، یہ کس طرح ڈانس کر رہے تھے تم؟'' سلمان اس کے عین سامنے کھڑا تھا، اس کے تیور خطرناک تھے۔

''ایک یونیک اسٹائل میں، جسے تم جیسے ڈفر نہیں سمجھ سکتے، اب جاؤ اور میوزک آن کرو۔''

ہیڈی کے تمسخرانہ انداز پہ سلمان کو تو آگ ہی لگ گئی دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ ایک مکا رسید کر کے اس کا منہ ٹیڑھا کر دے، پھر بھی اس نے خود پہ قابو رکھتے ہوئے ہیڈی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''تم ایک مذہبی رکن کے انداز میں ڈانس کر رہے تھے؟'' اور حقیقت یہی تھی کہ ہیڈی کے سارے انداز نماز سے مشابہہ تھے۔

''تم کون ہوتے ہو مجھے جج کرنے والے بلڈی ملا کی اولاد!'' ہیڈی نے آگ بگولا ہو کر سلمان کو دیکھا، باقی سب ان دونوں کے اردگرد کھڑے بڑی دلچسپی سے سارا تماشا دیکھ رہے تھے، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلمان نے اس طرح غصہ کرنے کی وجہ کیا ہے مگر آگے بڑھ کر بولنے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔

''اور تم شیطان کی اولاد، لعنتی، دوزخی۔''

سلمان گو کہ کوئی پکا مسلمان نہیں تھا، شراب پیتا تھا، گرل فرینڈز کے ساتھ ڈیٹنگ بھی کرتا تھا، مگر یہ ساری آزادی اسے چھ ماہ پہلے ہی ملی تھی، جب اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا جو جمعے کے جمعے اسے نماز کے لیے اپنے ساتھ مسجد لے جاتے تھے اور جن کے رعب اور سختی کے زیر اثر تھا۔ اس کی فیملی پانچ سال پہلے یہاں آئی تھی اور باپ نے دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر ان کی مرضی کے خلاف چلا تو ٹکٹ کٹا کر پاکستان بھجوا دیں گے۔

سلمان اس دھمکی کے زیر اثر باپ کا کہا چپ چاپ مان لیتا تھا اور دل چاہے نہ چاہے مسجد بھی چلا جاتا تھا اور ان کے مذہبی اور اخلاقی لیکچر بھی سن لیتا تھا۔ اس وقت ہیڈی کو اس طرح ڈانس کرتا دیکھ کر اسے نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ہیڈی سے بھڑ گیا۔

ہیڈی نے اسے ملا کی اولاد کہا اور گالی دی تو سلمان نے جواباً اسے بھی مختلف القابات سے نوازتے ہوئے ایک مکا دے مارا، ہیڈی لڑکھڑا کر نیچے گرا مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے وہ سلمان سے گتھم گتھا ہو گیا۔

دونوں ایک دوسرے کو لاتیں، مکے، تھپڑ مار رہے تھے، اردگرد کھڑے سب جو تماشا دیکھ رہے تھے، ان میں سے اچانک ہی ایک دو کو ہوش آیا اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے، آپس میں گتھم گتھا ہیڈی اور سلمان کو ایک دوسرے سے الگ کرنے لگے۔ دونوں الگ تو ہو گئے مگر ایک دوسرے کو گالیاں دینے کا سلسلہ نہیں رکا۔

''تم دونوں اگر اسی طرح میری پارٹی خراب کرتے رہو گے تو میں دونوں کو یہاں سے بھگا دوں گی۔'' سرخ بالوں والی ان کی مشترکہ دوست نے اعلان کیا جس کے گھر وہ پارٹی میں آئے تھے۔

''جھگڑا اس نے شروع کیا تھا۔'' ہیڈی مستقل کینہ توز نظروں سے سلمان کو دیکھ رہا تھا اور سلمان کی شعلہ فشاں نگاہیں ہیڈی پہ جمی تھیں۔

''اس شیطان نے آج حد ہی کر دی، کوئی اتنا بھی گر سکتا ہے؟'' سلمان سوچ رہا تھا۔

اسے علم نہیں تھا کہ یہ صرف شروعات ہے، ہیڈی آگے جا کر اس سے بھی زیادہ نیچے گرنے والا ہے، اس سے بھی زیادہ پستی کا شکار ہونے والا ہے، اتنی گراوٹ اتنی گراوٹ کہ وہ اسفل السافلین کے درجے میں جگہ پانے والا ہے ان لوگوں میں شامل ہونے والا ہے جو اللہ کی لعنت کے اور اس کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں۔ جو اس دنیا کا سودا بھڑکتی ہوئی جہنم کے عوض کرتے ہیں، وہ دنیا جس کی قیمت اور اہمیت گھوڑے پہ پڑے کن کٹے مردہ بکری کے بچے سے زیادہ نہیں اور وہ جہنم جس کی آگ سات سمندروں کے پانیوں سے بجھ کر بھی اتنی ہولناک ہے کہ اگر اس آگ میں جلنے والے کسی گناہ گار کو دنیا کی آگ میں ڈالا جائے تو وہ اس آگ میں آرام سے سو جائے، ہیڈی ایک ذلیل و خوار دنیا، عارضی نمود و نمائش اور سستی شہرت کے لیے، اپنے آپ کو دوزخ کا ایندھن بنانے والا تھا۔

☆☆☆

شب کی سیاہی ابھی باقی تھی، آسمان پہ تاروں کی چادر سی بچھی جگمگا رہی تھی، اصیلیں، مامائیں اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھیں، چکی کی مخصوص اور مدھر گھوں گھوں میٹھی نیند سلانے کا جال بچھا رہی تھی مگر سطوت اپنے معمول کے مطابق بیدار ہو چکی تھیں، ملازمہ گرم پانی کا لوٹا لیے ان کی منتظر تھی۔ کیاری کے کنارے بیٹھ کر سطوت بیگم نے وضو کیا اور تہجد کی ادائیگی کے لیے چوکی پہ بچھی جائے نماز پہ کھڑی ہو گئیں۔ دعا مانگ کر وہ وہیں بیٹھی رہیں اور زبانی ذکر کرتی رہیں۔ قریبی مساجد سے اذانوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں، خاموشی سے انہوں نے اذان سنی، اس کا جواب دیا پھر فجر کی نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں، پتھر کی چکی کی گھوں گھوں مستقل جاری تھی۔ دو چار نہیں بلکہ درجنوں اصیلیں، مامائیں گیہوں پیس رہی تھیں۔

نماز کی ادائیگی کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر تسبیح اور

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

آمنہ ریاض
قیمت -/300 روپے
32735021

WOMEN SKILLS GROUP

تہلیل پڑھتی رہیں۔ باہر پو پھوٹ رہی تھی، شب کی سیاہی — دھندلی نگاہوں سے اجالے کو آتا دیکھتے ہوئے رخصت ہو رہی تھی۔ ستاروں کی جھلملاتی چادر سمٹ رہی تھی، روشنی کا سیلاب آتا جا رہا تھا اور ستاروں کی چمک ماند پڑ رہی تھی، پرندوں نے بھی تسبیح و تہلیل اور حمد و ثنا کی چہکار میں سمو کر چاروں طرف بکھیر دی تھی، ان کی مختلف النوع آوازوں کے شور میں چکی کی گھوں گھوں دب سی گئی تھی۔ ویسے بھی اب ایک من کے قریب اناج پس چکا تھا اور کام اپنے اختتام کی طرف گامزن تھا۔

قاسم علی بھی بیدار ہو کر نماز پڑھ چکے تھے اب ان کا رخ زنان خانے کی جانب تھا۔ جہاں سطوت بیگم کی عبادت بھی اپنے اختتامی مراحل میں تھی۔ دعا کے بعد ہاتھ چہرے پہ پھیر کر انہوں نے شوہر کی طرف دیکھا جو کرسی پہ بیٹھے ان کے منتظر تھے، کرسی جس کھلے دریچے کے نیچے بچھی تھی وہاں سے پرندوں کی چہکار، درختوں، پھولوں کی مہک اور ٹھنڈی سبک اور لطیف ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے، ساتھ ساتھ وہ مخصوص شور و غل بھی جو سارے ملازم اور ملازماؤں کے جاگنے کے بعد شروع ہو جاتا تھا، بھری پری عظیم الشان حویلی میں صبح کا آغاز اور روز کی چہل پہل اپنے معمول کے مطابق ہو چکی تھی۔ سطوت بیگم جائے نماز تہ کر کے چوکی سے نیچے اتر آئیں اور تخت پر براجمان ہو گئیں، ان کی پشت پہ مخملیں گاؤ تکیہ تھا۔

"اگلے ایک گھنٹے میں ناشتہ تیار ہو جائے تو ہم نکلنے کی تیاری کریں۔"

قاسم علی نے اپنی داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے اپنی بیگم کو دیکھا جن کا مقام و مرتبہ دو سوکنوں کی آمد کے بعد بھی اپنی جگہ قائم و دائم تھا۔ سطوت جہاں نے انہیں پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں کا تحفہ دیا تھا، دوسری بیوی بے اولاد رہیں اور تیسری نو عمر خوب صورت خوباں کے بعد دیگرے تین بیٹیوں کو جنم دے کر اپنی اہمیت و محبت میں کمی کروا بیٹھی تھیں۔

سطوت بیگم نے گزرے بیس برسوں میں اپنے بچے پالنے کے ساتھ ساتھ اللہ سے لو لگا لی تھی، سوکنوں کی آمد ہر چند کہ ایک معمول کی بات تھی کچھ عجب نہیں تھا مگر ان کے دل کو دکھ پہنچا تھا۔

وسیع و عریض جاگیر میں دولت اور آرام و آسائش کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے لیے ان کے اپنے ذاتی کاموں کے لیے ملازماؤں کی ایک فوج موجود تھی، پھر بھی بہرحال گھر گرہستی کی ذمہ داری کا کلاوہ ان کی گردن میں تھا۔ اس وقت انہیں اپنی نگرانی میں ناشتہ بنوانا تھا، دہلی، لکھنؤ، [illegible] الہ باد، کانپور، کئی شہروں سے مہمان آ کر ان کی جاگیر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ روہیل کھنڈ کے ترائی کے جنگلات میں شکار کا پروگرام تھا۔ ہر سال دو سال میں تین درجن افراد پر مشتمل یہ ٹیم شکار کے لیے ترائی کے جنگلات کا رخ کرتی تھی۔ اس ٹولی میں ماہر شکاری بھی تھے اور اناڑی بھی، سنجیدہ مہم جو بھی تھے اور شوقین شیخی باز بھی، ہاتھی اور شیر کے شکار پر جانے کے لیے آج سفر کا آغاز کرنا تھا۔

سطوت بیگم باورچی خانے میں داخل ہو گئیں جہاں نوع بہ نوع دیسی کھانے بنانے میں ماہر خادمائیں اپنے کاموں میں مصروف تھیں، سطوت بیگم ناشتے کے لوازمات کا جائزہ لینے لگیں، پراٹھے، قورمہ، چھولے، شاہی ٹکڑے، ترکاری، کباب، انڈے، شہد کے ساتھ ولایتی توس اور مکھن کا بھی اہتمام و انتظام تھا۔

اس حویلی میں ایک باورچی خانہ اور بھی تھا جس کا انتظام و احترام ایک کک کے حوالے تھا جو بدیسی کھانے پکانے میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ اپنا کمال کل رات دکھا چکا تھا اور دیسی کھانوں کے ساتھ ولایتی کھانے پکا کر مہمانوں سے داد اور انعام و اکرام وصول کر چکا تھا۔

سطوت جہاں ایک ایک ڈش کی نگرانی کرتی رہیں اپنی نگرانی میں دستر خوان لگوایا اور جب مہمان نہا دھو، تیار ہو کر اس لمبے چوڑے دستر خوان پر بیٹھے تو مختلف پکوانوں کی خوشبو نے ان کی بھوک چمکا دی تھی،

جو دستر خوان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سجے ہوئے تھے۔

ناشتے کے بعد پھر سب جگہ ایک شور اور گہما گہمی کا سا عالم ہو گیا، ڈھیروں ڈھیر سامان و اسباب سفر اور شکار کا باندھا جا رہا تھا، توڑے دار بندوقوں کا ڈھیر ایک جگہ جمع تھا جنہیں تیل دے کر صاف کیا جا چکا تھا، کارتوسوں کا ذخیرہ بڑا اہم اور قیمتی تھا۔ بے حد احتیاط سے اسے اور دوسرے اسباب کو گاڑیوں میں لادا گیا۔

خدا خدا کر کے تیاریاں مکمل ہوئیں۔ اب سورج خاصا بلند ہو کر اپنی سنہری کرنیں چاروں طرف اچھال چکا تھا، سنہری دھوپ ہر طرف اچھی طرح پھیل کر چمک رہی تھی۔

قاسم علی اور بڑے دو بیٹے سطوت بیگم کے پاس آئے تھے۔

"اچھا اماں جان! اجازت دیجیے۔" سب سے بڑے فرمان علی نے ماں کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا، ماں جیسی گوری رنگت، کھڑا ناک نقشہ بھوری آنکھیں اور بھورے بال، ولائتی کوٹ پتلون پہنے وہ مقامی سے زیادہ ولایتی باشندہ لگتا تھا، اس سے چھوٹا سبحان علی بھی کم و بیش بڑے بھائی کی طرح تھا بس قد و قامت میں وہ اپنے بڑے بھائی سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ سفید کرتا پاجامہ اور رام پوری مخملیں واسکٹ اور مخملیں ترچھی ٹوپی پہنے وہ بڑا بانکا سجیلا لگ رہا تھا۔ قاسم علی کے رام پوری دوست حامد حسین [illegible] یہاں آتے ہوئے جو بے شمار اور بیش قیمت تحائف لائے تھے یہ تحفہ اسی میں سے ایک تھا جو سبحان علی کے حصے میں آیا تھا، سطوت بیگم نے باری باری دونوں بیٹوں کی پیشانی چومی۔ "جاؤ اللہ کے حوالے۔"

"فی امان اللہ!" قاسم علی نے اپنی بھاری اور رعب دار آواز میں شریک حیات کو مخاطب کیا اور اپنا اونچے طرے والا شملہ درست کر کے حسب عادت انگلیوں سے داڑھی مونچھ ٹھیک کی اور دروازے کی سمت چل پڑے، دونوں بیٹے باپ کے پیچھے پیچھے تھے۔

"فی امان اللہ!" سطوت بیگم کے لب دھیرے سے ہلے۔

تینوں کے جانے کے بعد ان کے لگائے خس کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو کتنی دیر تک سطوت بیگم کے آس پاس چکراتی رہی۔

☆☆☆

ریسٹورنٹ کی دھیمی، خواب ناک روشنی اور میز پہ جلتی شمع نے ماحول کو رومانٹک بنایا ہوا تھا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے، میز مختلف لوازمات سے سجی ہوئی تھی۔ نور فاطمہ نے آج ذرا مختلف ڈریسنگ کی تھی، ڈبل لیئر کی گھیر دار فراک اور چوڑی دار پائجامہ، جامنی شیفون کے بڑے سے دوپٹے پہ چاندی رنگ کی چمک دوپٹے کو اور اسے پہننے والی کو بھی چمکا رہی تھی، ایک ہاتھ میں میچنگ چوڑیاں اور دوسرا ہاتھ خالی تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی جھمکیاں تھیں جو اس لیے بھی نمایاں نظر آ رہی تھیں کہ اس نے بیچ کی مانگ نکال کر دونوں طرف کے بال کانوں کے پیچھے کیے ہوئے تھے، میک اپ لائٹ تھا مگر لپ اسٹک شوخ تھی۔

داؤد اسے پک کرنے آیا تھا، وہ اپنی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جب نور فاطمہ اس کے سامنے آئی، چند لمحوں کے لیے تو واقعی داؤد اسے دیکھتا ہی رہ گیا وہ عام دنوں سے خاصی مختلف اور اچھی خاصی خوب صورت لگ رہی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔" نور فاطمہ نے اس کی آنکھوں میں ستائش دیکھ لی تھی، مگر زبان سے سننا ضروری ہوتا ہے۔

"ناٹ بیڈ۔" داؤد نے شانے اچکائے۔

"بس؟" اس کے برابر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی نور نے اسے گھورا۔

"ٹیپکل ایسٹرن لک ہے آج تو۔" داؤد نے جان بوجھ کر پھر گھما پھرا کر بات کی۔

"میری ایک آنٹی نے پاکستان سے بھیجا ہے میرے لیے، خاص طور پہ عید کا تحفہ۔" نور فاطمہ نے

WOMEN SKILLS GROUP

بہت فخر سے بتایا۔

"بہت خوب صورت تحفہ ہے، آنٹی کی چوائس اچھی ہے۔"

"دیکھ لو، عید کا موقع ہے، اتنی دور، سات سمندر پار سے میرے لیے تحفہ آ گیا اور جو اتنے قریب رہتے ہیں انہیں یاد ہی نہیں۔" نور نے اسے جتایا۔

"کیا مطلب، کیا گرینڈ پا نے اس بار عید پہ تمہیں گفٹ نہیں دیا؟"

"گرینڈ پا مجھے گفٹ دینا کبھی نہیں بھولتے، یہ تو دوسرے صاحب ہیں جو کہ عدالت میں دلائل دینا تو کبھی نہیں بھولتے مگر اپنی منگیتر کو عید پہ گفٹ دینا بھول جاتے ہیں۔" نور فاطمہ کی نظریں تو سامنے سڑک پہ تھیں مگر نشانہ یقیناً داؤد ہی تھا۔ جو بہت زور سے ہنسا تھا۔

چاند رات اسی نوک جھونک میں گزار کر اب وہ دونوں ڈنر کے لیے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے، یہ دیسی کھانوں کا خاص مرکز تھا، عید کی مناسبت سے آج یہاں رنگ برنگے اور ذائقے دار مختلف پکوانوں کے ساتھ سویوں کا بھی خصوصی اہتمام تھا اس میں زردہ، شیر خرما، دودھ والی سویاں اور بغیر دودھ کی خشک سویاں شامل تھیں۔ نور اس بات پہ خوش تھی کہ یہ ڈیزرٹ کھانے کے ساتھ مفت تھا۔

مسالے دار تکے کو چٹنی میں ڈبو کر منہ میں رکھا تو آگ ہی لگ گئی۔

"اف ف ف۔" نور کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں پانی جمع ہو گیا۔ فوراً سے پانی کی بوتل منہ سے لگا کر بھی وہ [illegible] کر رہی تھی۔

"بہت سپائسی ہے مگر مزے کا ہے۔" نور نے دوبارہ [illegible] چٹنی میں [illegible] داؤد [illegible] ساتھ دیکھ رہا تھا۔

"تم نے [illegible] ہاتھ میں کیوں نہیں پہنا؟" داؤد نے [illegible]

"[illegible] نکال کر [illegible] جلدی میں پہننا بھول گئی [illegible]" نور فاطمہ نے [illegible]

سے جواب دیا، وہ تکے خوب انجوائے کر کے کھا رہی تھی۔

"چلو اب یہ پہن لو۔" داؤد نے کہا تو نور نے تکوں سے نظر اور توجہ ہٹا کر چونک کر اسے دیکھا، ایک خوب صورت مخملیں کیس اس کے سامنے رکھا [illegible]

"ہاتھ دکھاؤ۔" داؤد نے کیس کھول کر اس میں سے ایک بریسلیٹ نکالا اور نور فاطمہ کی خالی کلائی میں پہنا دیا۔

"بیوٹی فل!" [illegible] نور فاطمہ کے منہ سے نکلا، وہ آنکھوں میں [illegible] اور [illegible] روشنیاں سمیٹے اس بریسلیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ [illegible] گولڈ کا بے حد خوب صورت اور نفیس بریسلیٹ، جس میں لگے قیمتی ڈائمنڈز اس کے بیش قیمت ہونے کا پتا دے رہے تھے۔

"عید گفٹ۔" داؤد نے اس کا بے تحاشا چمکتا چہرہ دیکھا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"پھر تمہارے طعنے کیسے سنتا؟"

"شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو مجھے۔"

"کوشش تو نہیں کر رہا، بلکہ شرمندہ کر رہا ہوں۔" داؤد کو اب موقع ملا تھا بدلہ لینے کا۔

"اچھا، یہ لو، یہ کھاؤ، بہت مزے کی ہیں۔" نور فاطمہ نے شیر خرما اٹھا کر اس کے آگے رکھا۔

"ٹھیک ہے۔" داؤد نے پیالی میں تھوڑا سا شیر خرما نکالا۔

"ویسے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ نور فاطمہ تھوڑی سی شرمندہ ہو رہی ہیں۔"

"آپ کو جو کچھ لگ رہا ہے بالکل غلط لگ رہا ہے۔" نور فاطمہ نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"تمہیں یہ خوب صورت لگا بھی ہے؟" وہ یونہی ایک کامیاب وکیل نہیں بنتا جا رہا تھا۔ اس کی حاضر جوابی اور ذہانت کا [illegible] اس کے کامیاب کیریئر میں۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لگنے نہ لگنے کا کوئی سوال ہی

نہیں پیدا ہوتا۔" نور کا جواب بے ساختہ تھا اور دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر دونوں پیدل مارچ کرتے رہے اور مستقبل کے سپنے سجاتے رہے، رات بھیگتی جا رہی تھی اور سڑکوں پہ روشنیوں اور لوگوں کا ہجوم کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"اس سے پہلے کہ گرینڈ پا میری گمشدگی کی اطلاع پولیس کو دیں، اب تم جلدی سے مجھے گھر ڈراپ کر دو۔" نور فاطمہ نے داؤد کی رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا تو پریشان ہو کر کہا۔

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔"

"نہیں داؤد، بہت زیادہ دیر ہو گئی ہے۔" نور فاطمہ کو اس کی التجا رد کرتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ گرینڈ پا اس وقت شدت سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے اور ہمیشہ کی طرح کھڑکی میں کھڑے سڑک سے گزرنے والے [illegible] ہوں گے۔

"چلو۔" داؤد نیم دلی سے قدم اٹھانے لگا۔ دونوں [illegible] پارکنگ میں آئے جہاں داؤد کی گاڑی [illegible] راستے میں داؤد خلاف معمول خاموش تھا۔

"تم اداس ہو؟" [illegible] بے چینی سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔" داؤد نے [illegible]

"پھر اتنے خاموش کیوں ہو؟"

"میں ــــ" داؤد نے ایک گہری [illegible]

"میں وہ الفاظ ڈھونڈ رہا ہوں جن میں تمہارے لیے اپنی محبت کو قید کر سکوں۔" داؤد انتہائی سنجیدگی سے [illegible] بول رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک وکیل سے زیادہ کوئی بے حد رومانٹک شاعر وغیرہ لگ رہا تھا۔ [illegible] داؤد کو حیران کر گیا تھا، وہ تعریف بھی کرتا [illegible] اور محبت کا اظہار بھی مگر [illegible] شدت اور [illegible] لہجے میں اس وقت تھی وہ پہلے کبھی نہیں [illegible]

داؤد نے ایک دم ہی گاڑی کو بریک لگایا تھا۔

"کیا ہوا؟" نور حیران تو تھی ہی، پریشان بھی ہو گئی۔

"آئی لو یو نور، رئیلی لو یو۔" داؤد اس کے ہاتھ تھام کر بے تابی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"آئی لو یو ٹو داؤد۔" نور نے آہستہ سے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، چاہتے ہیں۔ یہ بات دونوں ہی جانتے تھے۔ داؤد نے اس طرح جذباتی ہو کر کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ مگر یوں وہ بے اختیار اور بے خود وہ آج پہلی بار ہو رہا تھا۔

"داؤد! میں بہت لیٹ ہو رہی ہوں، پلیز جلدی ڈرائیو کرو۔"

"ایک تو تم، ٹھیک سے رومانٹک بھی نہیں ہونے دیتی ہو۔" داؤد جیسے چڑ کر پیچھے ہٹا تھا، بہت تیز ڈرائیونگ کر کے اس نے نور فاطمہ کو اس کی بلڈنگ میں پہنچا دیا تھا۔ گاڑی وہ بیسمنٹ کی پارکنگ ہی میں لے آیا تھا۔ یہاں سے لفٹ قریب ہی تھی۔

"چلو میں تمہیں پہنچا دیتا ہوں اوپر۔"

"میں چلی جاؤں گی تم اب جاؤ، ٹھیک ہے۔"

داؤد بغیر کوئی جواب دیے اتر آیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا لفٹ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جہاں دو تین افراد پہلے ہی سے لفٹ کے انتظار میں کھڑے تھے۔ [illegible]

☆☆☆

نور فاطمہ نے [illegible]

WOMEN SKILLS GROUP

"وہ......وہ قاسم علی تھا؟" رفعت بیگم کو آج اپنے سوال کا جواب ملا تھا مگر پھر بھی وہ بے یقین سی تھیں۔ "اتنا بے رحم، اتنا ظالم اتنا خودغرض کوئی کیسے ہو سکتا ہے؟ جس پہ اعتبار کیا تھا، اعتماد کیا تھا، جسے اختیار دیا تھا۔ وہ اتنا بڑا دھوکا کیسے دے سکتا ہے؟"

رفعت بیگم آنکھیں بند کر کے اپنے سوالات کے جوابات تلاش کرتی رہیں، دل پہ اتنا بوجھ پڑا کہ رات کے کسی پہر چلتے چلتے اس کی دھڑکن ہی رک گئی۔

☆☆☆

صفحات کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہیں تہہ کردہ سطر کو نشان زد کرتے، کہیں حاشیہ لکھتے اور اب ان کی ورق گردانی اپنے اختتام پر تھی۔ صفحات بند کر کے کچھ دیر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ سوچتے رہے۔ پیشانی پہ تفکرات کا جال بچھا تھا اور بند آنکھوں کے پیچھے گزرے وقت کے چند مناظر یکے بعد دیگرے گزر رہے تھے۔ ایسے مناظر جن میں عبرت بھی تھی، سبق بھی تھا، امید بھی تھی اور خوف بھی تھا، پہلا منظر اٹھارویں صدی کی ابتدا کا تھا، غور کیا جائے تو تمام برصغیر کی تصویر دنیا جہاں سے عجب اور جدا ہی تھی، یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا غلبہ بھی تھا اور مغلیہ سلطنت کی تاجداری اور شہنشاہی بھی، مختلف ریاستوں میں نواب اور امیر خود مختار بھی تھے اور رجواڑوں میں راجے مہاراجے بھی، اس خطے میں جہاں مختلف قومیتیں، نسلی گروہ اور کئی مذاہب کے لوگ آباد تھے۔

بڑی اقوام ہندو، مسلمان اور عیسائی تھے، کسی بھی قوم کی ترقی میں معاشی اور علمی برتری اہمیت رکھتی ہے۔ مسلمان اپنے حال میں مست تھا۔ ان کی تہذیب و تمدن کے عناصر میں چند پہلو نمایاں تھے، جن میں عیش و عشرت، سہل پسندی، ناعاقبت اندیشی شامل تھے۔ بٹیر اور مرغ بازی، قمار بازی، مے کشی، مجرے اور دنوں پہ محیط شطرنج کی بازیاں، زندگی گزارنے کے طریق تھے، ان میں کچھ عادات و اطوار حکمراں اور امراء کے تھے اور کچھ عوام کے مشاغل تھے۔ انڈے لڑانے اور گولہ کبوتر اڑانے والی نظریں نیچے زمین پر ہی دیکھتی رہیں، ارد گرد اور آسمانوں کے جائزے کے لیے اوپر نہ اٹھیں، ٹیپو سلطان اور نواب سراج الدولہ کب کے شہید ہو چکے تھے، اب ان کے بعد والے "پدرم سلطان بود" کے نعرے اور دعوے کے ساتھ زندگانی گزار رہے تھے۔ 1857ء آیا تو حالات جیسے شکاری کے جال کی طرح ہو گئے جو الگ الگ کئی پھندوں کا بنا ہوا ہو اور الجھا ہوا بھی ہو، قصور سب کا تھا گناہ گار فقط مسلمان ٹھہرا۔ سرسید احمد خان نے بدرالدین طیب کو خط میں لکھا۔

"غدر کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے، پیچھے ہو پڑے، ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

اس زمانے کے بارے میں سرسید نے مزید لکھا۔

"یہ بدبختی کا وہ زمانہ ہے جو 57ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پہ گزرا، کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانے میں ہوئی اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، ان دنوں میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں، وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں فسادی کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا ہے۔"

(آج بھی دنیا بھر میں ہونے والے ہر فساد، خرابی اور مصیبت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ دنیا کا بااثر اور طاقتور میڈیا مسلمان کی رائی بھر برائی بھی پہاڑ بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سو فیصد نہ سہی پچاس فیصد اپنی تنزلی، زبوں حالی اور خواری کا ذمہ دار خود مسلمان ہی ہے۔)

تو سارا گناہ اور سارا قصور نکلا تو فقط مسلمان کا

جس سے بڑی منصوبہ بندی سے بدلہ لیا گیا، مسلمان کے لیے سرکاری دفتروں میں نائب قاصد، چپراسی یا دوات میں سیاہی بھرنے سے زیادہ درجے کی ملازمت ملنا ناممکن تھا۔ بنگال میں مسلمان عہدے داروں کا تناسب دس فیصد سے بھی کم ہو گیا اور پنجاب میں مسلمان اساتذہ اور طلبہ کی تعداد گھٹا کر ایک تہائی کر دی گئی۔

مسلمانوں کے گھر تو مسمار ہوئے ہی ہوئے مگر انگریز اپنے غصے میں لال قلعے اور شاہی مسجد کو بھی مسمار کرنے کی تجاویز دے رہا تھا۔ مگر اس کام کے لیے ایک کثیر رقم اور طویل مدت کی ضرورت تھی۔ سو یہ تجویز مسترد ہو گئی۔ شاہی مسجد ضبط ہوئی، فتح پور مسجد کا بیشتر حصہ نیلام کر دیا گیا، دریا گنج کی مسجد میں نانبائی کا کاروبار شروع ہو گیا۔ قلعہ میں فرنگی سپاہیوں کی بارکیں بن گئیں۔ (بحوالہ "حرف شوق" از مختار مسعود)

مسلمان ایک مرد بیمار کی حیثیت سے نیچے گرا پڑا تھا اور اس کے علاج اور دوبارہ کھڑا کرنے میں کچھ لوگ آگے آئے۔ مریض کو جانچ کر ہر معالج نے الگ الگ نسخہ تجویز کیا۔ بجنور کے "صدر الصدور" [illegible] نے ایک نسخہ تجویز کیا جدید علوم کے حصول کا [illegible] صرف نسخہ ہی نہیں تجویز کیا بلکہ علاج کے لیے آگے بڑھ کر تن [illegible] گئے، علی گڑھ میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی گئی۔ 8 جنوری 1877ء کو سنگ بنیاد رکھا گیا اور پھر اس [illegible] سے تناور درخت لگا اور وہ پھل پیدا ہوئے جنہوں نے [illegible] کی تندرستی میں اہم کردار ادا کیا اور جو تحریک پاکستان کا ہراول دستہ قرار پائے۔

☆☆☆

گیس کے ہنڈولوں اور مشعلوں نے پورے ماحول کو روشن کر رکھا تھا، درجنوں کی تعداد میں خیمے لگے ہوئے تھے اور تاحد نگاہ چمک نظر آ رہے تھے۔ پرتکلف اور پرلطف طعام سے فراغت کے بعد شکار کی تیاری تھی۔ ہانکا کرنے والوں کی ٹولیاں ہر اس شے سے لیس تھیں جسے بجا کر شور مچا کے جانور کو شکار کے لیے اپنی مطلوبہ جگہ پہ لایا جا سکتا ہے۔ ڈھول، کنستر، ٹین کے ڈبے، ان پہ مارنے کے لیے لکڑیاں، سارے لوازمات سے لیس، ہانکا کرنے والوں کی ٹولیاں ایک ترتیب سے گھنے جنگل کے کچھ اندر پہنچ گئے اور پھر کان پڑی آواز نہ سنائی دی جب ڈھول تاشوں کی آوازوں میں جانوروں اور پرندوں کی دھاڑ، چنگھاڑ اور چکار بھی شامل ہو گئیں۔

جنگل کے اس حصے میں کھلبلی سی مچ گئی، ہراساں جانور بے ہنگم شور شرابے سے گھبرا کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، ہانکا کرنے والے انہیں دھیرے دھیرے بڑی چابک دستی سے اس صاف قطعہ زمین پر لا رہے تھے جہاں شکاری اپنے اپنے ہتھیار لیے چوکس کھڑے تھے۔ بالآخر شکاری اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ایک شیر، تین ہرن، آج پہلی کامیابی تھی۔ آگے ابھی اور دن باقی تھے شکار کے لیے، باورچی ہرنوں کی کھال اتار کر اس کے کباب اور دوسرے پکوان بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ خان بہادر سید قاسم علی شکاری لباس میں ملبوس، برجس اور فل بوٹ پہنے تیار کھڑے تھے۔ سر پہ ہیٹ، ہاتھ میں بندوق، شیر کی لاش سامنے پڑی تھی، کلکتہ سے مشہور فوٹو گرافر مسٹر جیک آرتھر بھاری معاوضے کے عوض ان کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے تین ٹانگوں والے اسٹینڈ پر کیمرہ رکھا۔

ہر زاویے سے اسے دیکھا بھالا، قاسم علی نے مردہ شیر پر اپنا پیر رکھا اور ہیٹ تھوڑا ترچھا کیا تاکہ چہرہ صاف دکھائی دے۔ تصویر کھینچ لی گئی اور ایک گروپ فوٹو بھی بنا۔ جس میں ان کے دونوں بیٹوں سمیت دوسرے شکاری حضرات بھی تھے۔ یہ دونوں فوٹو ان کے خاندانی البم کی زینت بنے جو آج بھی برطانیہ کی وسیع و عریض جاگیر کی اس شاندار حویلی میں محفوظ تھے، جہاں مکینوں کا سامان اور ان کی یادیں باقی رہ گئی تھیں۔ پہلے تو سال چھ ماہ میں بھی وہ سارے بھائی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ کسی موقع کو،

WOMEN SKILLS GROUP

کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے اب وہ سلسلہ بھی دھیرے دھیرے دم توڑتا جا رہا تھا۔ مستقل رہائش ان ملازمین کی تھی جو سارا سال اس مکان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

شکاری مہم کامیاب رہی تھی۔ بہت شکار کیا، خوشی کی بات تھی مگر افسوس علی کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی پر خوشی منانی نصیب نہ ہوئی۔ اس کامیابی کے ساتھ ایک ایسا غم جڑ گیا، ایک ناگہانی آفت گئی کہ ساری کامیابی، ساری خوشی دھندلا کر پیچھے ہو گئی۔

آخری دن شکار کے دوران وہ زخمی چیتا نہ جانے کہاں سے اچانک نمودار ہو گیا جو ایک روز پہلے زخمی ہوا تھا اور بھاگ نکلا تھا۔ اس کے اچانک نکل آنے پر ہڑبونگ سی مچ گئی شکاریوں کو بندوقیں سیدھی کرنے کا بھی موقع نہیں ملا، اس نے جو سیدھی جست لگائی تو قاسم علی کا بڑا بیٹا زد میں آیا۔ آنا فاناً وہ اسے شکار کو گھسیٹ کر لے گیا۔ شکاریوں کی چلائی ہوئی گولیاں بھی کچھ کام نہ آسکیں۔ آنا فاناً آنکھوں کے سامنے پہلوٹھی کی اولاد یوں چلی گئی کہ قاسم علی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لاش تلاش کرنے میں بھی ناکامی ہوئی۔ جنگل کے شروع حصے میں کہیں سراغ نہ ملا اور اس گھنے اندھیرے اور بھیانک جنگل میں اندر تک جانے کا حوصلہ کسی کو نہ ہوا۔ ناچار خالی ہاتھ ہی لوٹنا پڑا۔ اس کی ماں کو دکھانے کے لیے انہیں بیٹے کا خون آلود کپڑا تک نہ ملا جس کا بندوبست برادران یوسف نے بھی کر لیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ غداری اور دھوکا دہی کی اور والد کے ساتھ جھوٹ فریب اور مکاری کا سلوک کیا۔

قاسم علی یہ سب کام پہلے ہی کر چکے تھے اپنے محسنوں کے ساتھ غداری، دھوکا، جھوٹ، فریب مکاری اب حقیقت کا سامنا کرنے اور بیوی کو باور کرانے کے لیے ان کے ہاتھ خالی تھے۔ بیٹے اور بھی تھے ماشاءاللہ کئی تھے مگر وہ سارے مل کر بھی اس ایک کی کمی پوری نہیں کر سکتے تھے جو ان کی آنکھوں کے سامنے ان سے قضا کا فرشتہ اچک لے گیا تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئے، آنکھوں میں جو اذیت اور جسم و جان میں جو تڑپ اس وقت در آئی وہ آخری سانس تک ان کے ساتھ رہی۔

ایک بیٹے سے ہی تو محروم ہوئے تھے باقی سب کچھ تو تھا ان کے پاس، دوسرے بیٹے، بیٹیاں ان کی اولادیں اور خوشیاں، زمین، جاگیر، جائیداد، روپیہ پیسہ، جانور، گاڑیاں، نعمتیں، آسائشیں، سب کچھ ویسے ہی تھا پھر بھی بیٹے کی ناگہانی موت، اور اس کی کمی زندگی بھر بھلا نہیں سکے۔ سلوت جہاں کو خبر ملی تو ان سے یہ صدمہ برداشت نہ ہوا۔ پے در پے غشی کے دوروں اور تین ماہ کی علالت کے بعد وہ انتقال کر گئیں۔

☆☆☆

خان بہادر سید قاسم علی نے اپنی بیوی کو اور بیٹے کی موت کا غم بھلانے کے لیے ایک بیاہ اور کر لیا۔ متوسط گھرانے کی روشن آرا کی سب سے بڑی خوبی اس کی کم عمری اور خوب صورتی تھی۔ پچاس کے ہندسے کو چھوتی قاسم علی کی ادھیڑ عمری کی بے رونقی میں کچھ رنگینیاں آگئی تھیں۔ دل پر لگے زخموں کی کسک اور دکھن کو روشن آراء کے وجود سے فراموش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شادی کے تیسرے برس ایک خوب صورت، صحت مند بیٹے کے باپ بنے تو انہیں لگا کہ دل پر لگے زخموں کے مندمل ہونے کا وقت آگیا ہے مگر یہ بھی ان کی خام خیالی ہی رہی۔

انسان کو مستقبل کا علم نہیں دیا۔ اگر دے دیا جاتا تو وہ پاگل، دیوانہ ہو جاتا یا جوگی جنونی بن کر صحراؤں کی خاک چھاننے نکل پڑتا۔ آنے والے وقت سے بے خبری ایک بڑی نعمت ہے۔ قاسم علی کو ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں ان کے لیے کیا سمیٹ کر لا رہا ہے تو وہ شاید یہ بیاہ نہ کرتے۔

☆☆☆

چند تحریروں نے محدود حلقے میں شناخت اور اپنی ذات اور صلاحیت پر اعتماد تو دے دیا۔ مگر ابھی وہ منزل اور کامیابی جو دور تھی جس کی تمنا تھی۔ وہ ایک ناول لکھنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

"میں انڈیا جا رہا ہوں۔" ڈنر ٹیبل پر اس نے اچانک اعلان کیا۔

"انڈیا؟" مہر ولی اور زرتاج نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

"ایک ناول لکھنا ہے وہاں کے پس منظر میں۔" ہیڈی نے کانٹے میں لگے ہوئے گوشت کا ٹکڑا پھنسایا اور منہ میں لے گیا۔

"آپ ایک بار ذکر کر رہے تھے کہ آپ کی خاندانی حویلی اور جاگیر وغیرہ ہے۔ رشتے دار بھی ہیں۔" ہیڈی جس اطمینان سے کھا رہا تھا اسی اطمینان سے بول رہا تھا۔ مہر ولی کو اچنبھا بھی ہوا اور ایک غیر محسوس سی ناگواری بھی۔

"خاندانی حویلی اور جاگیر میں سے اپنا حصہ لے چکا ہوں اور وہ سب بیچ کر ہی یہاں آیا تھا۔ اب وہاں جو کچھ ہے۔ میرے بہن بھائیوں کا ہے۔" مہر ولی قریباً [illegible] برس کی عمر میں بھی اپنا مزاج اور تنتنا تیز [illegible] تھے۔

"وہ بہن بھائی جن سے آپ نے ایک طویل مقدمہ لڑا تھا؟" ہیڈی نے سرسری سا سوال کیا۔

"کیوں نہیں؟" مہر ولی نے کندھے اچکائے۔ "اپنا حق لینے کے لیے میں کسی سے بھی لڑ سکتا ہوں چاہے میرے بہن بھائی ہوں یا میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔"

انہوں نے سچ کہا تھا۔ ان کے باپ کو ویسے ہی قاسم علی کی طرف سے بہت کچھ ملا تھا۔ جو مہر ولی کے دادا تھے مگر جب مہر ولی کے والد کا انتقال ہوا تو وہ تعلیم کے لیے لندن آیا ہوا تھا۔ مہر ولی کی عمر اس وقت بمشکل چوبیس پچیس سال تھی۔

تعلیم مکمل کر کے وہ ہندوستان واپس گیا تو سب سے پہلا کام اس نے اپنے حصے کی جائیداد لینے کا کیا تھا۔ بہت کم عمری میں وہ اپنی زندگی کی ترجیحات اور اہداف طے کر چکا تھا۔ اس کی ترجیحات میں زرتاج بھی شامل تھی جس سے وہ لندن میں ملا تھا وہ اس سے شادی کا فیصلہ کر چکا تھا اور اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اسے ہندوستان میں رہنے کے بجائے لندن میں سیٹل ہونا ہے جس کے لیے وہ بہت لمبی منصوبہ بندی کر چکا تھا۔

وہ لوگ تین بھائی تھے۔ بڑے دونوں بھائی اس کے مقابلے میں ایک تھے۔ وہ جائیداد کا بٹوارہ کرنے کے حق میں نہیں تھے اور اس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ بھی انڈیا میں ہی ان کے ساتھ مشترکہ جائیداد میں رہے۔ مہر ولی نے مقدمہ کر دیا۔ دو سال مقدمہ چلا، زرتاج مہر کے خط پہ خط اس کے نام آرہے تھے۔ تیسرے سال جب وہ بھی بے زار ہو رہا تھا اور دونوں بھائی بھی شاید تھک رہے تھے پھر ماں کا دباؤ دونوں بھائیوں پر چل گیا۔ انہوں نے مہر ولی کے حصے سمیت اپنا حصہ بھی اسے دے دیا۔ وہ بس یہ چاہتی تھیں کہ بیٹا جہاں بھی جائے، خوش رہے اور کبھی کبھار شکل دکھا دیا کرے مہر ولی ان سے وعدہ کر کے تو آیا تھا کہ وہ ہر سال ان سے ملنے آئے گا مگر وہ اپنا وعدہ چار سال بعد اس وقت بھی نہ نبھا سکا جب ان کی موت کا ٹیلی گرام ملا، وہ تب بھی نہیں جا سکا۔ وہاں جا کر کیا کرتا؟

اس کے حقیقت پسند دماغ نے تاویل پیش کی کہ اب جب کہ ماں کا انتقال ہو چکا ہے تو جانے کا کیا فائدہ؟ بھائیوں سے تعلق بس رسمی ہی تھا۔ نہ ہونے کے برابر، سات سمندر پہلے ہی راہ میں حائل تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فاصلے مزید بڑھتے ہی چلے گئے تھے ویسے بھی اس وقت اس کے دوسرے بچے کی پیدائش قریب تھی۔ سو وہ سرزمین اس سے یوں چھوٹی کہ نصف صدی گزرنے پر بھی اس کے قدم وہاں لوٹ کر نہیں گئے۔ اب بیٹے نے جانے کی بات کی تو مہر ولی کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ مگر خیر بیٹے کی زندگی اور مرضی اس کی اپنی تھی پھر وہ اپنا کیریئر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ولی مہر اور بیٹوں کی طرح اسے بھی بزنس لائن میں ہی لانا چاہتا تھا مگر اس کا شوق اور رجحان دوسری طرف دیکھ کر وہ کچھ وقت کے لیے ٹھہر

WOMEN SKILLS GROUP

گیا تھا۔ مغرب میں اگر کوئی لکھاری شہرت و مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگے تو بن کی بارش بے طرح برس کر اسے بھگو دیتی ہے۔

اس معاملے میں مشرق اور مغرب کا مزاج جدا ہے روایات اور رجحان الگ ہیں، خطہ مشرق میں وہ لکھنے والے خوش نصیب کہلاتے ہیں جو مقبول عام کی سند پائیں تو خوشحالی اور معاشی بے فکری ان کا نصیب بنے۔ ولی شاہ کے گھرانے میں دولت، مقبولیت اور شہرت پہلے سے تھی۔ اس کا اپنا بزنس، زرتاج مہر کی مصوری، دونوں اپنے اپنے شعبوں میں نامور تھے۔ لیکن اگر ہیڈی کے ذریعے شہرت کا ایک اور زاویہ ایک اور دروازہ اس کے گھرانے سے جڑ جاتا تو کیا برائی ہے۔ مزید دولت مزید شہرت، مزید عزت، مزید ناموری کسے بری لگتی ہے؟

ولی شاہ نے اپنے بیٹے کو مکمل سپورٹ کیا تھا۔ ہیڈی ہندوستان چلا آیا۔ یہ وہ ہندوستان نہیں تھا جسے اس کا باپ پچاس سال پہلے چھوڑ کر آیا تھا۔ یہ تقسیم شدہ ہندوستان تھا۔ پاکستان کو بنے ہوئے تینتالیس سال اور بنگلہ دیش کو بنے ہوئے انیس بیس سال ہو چکے تھے۔

یہاں اس کے رشتہ دار بہت تھے۔ اور ان کے پاس سنانے کو کہانیاں بھی تھیں، اس کے دادا پردادا کی کہانیاں، ان کی حویلیوں، جاگیروں، زمینوں اور جائیدادوں کے قصے، بے پناہ امارات کی داستانیں، جن میں حیرت و ہیبت بھی تھی اور حسرت و عبرت بھی، سننے اور سنانے والے پر منحصر ہے کہ وہ کون سا زاویہ منتخب کر کے اسے اہمیت دیتے ہیں۔

ہیڈی کے طویل قیام کا ایک حصہ ان تمام عمر رسیدہ رشتے داروں کے ساتھ گزرا جو اسے گزری نسلوں اور گزرے وقتوں کی کہانیاں سناتے تھے۔ کچھ قصے محیر العقول بھی تھے اور کچھ عجیب و غریب بھی۔ اس کے دادا کے ایک بھائی کو شیر نے اپنا شکار بنا لیا اور اس کے پردادا نے اپنی بیوی اور بیٹے کی وفات کے بعد جو چوتھی شادی رچائی تو کچھ سال بعد ان کی نوعمر، حسین

بیوی اور نومولود بیٹا اچانک انتقال کر گئے۔ دونوں کی موت پراسرار حالات میں ہوئی مگر قاسم علی کی وفات تک کسی کو اس معاملے میں لب کشائی کی ہمت نہیں ہوئی۔ اندرون خانہ چہ مگوئیاں ہوئیں مگر بے حد دبی زبان میں۔

"تو اصل کہانی کیا تھی؟" ہیڈی کا تجسس جواب چاہتا تھا۔

"پتا نہیں میاں! اب تو برسوں گزر گئے، خدا جانے اس کے وہ بندے جانیں جو یہ راز اپنے ساتھ ہی قبروں میں لے گئے۔" بڑے میاں نے جو کچھ سنا تھا، وہ ہیڈی کو بتایا۔ اس سے زیادہ انہیں کچھ علم نہیں تھا مگر خیر ہیڈی کے لیے یہ کوئی ایسا مشکل معاملہ نہیں تھا۔ جہاں حقیقت معلوم نہ ہو، تجسس کا جواب ٹھیک سے نہ ملے وہاں تخلیقی کارفرمائی فکشن میں چار چاند لگا دیتی ہے وہ صرف آؤٹ لائنز تلاش کرنے آیا تھا مکمل حقائق نہیں۔ ان آؤٹ لائنز میں وہ اپنی مرضی اور اپنے تخیل کے رنگ بھرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تاکہ اس کی تحریر ایک کامیاب فکشن قرار پائے۔ سیدھے سادے حقائق کون پڑھتا ہے؟ جب تک کہانی میں رنگ آمیزی، مبالغہ آرائی، خیال کی کارفرمائی چٹ پٹے انداز میں نہ ہو، اسے مقبولیت ملنی مشکل ہے۔

ہیڈی کا تین ماہ کا قیام بہت دلچسپ اور معلوماتی رہا۔ وہ ان تمام شہروں میں گھوما پھرا، جہاں اس کے رشتے دار مقیم تھے۔ گو کہ اب نسل در نسل جائیدادوں کی تقسیم اور ہندوستان میں جاگیرداری سسٹم کے خاتمے کے بعد قاسم کی تیسری، چوتھی نسل میں وہ امارت تو نہ رہی جو پہلے کبھی تھی مگر پھر بھی دونوں خوشحال تھے۔ کچھ لوگ دوسرے ممالک میں سیٹل ہو گئے تھے۔ مہر ولی کی طرح اور قاسم علی کی نسل کی ایک شاخ پاکستان میں مقیم تھی۔

ہیڈی نے پاکستان کا وزٹ اگلے وقت کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ یہاں وہ لوگوں سے ملنے کے بعد مسجدوں، مندروں، گردواروں میں گیا۔ چرچ دیکھے۔ تاریخی مقامات اور عمارتیں دیکھیں، جنگلات

کی، میدانوں کی خاک چھانی، ہر جگہ کی اپنی ایک کہانی تھی اس نے ان کی کہانیاں بھی سنیں اور جب لندن واپس ہوا تو وہ لبالب بھرا ہوا تھا، اس نے قلم اٹھایا اور سب کچھ کاغذ پر انڈیلنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

رفعت بیگم کی اچانک موت نے سب کا دل دہلا دیا تھا مگر بوا کا دل دہلنے کے ساتھ ساتھ سہم بھی گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو اس موت کا ذمہ دار قرار دے رہی تھیں۔

"نہ میں اس منحوس کے بارے میں بی بی کو بتاتی نہ وہ اپنے نازک دل پر یہ صدمہ لیتیں، خدا کی مار اس غدار پر، ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے۔ کلیجہ کٹ کٹ کے گرے، تڑپ تڑپ کے مرے، قبر میں سانپ بچھو کاٹیں، اس خاندان کے پیچھے ہی پڑ گیا۔ اتنوں کو کھا کر بھی سکون نہیں ہوا، ایک جان اور لے لی۔"

بوا کو اب دن اور رات یہی ایک کام رہ گیا تھا۔ ساری بددعائیں اور کوسنے قاسم علی کے لیے وقف کر دیے تھے۔ ان کا یہ معمول دو سال تک رہا، جب تک انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ نور فاطمہ اپنی خالہ بیگم کے زیر سایہ عمر کی منزلیں طے کر رہی۔ پندرہ برس کی عمر میں مرزا اسد سے ان کی شادی کر دی گئی۔ مرزا اسد گو کہ ایک کم عمر نوجوان تھے مگر شعور اور ذہانت عمر سے آگے تھے۔ مدرسے کی رسمی تعلیم حاصل کی تھی، جو اس دور کے حساب سے معروف اور رائج تھی۔

زندگی بڑی بھلی گزر رہی تھی، ان کے چار بچے تھے دو بیٹے، دو بیٹیاں پھر دو بیٹے، نور فاطمہ ایک تحمل مزاج اور اطاعت شعار بیوی تھی۔ بچے ابھی چھوٹے تھے کہ مرزا اسد نے ان کے بارے میں ایک فیصلہ کر لیا ایسا فیصلہ کہ جس نے سنا انگشت بدنداں رہ گیا، مرزا اسکندر جو بستر علالت پر تھے۔ جوش کے مارے اٹھ بیٹھے، غصے نے ان کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔

"تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، اولاد کو دین کی تعلیم دی جاتی ہے انہیں اچھا مسلمان بنایا جاتا ہے یا اسکول میں داخل کرا کر کفر کی تعلیم دی جاتی ہے"۔ مرزا اسد نے انہیں اتنے غیض و غضب میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں صرف انگریزی تعلیم دلانا چاہتا ہوں اپنے بچوں کو اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

"انگریزی تعلیم؟ یعنی کفر کی تعلیم؟ کرسٹان بناؤ گے اپنے بچوں کو؟"

"معاذ اللہ، ایسا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے، ہم انہیں قرآن اور دین کی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی دلانا چاہتے ہیں۔" اس بار مرزا اسد نے فصیح کر کے مکمل بات کی۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں، کس لیے؟ کس لیے یہ کفر کی تعلیم دلوانی ہے، کرسٹان نہیں بنانا تو کیا ان کا غلام بنانا ہے بچوں کو، نوکری کروانی ہے سرکار کی؟ رئیس ابن رئیس خاندان ہے ہمارا، اب سے نہیں، کئی پشتوں سے اس برے حال میں بھی اپنی آن بان اور شان ہم نے قائم رکھی ہے۔ ہمارے ہاں نوکر بننے کا نہیں، نوکر رکھنے کا رواج ہے سمجھے تم۔"

"میں آپ کو کیسے سمجھاؤں، جدید تعلیم نہ کرسٹان بننے کے لیے نہ نوکری کے لیے، یہ وقت کی اہم ضرورت ہے، ہماری آئندہ نسلوں کی بقا اور فلاح ہے اس میں۔"

"کیسی فلاح؟ کیسی بقاء؟" مرزا اسکندر ان کی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔

"جب تک ہم وہ علم حاصل نہیں کریں گے جو ہمارے حاکموں کے پاس ہے، ہم نہ ان سے مقابلہ کر سکتے ہیں نہ انہیں یہاں سے نکال سکتے ہیں۔"

"اولاد کو انگریزی پڑھا کر تم فرنگیوں کا مقابلہ کر لو گے، انہیں یہاں سے نکال دو گے۔ چہ خوب۔" ان کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ آئی۔

"آپ سمجھ نہیں رہے بابا جان!" مرزا اسد نے بے بسی سے ہاتھ سہلائے۔

"ہم خوب سمجھ رہے ہیں، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اپنے خاندان پر تنقید کرنے ... اپنے خیالات اور حماقتیں درست کرو ... حریم پریشان مت کرو کر ہم بہت سی باتیں کرنے لگ جائیں گے۔"

مرزا سکندر کا لہجہ اتنا سخت اور دو ٹوک تھا کہ وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ گھر میں کیا، پورے خاندان میں ... کا صاف ہر خواتین کے اس ارادے اور فیصلے کے خلاف۔ مرزا اسد کو اور شہزادوں کی پرواہ نہ ہو ... مرزا سکندر اور عید بیگم کی مرضی کے خلاف وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ حمید بیگم بھی سمجھا بجھا کر اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

بالآخر مرزا اسد کو سوچنا پڑ گیا۔ ان کے چاروں بیٹے ... تعلیم حاصل کر رہے تھے جو انہوں نے ... ڈاکٹری پڑھنے کے لیے ... گھر آ گئے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے انہیں اور نور فاطمہ کو تعلیم دلائی گئی تھی۔

مرزا اسد اپنے وقت، اپنی دنیا اور زمانے کے حساب سے بہت آگے کی اور روشن خیال سوچ رکھنے والے انسان تھے مگر ان کے پاس کوئی راستہ کوئی سہارا نہ تھا کہ وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکتے یا کم از کم اپنے حریم کی ... کو عملی شکل دے سکتے۔ وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئے۔ انہوں نے مایوسی کے عالم میں سوچا کہ جس طرح انہوں نے اور ان کے بڑوں نے زندگی کو ایک دائرے میں رہ کر جیا ہے، ان کی آنے والی نسلیں بھی شاید اسی طرح زندگی بسر کریں گی۔ ایک مخصوص دائرے کے قیدی بن کر۔ مگر ان کی یہ مایوسی آگے چل کر غلط ثابت ہوئی۔

☆☆☆

گھنٹی کی مدھم آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ چونکیں۔ ابھی تو ... صوفے پر بیٹھی ٹی وی پروگرام سے لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ اب اس وقت کون آ گیا۔ "سیلز مین ... ایک تو ... کی لائن ہی لگ جاتی ہے۔ کبھی انشورنس والے کبھی سیلز مین" ... دل ہی دل میں ... کرتی ہوئی دروازے تک پہنچیں۔

"کون ہے؟"

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو میری جان!" بہت میٹھی اور بہت مانوس آواز جو بہت عرصے بعد سنی تھی۔

"ممی!" دروازہ کھول کر وہ ماں سے لپٹ گئی ... ہونے کے باوجود بھی وہ ہمیشہ ان سے قریب ... سے قریب۔

ان کے ہاتھوں میں جو گل دستہ تھا اس کے پسندیدہ ... ٹیولپ کے پھول، اس نے جا کر کونے میں ... رکھ دیا ہے۔

"آنے کا بتایا کیوں نہیں؟" نور فاطمہ بچوں کی طرح خوش اور بے حد خوش ...

"بتا دیتی تو سرپرائز ختم ہو جاتا نا۔" حدیقہ مسکرائیں۔ ہاتھ میں پکڑے شاپرز انہوں نے نور فاطمہ کو دیے "تمہارے اور پاپا کے لیے تحفے ہیں۔"

"تھینکس۔" فاطمہ کی آنکھیں اس غیر متوقع خوشی سے جگمگا رہی تھیں۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کی سالگرہ کا گفٹ اس تک پہنچ ہی جاتا، کبھی کوریئر سروس کے ذریعے کبھی حدیقہ خود آ جاتیں۔

"آپ کمزور لگ رہی ہیں؟"

"کمزور یا اسمارٹ، دیکھو میں پہلے سے کتنی سلم ہو گئی ہوں۔" حدیقہ نے اپنی مسکراہٹ کو بھرپور اور جاندار بنانے کی کوشش کی تھی۔

"تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں۔ اچھا آپ آرام کریں۔ گرینڈ پا شام میں یا پھر ہو سکتا ہے رات میں آئیں۔"

"ٹھیک ہے، تم اپنا گفٹ دیکھو، تمہیں ضرور پسند آئے گا۔" نور فاطمہ جب تک اپنا تحفہ کھولنے اور دیکھنے میں مگن رہی، حدیقہ تب تک اسے دیکھتی رہیں۔

جیڈ اور سفید پرل کا بنا بہت قیمتی اور خوبصورت لاکٹ تھا۔ نور مبہوت ہو گئی۔

"یہ تو بہت مہنگا ہو گا، ہے نا۔"

"تم سے زیادہ نہیں۔" حدیقہ نے جس طرح پیار سے اسے اس وقت دیکھا تھا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں خاص طور پر داؤد سے ملنے آئی ہوں یہاں، دیکھوں تو کون پرنس ہے جسے ہماری پرنسس نے منتخب کیا ہے۔"

"کیوں نہیں، کل ڈنر کرتے ہیں داؤد کے ساتھ۔" نور فاطمہ جو اپنی گردن میں لاکٹ لگا کر جائزہ لے رہی تھی پرجوش ہو کر بولی۔

"ڈنر نہیں لنچ پر۔"

"لنچ پر کیوں؟" نور نے نہ سمجھنے والے انداز میں ماں کی طرف دیکھا۔

"کل رات میں واپس چلی جاؤں گی۔"

"کیا؟ اتنے عرصے بعد آپ آئی ہیں وہ بھی صرف ایک دن کے لیے، اٹس ناٹ فیئر ممی۔" نور فاطمہ نے ناراض نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"بہت سے کام نمٹانے ہیں نور، وقت کم ہے میرے پاس۔"

"اچھا، کم سے کم دو دن تو رک جائیں۔"

"تمہاری شادی پر آؤں گی نا، پھر رکوں گی۔ تمہارا برائیڈل ڈریس چوز کرنے میں تمہاری ہیلپ کروں گی۔" حدیقہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھیں اور نور مسکرا دی۔

"گرینڈ پا کہتے ہیں کہ آپ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر میرے لیے اتنا لمبا سفر کر کے آتی ہیں تو مجھے آپ سے شکایتیں نہیں کرنا چاہئیں نہ ہی ناراض ہونا چاہیے۔ اس لیے" وہ چند لمحوں کے لیے رکی۔

"آپ کے آنے کا اور تحفے کا شکریہ اور شادی میں آنے کا بھی پیشگی شکریہ۔"

"محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں۔ شکریہ نہیں۔" حدیقہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم جب تک اپنی اور داؤد کی وہ البم نکالو جو دکھانے کا کہا تھا تم نے، میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔"

کچھ دیر میں جب وہ واپس آئیں تو نور البم گود میں رکھے ان کی منتظر تھی۔ حدیقہ نے البم اس سے لے لی اور دیکھنے لگیں۔

"ویری چارمنگ!" ان کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"تم خوش ہو ڈارلنگ؟" انہوں نے اچانک ہی نور کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" نور نے مسکراہٹ دبائی، اس کی آنکھوں میں اعتماد تھا حدیقہ نے البم بند کی اور ایک گہری سانس لی۔

"تمہارے چہرے اور آنکھوں میں جو خوشی ہے خدا اسے ہمیشہ قائم رکھے۔"

گرینڈ پا شام میں گھر آ گئے تھے اور حدیقہ کو دیکھ کر وہ بھی نور کی طرح ہی خوش ہوئے تھے۔

"اچھا ہوا تم آ گئیں، ہم لوگ اکثر تمہاری باتیں کرتے ہیں۔" گرینڈ پا بے حد خوشی سے کہہ رہے تھے۔

"آپ دونوں خوش نصیب ہیں۔ ایک دوسرے سے اپنی ساری باتیں کر لیتے ہیں۔" حدیقہ اداسی سے مسکرا دیں۔

"پرتکلف ڈنر کے بعد گرینڈ پا نے اسپیشل عربی قہوہ بنایا تھا۔ جسے حدیقہ پسند کرتی تھیں۔

"تھینک یو پاپا! آپ کی قدر دانی مجھے اپنی نظروں میں بڑا معتبر کر دیتی ہے۔" حدیقہ نے قہوے کا گھونٹ لیا اور بے ساختہ کہا۔ نور فاطمہ نے ان دونوں کی باتوں میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور بیڈ روم میں چلی گئی۔ جہاں وہ حدیقہ کی شب بسری کا بندوبست کر رہی تھی۔

"کبھی کبھی مجھے بہت گلٹی فیل ہوتا ہے، میں نے شاید بہت خود غرضی دکھائی ہے۔" بہت دیر خاموشی کے بعد حدیقہ گویا ہوئیں۔

"تم ینگ تھیں۔ تمہارے سامنے ایک طویل زندگی پڑی تھی۔ جسے اکیلے گزارنا کوئی دانش مندی نہیں، تم نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔" گرینڈ پا نے ان کے احساس جرم کو کم کرنے کی کوشش کی۔

"میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ اپنی میرڈ

WOMEN SKILLS GROUP

ذات کو قائم رکھنے کے لیے مجھے اپنی بچی کو چھوڑنا پڑا۔" حدیقہ کے لہجے میں آواز میں بوجھ در آیا تھا۔

"اس لحاظ سے حدیقہ! تم نے اپنی بچی کو غلط یا غیر محفوظ ہاتھوں میں نہیں دیا۔ اور دیکھا جائے تو تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میرے لیے اکیلے زندگی گزارنا شاید بہت مشکل ہوتا۔ نور کے وجود نے میری بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے رنگ بکھیرے ہیں۔ میری مشکلات کو بہت حل کر دیا تمہاری بچی اور میری پوتی، سچ پوچھو میں خود کو تمہارا احسان مند مانتا ہوں کہ تم نے نور کو میرے پاس چھوڑ دیا۔"

"آپ نے بہت اچھی پرورش کی ہے اس کی، میں شاید اتنی اچھی تربیت نہیں دے پاتی۔" حدیقہ نے جیسے اعتراف کیا اور قہوے کا آخری گھونٹ پیا۔

"اس کی شادی میں تو آؤ گی نا؟" گرینڈ پا نے موضوع بدل دیا۔

"ارادہ اور کوشش تو ہے مگر۔ شاید۔ پتا نہیں آسکوں گی یا نہیں۔" وہ کھوئی کھوئی سی بول رہی تھیں۔

"کیوں نہیں؟" گرینڈ پا نے ان کے غیر معمولی انداز پر ٹھٹک کر دیکھا۔

"وقت بہت کم ہے میرے پاس۔" حدیقہ نے گرینڈ پا کو دیکھا۔ ایک مضمحل مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا۔

گرینڈ پا کا وجدان انہیں متنبہ کر رہا تھا۔ انہوں نے مزید سوال نہیں کیا مگر حدیقہ خود ہی بتانے لگی تھیں۔

"کینسر کی تشخیص ہوئی ہے مجھے۔ ڈاکٹرز نے زیادہ مہلت نہیں دی ہے۔ قدرت اگر دے دے تو۔"

☆☆☆

سونے کے چوکھٹے میں جڑا آئینہ انہوں نے خاص روشن آرا کے لیے بنوایا تھا۔ سونے کے کئی زیورات تو وہ ویسے ہی اس کی نذر کر چکے تھے۔ یہ خصوصی تحفہ ایک بڑے ماہر کاریگر سے بنوایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک سونے کی کنگھی بھی تھی۔ کاریگر نے اپنی ساری مہارت اور ہنر اس میں سمو دیا تھا۔ قاسم علی کے سامنے یہ اشیاء لائی گئیں تو وہ بھی چند لمحوں کے لیے مبہوت رہ گئے تھے۔

"حضور کی نذر ہے۔" صناع اپنا ہنر ان کے سامنے رکھ کر خود باادب کھڑا تھا۔

"بہت خوب!" قاسم علی نے داد دینے میں بخل نہیں کیا۔

"ہمارے بڑوں کے وقتوں میں بادشاہ اپنی ملکاؤں کے لیے ایسے تحفے بنواتے تھے۔" کاریگر کی چرب زبانی پر قاسم علی نے اپنی نوکیلی مونچھوں کے سرے مروڑے۔

"ہم کیا کسی بادشاہ سے کم ہیں۔ وہ انعام دیں گے تمہیں کہ بادشاہوں کی داد و بخشش بھول جاؤ گے۔"

"دلاور! ان دونوں اشیاء کے برابر وزن کا سونا اسے دے دو۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔" قاسم علی نے اپنے دائیں طرف کھڑے مقرب خاص کو حکم دیا۔

"سرکار کا اقبال بلند ہو۔" کاریگر اپنی اور اپنی صناعی کی قدر افزائی دیکھ کر نہال ہی ہو گیا۔

"کرم الٰہی سے کہو بگھی تیار کروائے۔ چودھری رحمت اللہ کے جانا ہے۔" آئینہ اور کنگھی کا مخملیں کیس اٹھایا اور زنان خانے کی طرف چل دیے۔

روشن آرا بے حد بھاری زری گوٹے کا جوڑا تن پر سجائے دلہن کی سی سجی بنی چھپرکھٹ پر بیٹھی تھی۔ قاسم علی کو آتے دیکھا تو پاؤں نیچے لٹکا دیے۔ وہ شاید قاسم علی کے خیر مقدم کے لیے اترنا چاہ رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی قاسم علی کی بھاری گونجتی آواز اس تک پہنچی۔

"بیٹھی رہو۔" روشن آرا وہیں رک گئی، اس کی آنکھیں اور چہرہ جھکے ہوئے تھے۔ وہ کم گو تھی۔ بے حد کم گو قاسم علی چھپرکھٹ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا اور وہ مخملیں تھیلا اپنے اور روشن آرا کے درمیان رکھ دیا۔

"اسے نکالو۔" روشن آرا نے حکم کی تعمیل کی اور

آئینہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"خاص طور پر بنوایا ہے تمہارے لیے، اسے خواب گاہ کی دیوار پر لگوائیں گے۔" آئینے میں روشن آرا کا جھکا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا جیسے آرسی مصحف کی دلہن۔

"پسند آیا؟"

"جی!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس وقت تو ہم جا رہے ہیں تم یہ سنبھالو۔" وہ فوراً ہی عجلت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے نکل گئے۔ روشن آرا یک ٹک آئینے میں اپنی صورت تک رہی تھی۔

☆☆☆

بڑے سے چھتنار پلکھن تلے چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن پر معززین براجمان تھے۔ سب کے آگے حقے رکھے تھے۔ حقے کی نے منہ میں دبائے کش لیتے اور بات کرتے، یہ بڑی گونا گوں قسم کی محفل تھی۔ یہاں شطرنج کی بساطیں جمتیں اور بازیاں ہاری اور جیتی جاتیں۔ یہاں مرغ اور بٹیر بھی لڑائے جاتے، لوگوں کے بہت سے معاملات کے فیصلے بھی اس پنچایت میں ہوتے، پہلے اس کی میزبانی مرزا سکندر کرتے تھے، اب ان کے انتقال کے بعد مرزا اسد ان کے جانشین تھے، جن کا مزاج ان محفلوں اور ان کے مکینوں سے الگ تھا۔ خیالات جدا تھے اور طبیعت مختلف۔ ریت رواج کی بھرم داری کے لیے روایت نبھانے کے لیے وہ ان محفلوں میں شریک ہوتے مگر ان کی باتیں اور خیالات کچھ لوگوں کو چونکاتے اور کچھ کو متاثر کرتے، اپنے سب سے بڑے پوتے کو بارہ سال کی عمر میں علی گڑھ مدرسہ میں داخل کر کے آئے تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملیں۔

"میاں، اولاد کو فرنگی تعلیم دلواؤ گے، روز قیامت خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔" یہ ظاہر شیروانی تھے۔ مرزا سکندر کے عزیز دوست اور ان کے ہم خیال۔

"انیسویں صدی شروع ہونے والی ہے چچا، کیا خبر کیا زمانہ ہو؟ کیا حالات ہوں۔ کیا دور ہو، آنے والے وقت کے لیے اپنے بچوں کو تیار کرنا چاہیے۔" مرزا اسد نے متانت سے جواب دیا۔

"میاں تم بھی اس نیچری (سرسید احمد) کی باتوں میں آگئے۔ تمہارے بچوں کو کافر بنا دے گا شخص، فرنگیوں کی زبان مسلمان قوم کے بچوں کو کیوں سکھائی جا رہی ہے۔ ان کا پٹھو بنانے کے لیے؟"

ظاہر شیروانی اسی طرح کی عمومی بحث میں لگ گئے جو اس وقت کے مسلمان طبقے میں عام تھی۔

"چچا میاں۔ کسی قوم کی زبان محض اس لیے نہیں سیکھی جاتی کہ ان کا پٹھو بنا جائے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حاکموں کی بات سمجھنے میں اور اپنی بات سمجھانے میں آسانی ہو، اس کا مقصد یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جرأت اور بہادری کے ساتھ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہوں اور پھر معاملہ صرف ان کی زبان کا نہیں بلکہ اس علم کا بھی ہے جس کی بدولت وہ یہاں اور وہاں کہاں کہاں حکومت کر رہے ہیں۔"

مرزا اسد نے مفصل جواب دیا۔ مگر ان کی تشفی نہ ہوئی، نہ ان کے ہم خیالوں کی۔

"کس کا کلیجہ ہے اب فرنگیوں سے مقابلہ کرنے کا، وہ تو یہاں جم گیا اسد بھائی! اپنے قدم گاڑ لیے ہیں اس زمین پر، اب نہیں جانے کا، یہاں سے، بے دین اور ملحد لوگوں کی باتوں میں نہ آؤ۔"

لڈن بھائی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دبلے پتلے، گورے چٹے اور نازک مزاج لڈن بھائی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے نانا شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب تک ان کا ملازم خاص ان کی جوتیاں عین ان کے قدموں کی سیدھ میں پلنگ کے پاس نہ رکھ دیتا وہ وہاں سے پاؤں نیچے نہیں اتارتے تھے۔ شطرنج گنجفہ اور کنکوے اڑانے میں ماہر تھے۔ فرنگیوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور اپنے سے کمتر لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایسے افراد کے سامنے کچھ کہنا۔ بھینس کے آگے بین ہی بجانا تھا۔ مرزا اسد خاموش ہو گئے۔ زبان سے، دلیل سے ہر کسی کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ فیصلے

WOMEN SKILLS GROUP

وقت کرتا اور دکھاتا ہے۔ گزرنے والا وقت بھی اور آنے والا وقت بھی۔ مرزا اسد خاموشی سے گزرتے وقت کو دیکھ رہے تھے اور آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

زمین سے آسمان پر آنے کے لیے مضبوط بازو، اڑان کے قابل پر اور بلندی تک پہنچنے کا عزم و حوصلہ چاہیے، قاسم علی کے پاس ان میں سے کچھ نہیں تھا مگر اس کا صرف ایک ہی خواب تھا۔ بلندی پر پہنچنا چاہے اس کے لیے کسی اور کے بازو اکھاڑ کر لگانے پڑیں یا دوسرے کے پر نوچ کر اپنا مقصد پورا کرنا پڑے۔ اس نے کسی ترکیب اور طریقے سے دریغ نہیں کیا۔ صحیح غلط، جائز ناجائز، حرام حلال وہ ان سب چکروں میں نہیں پڑا، نظریں آسمان کی بلندیوں پر تھیں، اونچی اڑان بھرنے کے راستے میں اس نے ہر ایک کی کمر کو جھکا کر زینہ بنایا۔ اور اس میں کہیں دھوکے سے کام لیا۔ کہیں فریب سے، کہیں مکر اور عیاری سے اور کہیں خوف والا پیچ ہے، ہر ممکن طریقے سے اس نے انگلی ٹیڑھی کر کے گھی نکالا تھا اور اس سفر میں وہ کبھی کسی سے غافل نہیں رہا۔ ہمیشہ چوکس، مستعد اور ہوشیار ہی رہا۔ وہ ہمیشہ چوکنا رہا اس بات سے کہ اس کے آس پاس ایسے لوگ نہ ہوں، جو اپنی وفاداری اس کے بجائے کہیں اور گروی رکھ دیں۔

اس کا ہر اطاعت گزار آنکھیں بند کر کے اطاعت کرے، دھوکا دہی یا فریب نہ کرے۔ اس کے خاص خاص کارندے تھے جو ایک ایک کی نگرانی یا نگہبانی کرتے تھے اور پھر ایک روز قاسم علی کو ایک خاص بات بتائی گئی تو وہ کھڑے کھڑے پسینے میں نہا گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ بھرے بازار میں سب کے سامنے ننگا ہو گیا ہو۔

''کیا کہتے ہو؟'' قاسم علی یوں غرائے جیسے غلام صابر کی زبان گدی سے کھینچ لے گا یا آنکھیں نکال دے گا۔ جن سے اس نے کچھ دیکھا مگر غلام صابر ان کی دھاڑ سے گھبرایا نہیں۔

''سرکار کا نمک خوار ہوں۔ جو آپ سے نمک حرامی کرے گا۔ اس کی خبر آپ کو دوں گا۔ چاہے آپ میری گردن ہی کیوں نہ اڑا دیں۔'' اس کی وفاداری آنکھیں جھکی ہوئی تھیں مگر لہجے میں مضبوطی اور سچائی تھی۔

''ثبوت؟'' قاسم علی نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔

''ان کی ملاقات کی جگہ، سرکار کو پہلے سے ہی بتا دوں گا۔ کل کی ملاقات طے ہے۔''

''کل؟'' قاسم علی کی آنکھوں میں وحشت اتری ہوئی تھی۔ اس کے لیے تو ایک ایک لمحہ گزارنا بھی سوہان روح بن رہا تھا۔ کل رات تک کا وقت کیسے کٹے گا؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہے تھے۔

اگلی رات آنے تک وہ انگاروں پر لوٹ لگاتے رہے۔ اتنی لوٹ لگائی کہ بدن کے ساتھ ساتھ روح بھی جل کر سوختہ ہو گئی۔ رات کے پچھلے پہر وہ پائیں باغ میں موجود بارہ دری کی محراب کے پیچھے بیٹھے تھے۔ اولین تاریخوں کا چاند تھا۔ باریک سا ٹمٹماتے چراغ جیسا۔ گھپ اندھیرے کی پھیلی تاریک چادر کو سمیٹنے میں بری طرح ناکام چاند بار بار شرمندہ ہو کر کسی نہ کسی بدلی میں اپنا منہ چھپا لیتا۔ اس اندھیرے میں ایک کے بعد ایک، دو سائے تیزی سے قدم اٹھاتے آئے، دونوں جہاں بیٹھے تھے۔ وہ جگہ قاسم علی سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ ان کی دھیمی دھیمی آوازیں ہوا کی لہروں کے دوش پر قاسم علی کی سماعتوں تک بخوبی پہنچ رہی تھیں۔

''پتا نہیں کیوں آج ہمارا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ سوچا کہ نہ آئیں پھر خیال آیا کہ نہ گئے تو تمہیں کتنی مایوسی ہو گی۔ اس لیے آ گئے مگر......''

روشن آرا نے کہتے کہتے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اب کاہے کی فکر، ساری سوئیاں نکل گئیں، بس آنکھوں کی تو رہ گئی ہیں وہ بھی نکل جائیں گی۔'' لاپروائی سے بولتا ہوا یہ محمد چراغ تھا۔ ان کا خصوصی اور بہت قابل اعتماد مصاحب، جس کے

بارے میں وہ خواب میں بھی نہ سوچ سکتے تھے کہ وہ اس طرح ان کے گھر میں نقب لگائے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دھوکا عموماً وہی دیتے ہیں جو زیادہ قریب اور زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ جن پر سب سے زیادہ بھروسہ ہوتا ہے وہ پیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں اور انسان کو ڈسنے والے زہریلے سانپ انسان — کی آستین میں ہی موجود ہوتے ہیں۔ قاسم علی کو کبھی ہلکا سا گمان بھی نہ گزرا تھا کہ اس کی آستین میں اتنا زہریلا سانپ موجود ہے۔

''تم نے کہا تھا کہ ہمیں لے جانے کا بندوبست کرو گے، بہت جلد'' روشن آرا کی آواز سے بے چینی چھلک رہی تھی۔

''کر رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے سب ہو جائے گا شہزادی! گرم گرم کھانے سے منہ اور زبان دونوں جل جاتے ہیں۔''

''یہاں تو ہم خود جلے پڑے ہیں۔ تنگ آ گئے ہیں اس بڈھے سے، جب یہ ہمارے پاس ہوتا ہے نا تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی زہریلے جھاڑ نے ہمیں گھیر رکھا ہو۔ جتنی جلدی ہو سکے تم ہمیں یہاں سے لے چلو۔''

روشن آرا کے لہجے میں قاسم علی کے لیے اتنی نفرت اور بیزاری تھی کہ قاسم علی کی رگوں میں دوڑتا لہو گرم آگ بن گیا۔ اپنے اندر کے بھانبھڑ کو برداشت کرنا اب ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑے اور ہوئے اور عین ان دونوں سایوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ شرمندہ شرمندہ سا چاند بدلی کی اوٹ سے نکلا تھا اور اسی کی دھیمی دھیمی روشنی میں قاسم علی کو اپنے سامنے دیکھ کر دونوں یوں گنگ کھڑے تھے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو، پھر اچانک ہی روشن کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ تیورا کر گر پڑی۔

دونوں کو وہیں لے جایا گیا جہاں قاسم علی کے حکم کے مطابق غلام صابر نے انتظام کر رکھا تھا۔ روشن آرا تھوڑی دیر میں ہی ہوش میں آ گئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد کا منظر دیکھ رہی تھی۔ قاسم علی اپنی لہو رنگ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ نہ جانے اس نے اب تک کیسے خود پہ ضبط کیا ہوا تھا۔ غلام صابر، وہیں کھڑا قاسم علی کے حکم کا منتظر تھا۔ محمد چراغ خاک میں لتھڑا کچھ پیچھے پڑا تھا۔ سامنے بہت بڑے الاؤ میں آگ جل رہی تھی۔

''اسے کھڑا کرو۔'' غلام صابر نے دو چار ٹھڈے اسے مارے تو وہ سراسیمہ سا کھڑا ہو گیا۔ آگ کے دہکتے الاؤ کی روشنی میں اس کے چہرے پر وہ خوف با آسانی دیکھا جا سکتا تھا جو موت کو اپنے سامنے دیکھ کر ہوتا ہے۔

''اس عورت کا گلا دبا دو جو میری ہو کر بھی میری نہیں ہوئی۔'' قاسم علی نے اسے حکم دیا۔ چراغ کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں، وہ بار بار اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا کبھی روشن آرا کو دیکھ رہا تھا، کبھی سامنے دہکتے الاؤ کو اور کبھی غلام صابر کو قاسم علی کی طرف دیکھنے کی جرأت اس میں نہیں تھی۔

''اگر یہ حکم کی تعمیل میں پس و پیش کرے تو اس الاؤ میں اسے ڈال دو۔'' قاسم علی نے دوسرا حکم غلام صابر کو دیا تھا۔

چراغ نے ایک ایک قدم یوں اٹھایا جیسے من من بھر کا ہو۔ وہ روشن آرا کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کرب اترا ہوا تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ اس کے لرزتے ہاتھ روشن آرا کی گردن پر جم گئے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی گرفت مضبوط کرتا روشن آرا ہنس پڑی۔ پاگلوں کی طرح۔ مجنونانہ ہنسی، وہ ہنس رہی تھی اور چراغ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ غلام صابر بے حس و حرکت ایک ستون کی طرح اپنی جگہ ایستادہ تھا، آقا کے جنبش ابرو کا منتظر اگلے حکم کا منتظر، اسے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کون روتا ہے اور کون ہنستا ہے۔

قاسم علی کی رگوں میں خون ابل رہا تھا۔ کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اس نے آگ اگلتی نظر روشن آرا پر ڈالی جو پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے کے بعد قاسم علی سے مخاطب تھی۔

WOMEN SKILLS GROUP

"میرے لیے موت کی سزا! کیونکہ میں تمہاری نہیں ہوئی تو غور سے سنو، تمہارا بیٹا بھی تمہارا نہیں ہے۔"

کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارتا لہو، قاسم علی کی آنکھوں میں اتر آیا اس کے اگلے اشارے پر وہ چند ماہ کا بچہ بھی اس کے سامنے موجود تھا۔

"پہلے اسے ختم کرو۔" قاسم علی نے حکم دیا۔ چراغ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر آگ کے بھڑکتے الاؤ کو دیکھ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ فیصلہ کن سانس، اس کے ایک ہی ہاتھ کی گرفت ایک ننھی معصوم گردن کے لیے کافی تھی۔

روشن آرا کی ہنسی تھم گئی تھی۔ آنکھوں میں اب کچھ نہیں تھا۔ نہ خوف، نہ ویرانی بالکل خالی آنکھیں۔ بالکل خالی آنکھیں اٹھا کر اس نے قاسم علی کو دیکھا۔ اور اس کے لبوں پر ایک انتہائی زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تمہیں بہت شوق اور خواہش تھی نا بیٹے کی، بیٹوں میں تمہاری جان بند ہے۔ تو اس سے پہلے کہ تم میری جان لیتے میں نے تمہاری جان لے لی۔ یہ تمہارا ہی بیٹا تھا۔"

"جھوٹ بکتی ہے۔" قاسم علی کی ایک زوردار ٹھوکر اس کے پہلو میں لگی تھی درد کی شدت سے دوہری ہو کر اوندھے منہ نیچے گر پڑی۔

"تم زندگی کی آخری سانس تک سوچتے رہو مگر فیصلہ نہ کر سکو گے کہ میں نے پہلے جھوٹ کہا تھا یا اب؟"

قاسم علی نے بہت ضبط کر لیا تھا اور بہت صبر، اس کے ہاتھ سے ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں اور صبر کے سارے پیمانے لبریز ہو گئے۔ اس کی آنکھ کا اشارہ غلام صابر نے فوراً سمجھا اور فوراً ہی تعمیل کر دی۔ آگ کا الاؤ بہت بڑا تھا۔ دو جانوں کو بھسم کرنے کے لیے کافی تھا، قاسم علی وہاں سے چلا آیا۔ غلام صابر نے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر آخری نشانی بھی مٹا دی۔

"دو دن بعد حویلی میں سوگ کا سماں تھا۔ قاسم علی اپنی بیوی روشن آرا اور بیٹے کو لے کر بغرض زیارت پیر صاحب کی درگاہ لے جا رہے تھے جو پہاڑی پر واقع تھی، راستے میں ناگہانی طور پر بگھی الٹ گئی۔ روشن آرا اور ان کا بچہ دریا میں جا گرے، لاشوں کا نشان بھی نہ ملا۔ سوگ ختم ہو گیا اور حویلی میں زندگی معمول پر آ گئی مگر روشن آرا نے سچ کہا تھا وہ زندگی کی آخری سانس تک اس بچے کے بارے میں سوچتے رہے۔ وہ آخری دو سال بھی جب وہ فالج کا شکار ہو کر اپنے بستر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے ان کے تمام اعضاء بے حس و حرکت تھے سوائے دل و دماغ کے۔ دل جو اپنی دھڑکنیں پوری کر رہا تھا اور دماغ جو سوچتا رہتا تھا۔ انہوں نے اپنی عمر میں تریا چلتر کے بارے میں سنا تھا اور یہ بھی کہ یہ عورت کی عمر سے مخصوص نہیں ہے۔ مگر اس کا تجربہ پہلی بار انہیں روشن آرا سے ہی حاصل ہوا تھا۔

اپنے آخری دنوں میں ان کے ساتھ بہت عجیب عجیب معاملات ہو رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتے تو کبھی انہیں بھڑکتا الاؤ نظر آتا کبھی پھانسی گھاٹ، جہاں لائن سے پھندے تیار تھے۔ کبھی انہیں عجیب عجیب چہرے اور لوگ نظر آتے اور ایک دن انہیں بہت خوفناک لوگ نظر آئے، وہ بھی کھلی آنکھوں سے۔

"ارے یہ کون ہیں انہیں ہٹاؤ میرے پاس سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" ان کا دل زور زور سے چلا رہا تھا۔ آنکھیں خوف کے مارے پھٹی جا رہی تھیں۔ جسم کا تو یہ حال تھا کہ ایک انگلی بھی جنبش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے بے جان جسم کو ہلانے جلانے کی کوشش کر رہے تھے مگر بے سود، ہر کوشش بے سود تھی۔ وہ خوفناک وجود ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور قاسم علی کی آنکھیں مارے ہیبت اور خوف کے اپنے حلقوں سے باہر ہی نکل پڑی تھیں۔

مولوی صاحب سمیت سب نے ہی کوشش کی میت کی کھلی آنکھیں بند کرنے کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ انہی کھلی آنکھوں کے ساتھ میت کو نہلایا دھلایا اور کفنایا گیا اور مٹی کے سپرد کیا گیا، اسی مٹی کے سپرد جو اس اولاد آدم کا منہ بھرنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے جس کا منہ سونے کی وادیوں سے بھی نہیں بھرتا۔

☆☆☆

میاں عبدالعزیز کلکتے سے کیا ہو آئے۔ ان کی کہانیاں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ ختم ہوتیں بھی کیسے، سننے والوں کی دلچسپی ذوق و شوق تازہ رہے تو بتانے والے کا منہ تھکتا ہے نہ زبان رکتی ہے۔ سخت سردی کی رات میدان میں الاؤ جلا کر چاروں طرف بیٹھے سامعین بھوبھل کے سنکے آلو اور ہولے کھاتے جاتے اور کہانیاں سنتے جاتے جو انہیں تو محیر العقول ہی لگتی تھیں۔

"میاں جی سنا ہے وہاں دھوئیں کی گاڑیاں چلنے لگی ہیں؟ لمبی لمبی گاڑیاں یہاں سے ہواں تک۔" پوپلے منہ والے شیخ جی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر لمبائی۔ "کور" کرنے کی کوشش کی گو کہ وہ اس میں ناکام تھے۔

"اب تو عرصہ ہوا دخانی انجن کو چلے ہوئے۔ سنا ہے کچھ عرصے میں یہاں سے بھی ریل کی پٹری گزرنے والی ہے۔" عبدالعزیز نے ان کی معلومات اور مجلس میں اضافہ کیا۔

"بغیر گھوڑے اور بیل کے گاڑی کیسے چلے گی۔ ہمری سمجھ میں نا ہی آوت ہے۔"

رام دیال عمر کی اسی دہائیاں بسر کرنے کے بعد اب فرنگیوں کی لائی ہوئی بہت سی تبدیلیوں پر حیرانی کی منازل طے کر رہا تھا۔

اس چھوٹے سے قصبے میں زندگی اور معاملات محدود اور لگے بندھے تھے۔ عبدالعزیز کی صورت میں یہاں سے ایک کھڑکی شہری زندگی اور نت نئی تبدیلیوں اور ترقی کی سمت کھلی تو سب کی آنکھیں چندھیا گئیں کسی کسی بات پر تو وہ یقین کرنے سے ہی انکار کر دیتے۔

"کیا کہہ رہے ہو بھائی جی۔ ایسا کون سا جادو ہووے کہ یہاں بیٹھا جنا وہ کوسوں دو بیٹھے جنے کی بات سن لے۔ فرنگی نہ ہوئے جادوگر ہوئے۔"

آدھی صدی اسی گاؤں کے چھوٹے سے گھر اور چھوٹے سے کھیت میں گزارنے والے دھنی رائے کی عقل اس ایجاد کو سمجھنے اور تسلیم کرنے سے قاصر تھی جس کا نام عبدالعزیز نے ٹیلی فون بتایا تھا۔

"کیوں نہیں لالہ! جب لے والے باجے (گراموفون) سے گانے کی آواز آ سکتی ہے تو دور بیٹھے لوگ بھی ایک دوسرے سے بات کرتے ہی ہوں گے۔" نوجوان عبداللہ کے دماغ نے یہ بات فوراً تسلیم کر لی تھی۔ یہ گراموفون بھی عبدالعزیز کی بدولت انہوں نے دیکھا اور سنا تھا۔

"روشنی کے لیے اب دیے اور چراغوں کی ضرورت نہیں رہی شہر میں۔" عبدالعزیز نے ایک انکشاف کیا۔

"تو کیا چاند ستاروں کو آسمان سے توڑ کر نیچے لے آئے؟"

"بھیا جی! کل (بٹن) دبا دیں، روشنی ہو جاوے، بند کر دیں اندھیرا ہو جاوے۔"

"یہ کل کیا ہووے ہے؟"

"یہ بھی فرنگیوں کا جادو ہووے ہے۔" شیخ جی پوپلے منہ سے ہنسے۔ منہ میں ہولے بھرے چباتے ہوئے میاں جی کو اچھو لگ گیا۔ کھوں کھوں، وہ کھانسنے لگے۔ برابر بیٹھا عبداللہ ان کی کمر سہلانے لگا۔ "ذرا دھیرج رکھو شیخ جی، یوں کھاتے کھاتے ہنسو گے تو اگلی سانس نہ آوے گی۔"

"پرے ہٹ مردود، بڈھوں سے مسخری کرتا ہے۔ بے شرم کہیں کا۔"

شیخ جی نے اسے جھڑکا، جسے سننے کا وہ عادی تھا۔ منہ پھاڑ کے ہنس دیا۔

"سنا ہے فرنگیوں کے وید چیرا پھاڑی کر کے علاج کرے ہیں؟" ایک سوال اور اٹھا۔

"ہاں بھیا جی، کچھ ایسا ہی ہے۔" عبدالعزیز نے بردباری سے سر ہلایا۔

آس پاس کے سو گاؤں دیہاتوں میں عبدالعزیز کے والد وہ دوسرے مسلمان زمین دار

WOMEN SKILLS GROUP

تھے۔ جن کا بیٹا بغرض تعلیم کلکتہ شہر میں کچھ عرصہ مقیم رہا تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اس نے ایک انوکھی دنیا دریافت کی تھی جس کی ایک جھلک وہ گاؤں والوں کو دکھا رہا تھا۔

☆☆☆

ایک سال کا عرصہ لگا تھا ناول لکھنے میں اور شائع ہوتے ہی وہ مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ پہلی اشاعت ختم ہونے تک ہیڈی شہرت اور دولت دونوں کما چکا تھا۔ ولی شاہ نے اپنے بیٹے کا کارنامہ پڑھا تو۔

"یہ کیا خرافات لکھی ہے تم نے ہمارے خاندان کے بارے میں۔" وہ اپنے بیٹے پہ غرائے جو باغ میں کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔

"کیسی خرافات؟ میں نے تو بس ایک داستان لکھی ہے ہندوستان کی تہذیب اور معاشرت کے بارے میں۔" ہیڈی نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"سب کچھ بکواس اور جھوٹ لکھا ہے اوپر سے سارے نام اور مقامات بھی تم نے تبدیل نہیں کیے، اصل استعمال کیے ہیں، ہماری ساری خاندانی تاریخ کو ملیامیٹ کر دیا تم نے، کالک مل دی سب پر۔" ولی شاہ گرج رہے تھے ان کے غصے اور بے بسی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیٹے کے باپ دادا جو اس کے بھی سگے دادا اور پردادا تھے، سب پہ اتنی کیچڑ کیوں اچھالی ہے؟ اور ہیڈی انہیں وہ سب سمجھانے کے موڈ میں نہیں تھا جو اس نے سمجھا تھا۔

اس نے مغرب میں مقبول ہونے والے ہندوستانی ادیبوں کی تصنیفات کا مطالعہ کیا جن میں نراد چوہدری، نائپال اور ششی تھرور شامل تھے۔ ان کی لکھی کتابیں پڑھ کر ہیڈی نے نسخہ پا لیا تھا کہ یہاں مقبول ہونے کا ایک شارٹ کٹ یہ ہے کہ اپنی تہذیب، ثقافت، معاشرت، افراد، زندگی اور طرز زندگی کا مذاق اڑا کر، پھبتیاں کس کے اور طنز و تضحیک کر کے مشرقی معاشروں کی پسماندگی پر مغربی تہذیب کی برتری ثابت کی جائے اپنی نو آبادیوں، پہ ان کے قبضے اور سامراجیت کو جائز قرار دے کر ان جنگلی معاشروں میں تہذیب و تمدن اور ترقی لانے کا سہرا مغرب کے سر باندھا جائے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ جو اچھائیاں ہیں وہ ساری مغرب کی مرہون منت ہیں اور انہی کی ہیں اور جو برائیاں ہیں وہ سب مشرق کی ہیں۔

ہیڈی نے اسی تکنیک کا سہارا لے کر اپنے ناول کی بنت کی تھی شاید ولی شاہ گوارا کر لیتے اگر بات یہیں تک محدود رہتی مگر ہیڈی اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ جہاں اس نے ہندوستان کی ہندی معاشرت و مذہب کو بے حد پراسرار ظاہر کیا تھا اور اس میں ایسے عناصر شامل کیے تھے جو مغربی قاری کے لیے حیرت اور دلچسپی کا باعث ہوں، مندروں میں موجود سونے چاندی کے انبار اور مورتیاں، ناگ، ناگن اور سپیروں کی کہانیاں، مذہبی رسومات کو انتہائی پراسرار اور چٹپٹا بنا کر پیش کرنا، کنواری ناریاں اور رشی کنیائیں، گھنے جنگلوں میں موجود نیم وحشی قبائل اور جانے کیا الا بلا۔

پھر اس سے بھی دس قدم آگے جا کر اس نے اپنے خاندان اور ان کی تاریخ پہ بھی ہاتھ صاف کر ڈالا، اپنے پردادا قاسم علی کو اس نے ایک ایسا عیاش طبع نواب بنا دیا جس نے کئی سو کنیزوں اور باندیوں کا حرم بنایا ہوا تھا اور یہ کہ انہوں نے آس پاس کے کمزور زمین داروں کو مروا کر یا ان پر حملے کر کے ان کی زمین داریاں بھی اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ اس میں تھوڑا سا سچ تھا اور باقی سب ویسی ہی مبالغہ آرائی، جیسے قاسم علی کو حرم کا مالک بنانے کے معاملے میں کی تھی، پھر قاسم علی اور ان کی اولادوں کی کردار کشی اس حد تک کی کہ انہیں بالکل ہی عریاں کر دیا۔

ہیڈی نے اس ناول میں ایک ذیلی کہانی قاسم علی کے حوالے سے بیان کی تھی کہ ان کی چوتھی بیوی جو خوب صورت، کم عمر اور بے حد چالاک تھی، اس نے قاسم علی کے بیٹے کو اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس کا ایک بیٹا بھی پیدا ہوا اور جب قاسم علی کو اپنے بیٹے اور بیوی کی حرکتوں کا علم ہوا تو اس نے ان

دونوں کو بچے سمیت بھوکے شیروں کے آگے ڈال دیا۔ جس طرح زمانہ قبل از مسیح رومی بادشاہوں کے اکھاڑے مشہور تھے جہاں وہ اپنے مجرموں، سرکش غلاموں اور قیدیوں کو بھوکے شیروں کے آگے ڈال کر ان کا مقابلہ دیکھتے تھے۔

ہیڈی نے بے حد مرچ مسالے لگا کر داستان اور زیب داستان کو رنگین بنایا تھا۔ تب ہی اس کی کتاب ہاٹ کیک بن کر فوراً بک گئی اور ولی شاہ غم و غصے کے مارے برا حال تھا۔ شوہر کا رنج اور بے بسی دیکھ کر زرتاج میر خاموش تماشائی بنی نہ رہ سکیں۔

"تم نے یہ ٹھیک نہیں کیا ہیڈی، ضروری تھا کہ تم اپنے باپ کا خاندان اس داستان میں لے کر آتے؟ وہ بھی جھوٹے سچے، الٹے سیدھے واقعات کو بنیاد بنا کر۔" انہوں نے بھی ہیڈی کو سرزنش کی، مگر ہیڈی کے جواب نے ان کا منہ بند کر دیا۔

"شہرت سیدھے سادھے راستوں سے نہیں ملتی ٹیڑھے سیدھے راستوں پر ذرا مختلف انداز سے گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ الگ کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ خود کو منوانے کے لیے، تب ہی دنیا آپ کو جانتی پہچانتی ہے۔ آپ بھی تو کتنے سالوں سے پینٹنگ کر رہی ہیں۔ مگر اصل شہرت آپ کو اس وقت ملی جب آپ نے نیوڈز بنانی شروع کیں۔ شہرت ہمیشہ متنازعہ تخلیقات کے حصے میں آئی ہے۔ سیدھے سادے اسلوب اور انداز تخلیق کو عام لوگ اور ناقدین بھی ردی بنا کر ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔"

زرتاج میر لاجواب ہو گئیں اور ہیڈی کے فلسفے اور خیالات سے کوئی متفق ہو نہ ہو۔ وہ خود اپنے خیالات سے متفق تھا اور انہی خیالات کا ایجنڈا اپنا کر اب اپنے اگلے ناول کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اور ولی شاہ ابھی تک پہلے ناول کو لے کر بیٹھے اپنے خاندان کا رونا رو رہے تھے۔

"ہمارے دادا نے فقط چار شادیاں کی تھیں اور ان کا کوئی حرم ورم نہیں تھا۔ وہ ایک ظالم و جابر اور تنگ نظر نواب نہیں تھے۔ بہت روشن خیال اور ماڈریٹ تھے۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے یعنی میرے چچا کو لندن تعلیم کے لیے بھیجا تھا۔"

"آپ کے وہی انکل، جو آئے تو تھے ڈگری حاصل کرنے مگر تعلیم بیچ میں ہی ادھوری چھوڑ کر اپنی لینڈ لیڈی سے شادی کر بیٹھے تھے اور مؤرخ کہتا ہے کہ اپنی خاندانی حویلی میں جس جاگیرزادے کے آگے پیچھے درجنوں ملازم فقط اس کے ذاتی کاموں کے لیے تھے وہ گریٹ برٹین میں اپنی انگریز بیوی کو روزانہ بیڈ ٹی اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلاتا ہے اپنے باغیچے کی گھاس خود صاف کرتا ہے۔"

"انہوں نے یہاں شادی ضرور کی تھی مگر باقی سب بکواس ہے۔" ولی شاہ پھر بھڑک گئے۔

"اور یہ تم نے کیا بکواس لکھی ہے کہ قاسم علی کو ان کے بیٹوں نے زہر دے کر ختم کیا تاکہ جلد از جلد جاگیر کے مالک بن سکیں؟ وہ اپنی طبعی موت مرے تھے۔ انہیں کسی نے زہر وہر نہیں دیا تھا۔ سمجھے تم۔"

ولی شاہ کی برہمی پر ہیڈی مسکرایا۔

"طبعی موت بہت لوگ مرتے ہیں۔ کون نوٹس لیتا ہے؟ کہانی میں ٹوئسٹ تب ہی آتا ہے جب باپ کو بیٹوں نے قتل کیا ہو یا باپ نے بیٹوں کو جان سے مارا ہو، ویسے بھی ہندوستانی تہذیب اور معاشرت پر مغل کلچر کے اثرات ہیں اور اقتدار کے لیے باپ بھائیوں اور بیٹوں کو مارنا مغل کلچر کی علامت یا میراث سمجھ لیجیے۔"

"دنیا کی تاریخ میں مغل پہلے حکمراں نہیں ہیں یہ سب کرنے والے ہر مقام کے اقتدار کی تاریخ ایسے قاتلوں اور مقتولوں سے بھری ہوئی ہے۔"

ولی شاہ نے بے زاری سے جواب دیا وہ بیٹے سے تاریخ اور انداز حکمرانی پر بحث کرنے نہیں آئے تھے۔ جواب طلبی کے لیے آئے تھے مگر بیٹا بات کو کہاں سے کہاں لے جاتا تھا۔ جیسے اپنے ناول میں کیا تھا۔

"تم نے جتنی بھی خرافات لکھی ہے سب کی تردید کرو۔"

WOMEN SKILLS GROUP

"فی الحال تو میرا خودکشی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"اور مجھے اور میرے خاندان کو جو تم نے سولی پر لٹکا دیا ہے؟" وہ غرائے مگر بیٹے پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"بلاوجہ ایموشنل ہو رہے ہیں آپ، اتنا نیک نام بھی نہیں تھا آپ کا خاندان، جو تحقیق میں نے کی ہے اس کے مطابق اگر ہندوستان میں سن اٹھارہ سو ستاون نہیں آتا یا اس سے پہلے یہاں انگریز نہیں آتے تو آپ کے دادا یا ان جیسے کئی ٹٹ پونجیے فرش سے عرش تک نہیں پہنچے۔ نہ ان کا کوئی نام ہوتا نہ اتنی زمین، جاگیر اور دولت ہوتی۔"

حقیقت تلخ اور سفاک ہوتی ہے مگر انسان کی زبان سب سے زیادہ بے رحم جو اس کی تلخی اور سفاکی کو سامنے لاتی ہے، وہیڈی کوئی لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہیں تھا۔ اگلے کے منہ پر ہی اپنے خیالات کا اظہار کرنا صرف ہیڈی کی ہی نہیں، سب کی عادت تھی مگر میر ولی کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اپنے خاندان اور اس کی عزت اور بھرم کے حوالے سے وہ بہت حساس تھے اگر ہندوستان میں سن اٹھارہ سو ستاون نہیں آتا تو تم بھی یہاں ہونے کے اور ایک عالی شان زندگی گزارنے کے بجائے ہندوستان میں ہی کہیں گھاس کھود رہے ہوتے یا بھیڑ بکریاں چرا رہے ہوتے۔" میر ولی کا ایک ایک لفظ طنز کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ہوسکتا ہے۔" اپنے مخصوص انداز میں کندھے اچکا کر ہیڈی نے حیرت انگیز طور پر ان سے اتفاق کیا۔ پھر سادہ سے انداز میں گویا ہوا۔

"ویسے میں اپنے دادا کا سچ مچ قدر دان ہوں، ان کی وجہ سے آج ہم سب دنیا کے ایک بہترین مقام پر ایک عالیشان زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"اور اس کے باوجود بھی تم نے ان کی کردار کشی کی، انہیں اپنی کتاب میں اس طرح ذلیل کیا؟"

"رائی موجود تھی میں نے صرف اس کا پہاڑ بنایا ہے۔"

"رائی اور پہاڑ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں مگر کتاب میں رائی ڈالنے سے نہ وہ بکتی نہ مجھے کوئی جانتا۔"

"شہرت ہمارے خاندان میں پہلے سے ہی موجود ہے۔ بزنس کمیونٹی میں میرا اور میرے بیٹوں کا نام ہے۔ آرٹ کی دنیا زرتاج مہر کے نام اور کام سے واقف ہے۔ ہم دونوں کے حوالوں سے ہمارے بچے بھی جانے جاتے ہیں۔ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے آخر۔" میر ولی اس کی بحث اور بیٹے سے چڑ گئے، اکتا کر سوال کیا۔

"میں اپنے نام اور اپنے کام کی شہرت چاہتا ہوں۔ اپنے باپ بھائیوں کے نام کی نہیں۔"

"میاں صاحبزادے، اس کتاب کے بل پر آپ نے جو شہرت کمائی ہے۔ وہ درحقیقت میرے باپ بھائیوں کے طفیل کمائی ہے۔"

میر علی نے زہر خند لہجے میں اسے آئینہ دکھایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

داؤد نے اگلے دن لنچ پر ان سب کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ تاکہ اس کے والدین اور نور فاطمہ کی ممی آپس میں ملاقات کرسکیں۔ ان کی انگیج منٹ پر وہ نہیں آسکی تھیں۔ ان کے شوہر بیمار تھے۔ اب بھی بڑی مشکل سے وہ اپنے مصروف شیڈول سے دو دن نکال کر آئی تھیں۔ داؤد کا گھر دو منزلہ ڈھلوان چھت والا لندن کا روایتی گھر تھا، گھر کے آگے چھوٹا سا باغیچہ، ہولی ہوکس، ڈیزی جیریئم کے پھولوں سے آراستہ، چیری اور اسٹرابیری کے درختوں سے سجا، کھڑکیوں کے آگے پھولوں کے گملے سجے تھے۔ ڈرائنگ روم میں ان کا استقبال داؤد کے ممی ڈیڈی اور پالتو اور لاڈلے جرمن شیفرڈ نے کیا۔

داؤد کی ممی اور حدیقہ نے ایک دوسرے کو دیکھا تو پہلے مسکرائیں پھر یکدم گلے لگ گئیں۔

"آج مجھے یقین آگیا کہ دنیا گول ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مختصر بھی ہے۔"

داؤد کی ممی نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا پھر جملہ حاضرین کو جو حیران تھے۔ بتایا گیا کہ دونوں خواتین زمانہ طالب علمی میں اور اس کے بعد عملی زندگی میں شامل ہونے تک ایک دوسرے کی بہترین دوست رہ چکی تھیں۔

"میری شادی اور پھر فرانس منتقل ہونے کے بعد میرا رشتہ اور واسطہ اس شہر سے اور اس کے مکینوں سے جیسے کٹ ہی گیا۔" حدیقہ کے لہجے میں دکھ پنہاں تھا جسے نور نے شدت سے محسوس کیا۔

"تم نہیں جانتیں حدیقہ، مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے اتنے سالوں بعد تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر۔" داؤد کی ممی، زائرہ کیانی سچ مچ بہت خوش اور پرجوش لگ رہی تھیں۔

"اور میں اپنی خوشی شاید لفظوں میں بیان نہ کرسکوں۔ مگر میرا خوشی سے جگمگاتا چہرہ اور ستاروں بھری چمکتی آنکھیں میرا صاف صاف بیان کر رہی ہیں۔"

حدیقہ خلیل نے اس نظم کے حوالے سے بات کی جو کبھی جوانی اور دور طالبعلمی میں دونوں سہیلیوں کی پسندیدہ ہوا کرتی تھی۔

"اور مرنے سے پہلے تم سے ملاقات ہوگئی۔ میرے ایک ہاتھ میں حسرت کے مہکتے گلاب اور دوسرے میں آزردگی کے رکھے، زرد پتے ہیں۔" نظم کی آخری سطریں حدیقہ خلیل نے دل ہی دل میں دہرائی تھیں۔ زائرہ ایک بار پھر اس سے مخاطب تھی۔

"کتنا حیرت انگیز معاملہ ہے یا اتفاق، ہم دونوں کی آپس کی دوستی، محبت اور یگانگت ہمارے بچوں میں منتقل ہوگئی۔ ایسا تو شاید فلموں اور کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ہے نا!"

"کہانیاں اور فلمیں بھی زندگی کے حقائق سے اخذ کی جاتی ہیں ڈارلنگ۔" ان کے معتبر صورت شوہر خوش دلی سے گویا ہوئے۔

"میں آپ کی تائید کرتی ہوں جناب من!" زائرہ بے اختیار کھلکھلائیں اور ان کے مہمان بھی مسکرا دیے۔

"مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ گرینڈ پا اپنی مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکے۔ وہ بہت شاندار انسان ہیں ان سے بات کر کے تمہیں بہت خوشی ملتی ہے۔" صادق کیانی نے نور فاطمہ کو مخاطب کیا۔

"انہیں بھی آج کی یہ محفل چھوڑنے کا افسوس تھا مگر ان کی آج ملاقات پہلے سے طے تھی، جانا ضرور تھا۔"

"ہاں انہوں نے فون پر معذرت کی تھی آنے کے لیے، خیر کوئی بات نہیں۔" وہ اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "ڈارلنگ اس موقع کے لیے اردو زبان میں کیا کہتے ہیں جو آپ اکثر بولتے ہو۔"

وہ شستہ انگلش میں باتیں کر رہی تھیں، ان کی اردو یا ہندی بہت ٹوٹی پھوٹی تھی۔ بچپن نینی تال کے کانونٹ میں گزارا تھا۔ جوانی میں لندن آکر یہیں کی ہو رہی اب بھی جو تھوڑی بہت اردو، کبھی کبھار بول لیتی تھیں وہ ان کے شوہر صادق کیانی کے طفیل تھی، جن کا تعلق پاکستان سے تھا۔

"اس موقع پر کہتے ہیں، یار زندہ، صحبت باقی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اوہ یس، یس، تو اگلی بار ایک لنچ رکھیں گے گرینڈ پا کے لیے بکیوں ٹھیک ہے نا۔"

"داؤد! تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ نور کو گھر دکھاؤ، باغیچہ دکھاؤ۔" زائرہ اچانک ہی داؤد سے مخاطب ہوئیں۔

"پچھلی بار جب میں یہاں آئی تھی تو سب کچھ دکھایا تھا داؤد نے۔" داؤد سے پہلے نور فاطمہ نے جواب دیا۔

"ہم نے پچھلے ماہ ہی انٹیریئر چینج کروایا ہے۔ تم دیکھو۔ ضرور پسند کرو گی۔"

"تو آپ سچ مچ مجھے یہاں سے اٹھانے پر تلی ہوئی ہیں۔"

نور کی مسکراہٹ میں شرارت تھی۔ زائرہ نے اس کی مسکراہٹ دیکھی۔

WOMEN SKILLS GROUP

"کھوو ڈارلنگ، بڑی ہی شرارتی ہو تم۔"
صدیقہ بے اختیار مسکرا دیں۔ یہاں آنے سے پہلے نور فاطمہ نے دونوں میاں بیوی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا تھا۔
"ممی! داؤد کے ممی ڈیڈی بہت ہی دلچسپ اور بہت پیارے ہیں۔ ڈیئر اور ڈارلنگ کے بغیر نہ کوئی لقمہ توڑتے ہیں نہ جملہ بولتے ہیں۔" صدیقہ اس وقت، اسی بات کا عملی مظاہرہ دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔
اندر بیٹھے وہ باتیں کر رہے تھے۔ نور فاطمہ اور داؤد باہر آ گئے۔ باہر خنکی تھی مگر دھوپ نکلی ہوئی تھی جو لندن کے مستقل کہر آلود موسم کے بعد ایک نعمت تھی۔
"کتنا اچھا لگ رہا ہے یہ چمکتا ہوا سورج۔" نور فاطمہ نے دھوپ کی میٹھی تپش کے ساتھ داؤد کے ہاتھوں کی حدت بھی محسوس کی جو اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔
"سنا ہے محبت میں چمکتا چاند اور ستارے اچھے لگتے ہیں اور تمہیں سورج انسپائر کر رہا ہے؟"
"میرا خیال ہے کہ ہر خطے میں رومان کی علامتیں کچھ مشترک ہیں تو کچھ الگ، اب مشرق میں جہاں سارا سال سورج سروں پر چمکتا رہتا ہے۔ وہاں ساون، گھٹا، برسات، چاند، چاندنی اور ستارے رومانس کی علامت ہیں اور ہم جس خطے میں ہیں یہاں کی نمی، مہینوں کی دھند، کہرے، نمی اور بارش کے بعد جب صاف شفاف روشن چمکتا گرم دن دیکھنے کو ملتا ہے تو سورج صاحب ڈارلنگ اور فیورٹ بن کر رومانس کی علامت بن جاتے ہیں۔"
دھیرے دھیرے چہل قدمی کرتے ہوئے نور فاطمہ نے جو منطق پیش کی وہ داؤد کو پسند آئی۔
"اس کا مطلب ہوا کہ آج کا "سنی ڈے" رومانس ڈے ہے؟"
داؤد شریر ہوا تھا۔ نور فاطمہ نے ٹھہر کر بھنویں سکیڑیں اور اسے غور سے دیکھا۔
"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم دن بدن بے حد رومینٹک ہوتے جا رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ تم اپنی وکالت کی پریکٹس جج کی عدالت میں کر رہے ہو یا کسی فلم کی عدالت میں؟"
داؤد کا قہقہہ بڑا بھرپور اور بے ساختہ تھا۔
"تم سامنے ہوتی ہو تو خود بخود رومانس سوجھنے لگتا ہے۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے بنچ پہ بیٹھ گیا نور بھی اس کے برابر بیٹھ گئی۔
"اس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ جب میں سامنے نہیں ہوں گی تو میرے متعلق تمہاری رومانٹک فیلنگز ختم ہو جاتی ہیں؟ غائب ہو جاتی ہیں؟" نور فاطمہ کا لہجہ سوالیہ تھا انداز بظاہر بڑا سنجیدہ تھا۔
"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" ایک ذہین۔ حاضر جواب اور حاضر دماغ وکیل کو بیرسٹر کے سوال کا کوئی معقول جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔
"میرا خیال ہے کہ تمہیں وکالت چھوڑ کر رومینٹک شاعری شروع کر دینی چاہیے۔ تم اب اسی قابل رہ گئے ہو۔" نور فاطمہ نے اسے چھیڑا۔
"سچ مچ میں بھی سنجیدگی سے اس وقت یہی سوچ رہا ہوں۔ ماحول سہانا اور موسم بھی خوب صورت ہے۔ ہمراہ محبت ہے۔ شاعری کیوں نہ سوجھے۔"
"تم بھی کبھی کبھی مجھے بہت حیران کر دیتے ہو۔" نور فاطمہ نے اس کے کندھے پر سر رکھا۔ "شروع شروع میں تم کتنے اکھڑ مزاج رُف اور سنجیدہ قسم کے لگتے تھے مجھے۔"
"لگتا نہیں تھا بلکہ تب میں واقعی ایسا ہی تھا۔ دراصل میرے کیریئر کی شروعات تھی۔ میں اسٹرگل کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ تم سے محبت بھی، ڈرتا تھا کہ کہیں ناکام نہ ہو جاؤں، اپنے کیریئر میں، یا تمہیں پانے میں، یا دونوں میں ہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا نور! میں اس وقت کتنا خوف زدہ تھا اپنے کیریئر کے لیے کم اور تمہارے لیے زیادہ، یہ محبت بھی عجیب ہوتی ہے۔ خود تو ایک طاقتور جذبہ ہے مگر جب ہم اس میں مبتلا ہوتے ہیں تو کمزور ہو جاتے ہیں۔"
(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

گھٹن، بھوک، مایوسی اور اداسی نے مل کر مجھے ایک ہی لمحے میں آن دبوچا تھا، فٹ پاتھ سے سڑک کے بیچوں بیچ میں کیسے پہنچی، کچھ خبر نہیں۔ یک دم میرا دل درد کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے منظر دھندلائے اور ایک زوردار چکر نے مجھے زمین پر لا پٹخا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ خبر ہی نہ ہوئی۔ آخری آواز جو میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ ایک زوردار بریک سے ٹائروں کے چرچرانے کی آواز تھی۔ آواز کی شدت میں موجود بے رحمی اور غیظ بتاتا تھا کہ انسانوں کے اس رویے پر مشینیں نالاں ہیں۔
آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک اچھے ہسپتال کے نفیس کمرے میں پایا، ابھی میں ہوش اور بے ہوشی کے درمیان تھی کہ دروازہ کھلا اور سفید براق لباس میں ملبوس نرس کے ساتھ آنے والی خوبصورت عورت پر نظر پڑتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے بے ساختہ منہ دیوار کی جانب موڑ لیا شاید انا کو یہ [illegible] گوارا نہ تھی۔
"شزا! ایسا ہی ہونا تھا تم۔" اس کومل اور نرم لہجے میں بڑی محبت اور اپنائیت تھی۔ اس نے ہاتھ تھام کر پوچھا تو فرار کے سارے راستے مسدود تھے۔ میں نے بمشکل اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔
"اچانک تم میری گاڑی کے سامنے آن ٹکرائی تھیں، میں نے تمہیں دیکھا اور فوراً ہسپتال لے آئی، میرے شوہر یہاں سرجن ہیں اسی لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، بریک بروقت لگنے کی وجہ سے تمہیں زیادہ گہری چوٹ نہیں لگی۔ اب تم یہ جوس پی لو۔ پھر ہم بہت سی باتیں کریں گے۔" وہ ہمیشہ کی طرح مہربان تھی اور گزرے زمانے کسی ریل کے ڈبوں کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ لمحوں کے پار تمسخر اڑاتے میرے قہقہے میرے ہی ضمیر پر کوڑے کی طرح برس کر میرے داغ ندامت کو گہرا کر رہے تھے۔

☆☆☆

شزا اور صوت کہانیت
ہم دونوں کو لگ تھیں۔ میرا تعلق ایک مال دار اور فیشن ایبل گھرانے سے تھا۔ اعلا لباس، سج دھج جن کی اولین ترجیحات میں شامل ہوتا ہے۔ مجھے بھی پہننے اوڑھنے اور برانڈز کی نمائش کا اتنا ہی شوق تھا جتنا اکثر امیر زادیوں کو ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر جدید ترین فیشن میرا شوق تھا۔ جس طرح یہ جاب میرا شوق تھی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تو تھی ہی رہی سہی کسر ذاتی کمائی نے پوری کر دی۔ ساری تنخواہ اچھا پہننے اوڑھنے اور پارٹیز کی نذر ہو جاتی تھی۔ آخر پہن اوڑھ کر ایک دوسرے کو نہ دکھایا تو پہننے کا کیا فائدہ۔
میرے برعکس صوت بہت "تنہائی" لڑکی تھی۔ اچھی خاصی تنخواہ ہونے کے باوجود سادہ لباس۔ ہر سیزن (خصوصاً گرمی، سردی کے آغاز میں) میں بھی جب سب ٹیچرز نت نئے جوڑے اور میچنگ شوز، میچنگ بیگ اور جیولری پہنے ایک دوسرے کو مات

سیدہ آیت گیلانی

ہم دونوں کی کہانی

دیتی نظر آتیں وہ تب بھی ان سب سے جدا لگی بندھی روٹین کے مطابق نظر آتی۔ مجھے یاد ہے جب کالج کے ایک روزہ ٹرپ پر بھی وہ مجھے اپنے سابقہ حلیے میں نظر آئی تو میں نے بڑے طنزیہ انداز میں اس سے کہا تھا۔

"اف! حد ہوتی ہے مومنہ! تم ٹرپ پر بھی ایسے ہی سر جھاڑ منہ پہاڑ آ گئیں۔"

"میں تو آنا ہی نہیں چاہتی تھی، یہ تو پرنسپل نے کہا ہے کہ لازمی ہے جانا۔ اس لیے آئی۔" اس نے بڑے آرام سے جواب دیا تھا۔

"لاحول ولا۔ تمہارے جانے کی نہیں تمہارے اس باوا آدم کے زمانے کے لباس کی بات کر رہی ہوں میں۔"

"کیوں کیا ہوا اسے؟"

اس شان بے نیازی پر میں نے تو سر ہی پیٹ لیا تھا۔

"مومنہ کفایت کیا نام میں کفایت کافی نہیں تھی جو تم نے حلیے میں بھی اسے شامل کر رکھا ہے۔" میں نے زچ ہو کر کہا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے پھر رٹا رٹایا جملہ بولا۔ ہر سوال کے جواب میں شاید اس نے یہی جملہ از بر کیا ہوا تھا۔

"سچ کہوں مومنہ کفایت! کبھی کبھی تو مجھے تمہارے لڑکی ہونے پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ اس عمر میں کون سی لڑکی ہے جس کا بجنے سنورنے، پہننے اوڑھنے کو من نہ چاہے۔"

اب کی بار جواب میں ایک چپ آئی تھی میری جانب۔

بولتی آنکھوں میں لپٹی چپ۔

عمر سال نہیں گنتی۔ تب میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ مجھ جیسی شوق میں گم رہنے والی لڑکی کے لیے یہ حیرت ہی کی تو بات تھی لہٰذا وجہ جانے بغیر بلکہ کسی بھی وجہ کا تصور کیے بنا، ظاہر یہ مرنا اور ٹپ ٹاپ کو ہی زندگی سمجھنا۔ میں ایسی ہی سطحی سوچ کی مالک تھی۔ چپ اور چپ کے پیچھے بولتے تکرار کرتے جواز مجھ جیسی کم عقل کی پست سماعتوں میں بھلا یوں کہاں اترنے والے تھے۔ کچھ جواب زندگی اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے۔ یہ عقدہ تو آج کھلا تھا۔

☆☆☆

میں نے گردن موڑ کر جھٹکے سے اس کی طرف دیکھا۔ قدرت کی ستم ظریفی ہی کہوں گی! اتنے برسوں بعد جب وقت نے میری حالت خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے رونق کر دی، وہ مجھ سے آن ملی۔ مہنگے ترین برانڈڈ سوٹ میں ملبوس ایک ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں، دوسرے میں ڈائمنڈ سا بریسلیٹ، کانوں میں سونے میں جڑے یاقوت کے خوب صورت ائیر رنگز جو سوٹ کے ہم رنگ ہونے کے باعث اس کے رخساروں کی سرخی کو مزید دہکا رہے تھے۔ اس کی چمکتی آنکھیں اور چہرے کی دمکتی جلد اس کے اطمینان اور آسودگی کی گواہ تھی۔۔۔ نظر لگنے کی حد تک پیاری لگتی، دل میں اترتی یہ لڑکی ماضی کی مومنہ کفایت ہے۔ میں نے رشک سے سوچا۔ ایک لمحے کو خیال نے بھٹک کر مجھے اپنے حال کا آئینہ دکھایا تو دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔ درد قطرہ بن کر پلکوں سے بغاوت کر گیا۔۔۔ جو شاید اس کی نظر سے چھپ جاتا تو بھرم کا کوئی ذرہ وجود کی راکھ میں بچا رہتا۔

"ارے شمز! کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟"

"کیا آج بھی تمہیں میری ڈریسنگ پسند نہیں آئی۔" وہ کھلکھلائی۔

"اللہ کا شکر ادا کرو کسی بھی بڑے نقصان سے اس نے محفوظ رکھا، اب بالکل ٹھیک ہو تم۔"

اس نے جوس کا گلاس میرے لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"مومنہ آئی ایم سوری۔"

"نو سوری مائی ڈئیر۔ معذرت کی تو تب ضرورت ہوتی ہے جب اگلا بندہ آپ سے گلہ کرے۔ شکایت کرے۔ میرے دل میں بخدا کوئی گلہ شکوہ ہی نہیں تو پھر سوری کیسا۔" اس نے بڑے مطمئن لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ اس کا ہر لفظ اس کی سچائی کا امین تھا۔

"مومنہ! تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ مگر میں بہت کم ظرف ہوں۔ ہمیشہ ظاہر کو سب کچھ جانا اور تمہارے دل کو زخمی کر کے خوش ہوتی رہی۔"

"بس۔"

اس نے یک دم میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

"میں نے ہمیشہ تمہاری سنی۔ خاموش اس لیے رہی، شاید لاشعوری طور پر میں اس انتظار میں رہی کہ کبھی تم مجھ سے، اپنا سوال آرام سے پیار محبت میں کرو تو میں تمہاری بے چینی کا جواب دے دوں۔"

آج اس کی باری تھی۔

"پیاری شمز! وقت گرگٹ کی طرح ہے یہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ نامہربان ہو تو جینے کی رمق اور زندگی سے ہر رنگ چھین لیتا ہے۔ اس کے رنگ بھی عجب ہیں اور عجیب تر یہ کہ کوئی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ کچھ لوگوں کے لیے زندگی صرف امتحان ہوتی ہے۔ آزمائش ہوتی ہے اور احساس ذمہ داری ان کے عزائم اولین ترجیح۔ مجھے بھی ماما کی بے وقت موت کے بعد ایسا ہی لگا تھا۔ میں نے اپنے چھوٹے معصوم یتیم بھائیوں کے مقدر کی ابتدائی سطریں رقم کرنا تھیں۔ یقین مانو حرص و ہوس کی اس دنیا میں یتیمی بڑی سخت سزا ہے۔ مجھے ان کی سزا میں کمی کرنے کی کوشش کرنا تھی۔ بابا کہتے تھے عظمت ان ہی کا مقدر ہوتی ہے جو قربانی کے وصف سے آشنا ہوں۔ سو میں نے ان کی بات کو پلو سے باندھ کر سب خواب اور خواہشیں اچھے وقت کے انتظار میں طاق پر رکھ چھوڑیں۔ امنگیں تو ہر دل میں ہوتی ہیں۔ اللہ کی اس کائنات میں کون ہوگا جس کا دل بے آرزو ہو۔ مگر بچپن کی یتیمی نے مجھے اتنا سمجھا دیا تھا کہ ذمہ داریاں خواہشوں سے اہم ہیں۔ بھانت بھانت کی ہزار باتیں سن کر بھی اپنی خواہش دبا لیتی تھی روپیہ خرچ کرنا گناہ لگتا تھا۔ نند دل کی نئی نند دنیا کی۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو کم کرنے کی جستجو مجھے تقویت دیتی رہی اور میں اللہ کے بھروسے ہار کے چلتی رہی۔ اوپر والا قرض تو کسی کا رکھتا ہی نہیں، سو اس نے ایک کو دس سے ضرب دے کر ساری نیکیاں مجھے اطہر حبیب کی صورت میں لوٹا دیں۔ آج مجھے ہزاروں کا جوڑا بھی سستا لگتا ہے اور ہر خواہش میری انگلی پکڑ کر مجھ سے ناز بھی اٹھواتی ہے۔ اچھے دن ستارے بن کر روز میری دہلیز پر مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اب چلیں۔"

مومنہ نے بات ختم کرتے ہوئے مسکرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

میری سماعتوں میں اترتا اس کا ہر لفظ حیات کا اک روشن تازہ سبق لے کر میری روح میں حلول کر رہا تھا۔ نیکی کا کوئی مجسم وجود تھا تو اسے میری آنکھیں دیکھ چکی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے پاپا اور ممی جی کے چہرے آ گئے ان کا واحد سہارا شوبی میرا شریک سفر ایک حادثے کے باعث ان سے چھن چکا تھا۔ سہمی ہوئی بوڑھی نگاہیں ہر وقت نامہربان وقت کے چہرے پر جمی رہتی تھیں۔ میرے پلٹ جانے کا دھڑکا ان کی آنکھوں میں نمی بن کر تیرتا رہتا تھا، جسے میں کئی بار خود دیکھ چکی تھی۔ قربانی کا فلسفہ جاتے سال کی آخری شام چپکے سے میرے دل پر نقش کر چکی تھی۔ اک نئے جنم کی نوید بن کر روشن دلوں کی ساعتوں کے رنگ عزم کی صورت میرے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوئے تھے اور مجھے اس جنم کے پہلے سال اور اس سے آگے آنے والے ہر سال کو پاپا اور ممی جی کے نام کرنا تھا۔

مؤذن کی آواز نئے سال کی پہلی صبح کا پیغام دے رہی تھی۔ لاعلمی کی رات گزر چکی تھی۔ اب آگے روشنی ہی روشنی تھی احساس کی روشنی، وفا کی روشنی، بے لوث محبت کی روشنی۔

☆

WOMEN SKILLS GROUP

عمیرہ احمد

حاصل

"ایمانداری کی بات تو یہ ہے کاکا کہ آپ کو بھی اقتدار کا لالچ ہمیشہ سے اتنا ہی رہا ہے جتنا کہ مجھے تھا۔ آریانہ کے کھونے کے بعد آپ بدل گئیں ورنہ ڈونٹ ٹیل می کہ فرسٹ لیڈی بننا آپ کا سب سے بڑا خواب نہیں تھا۔" وہ سفاک ہوا تو عصرہ کی آنکھیں گلابی ہوئیں۔ جبڑا بھنچ گیا۔

"آریانہ کا نام مت لو۔ وہ میرے دل کا ٹکڑا تھی۔ اسے تم لوگوں کی سیاست نے چھین لیا اور اب میں دوبارہ فاتح کو اسی سیاست میں دھکیل دوں؟ میں تو سب کچھ تج کے امریکہ جانا چاہتی تھی ایش۔" وہ رو دینے والی ہو گئی۔ "تم مجھے کیا دوبارہ اسی دلدل میں دھکیل رہے ہو؟"

"کیا آپ آریانہ کا بدلہ نہیں لینا چاہتیں؟ کیا اس کی قربانی رائیگاں جائے گی؟" وہ زچ ہو کے بولتا چلا گیا۔ پھر یکدم چپ ہوا۔ عصرہ ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"قربانی؟ کیا مطلب؟" وہ یک لخت سیدھی ہو کے بیٹھی۔ "میری بیٹی کوئی مری نہیں ہے۔ وہ کھوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہو گی۔ وہ.... وہ کسی اچھی جگہ پرورش پا رہی ہو گی۔" اس کی آواز کپکپائی۔

اکیسویں قسط

Women Skills
WOMEN SKILLS GROUP

آنکھ سے آنسو لڑھکا۔

"ہاں میرا بھی یہی مطلب تھا۔"

"نہیں اشعر۔ تمہارا مطلب کچھ اور تھا۔" وہ بے قراری سے آگے ہوئی۔ "تم کچھ جانتے ہو آریانہ کے حادثے کے بارے میں؟ اگر جانتے ہو تو پلیز مجھے بتاؤ۔"

وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "کہ میرے واپس آہنگ سے آملنے کی ایک وجہ آریانہ بھی ہے۔ آپ آریانہ کی وجہ سے سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو چکی ہیں نا۔ تو پھر ٹھیک ہے... اب آپ "آریانہ" کی وجہ سے ہی واپس آئیں گی۔"

صمرہ کا گیلا چہرہ وہیں ساکت ہو گیا۔ آنکھوں میں بے پناہ الجھن ابھری۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اشعر اٹھا اور اس کے ساتھ صوفے پہ آکے بیٹھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟ آریانہ کا بدلہ لینا ہے آپ کو یا نہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے بولا۔ صمرہ کا سر اثبات میں ہلا۔

"تو پھر ہفتے کی رات ہم ایک ڈنر میں شریک ہو رہے ہیں۔ اگر آہنگ اس بات پہ راضی ہوتے ہیں تو میرا پہلا کیش ہو جائے گا ورنہ میں ان کے کیمپ میں کیسے جاؤں گا۔" وہ دھیمے لہجے میں بہن کو سمجھا رہا تھا۔ گہری فکریں صمرہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پہ بھی تھیں۔ صمرہ کی آنکھوں میں ابھی تک الجھن تھی۔

"ہم نے آریانہ کا معاملہ اللہ پہ چھوڑ دیا تھا۔ اتنے سال بعد ہم کیسے باز پرس کریں گے؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" اشعر کی آنکھیں چمکیں اور وہ تیز تیز بولنے لگا۔

باہر گھاس پہ ستاتے ہرن خالی بے تاثر آنکھوں سے قلعے کی روشن کھڑکیوں کو دیکھے جا رہے تھے۔

☆☆☆

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بہت سے دفاتر میں کام ابھی تک جاری تھا۔ ایسی ہی ایک بوجھل عمارت کے ایک فلور میں سفید بتیاں روشن تھیں البتہ کچھ کمرے اندھیرے میں ڈوب چکے تھے۔ بہت سے ملازمین اپنے کمرے لاک کر کے اٹھ چکے تھے اور کچھ ابھی تک کام کر رہے تھے۔

شیشے کے دروازے کے پیچھے ایک کمرہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈم نے دروازے پہ دستک دی تو اندر فائلوں میں الجھے شخص نے سر اٹھایا۔ پھر ایڈم کو دیکھ کے مسکرایا۔ آستین چڑھائے، ٹائی ڈھیلی کیے وہ سارے دن کا تھکا ہارا لگتا تھا۔ مگر خوش دلی سے بولا۔

"آؤ ایڈم۔ اندر آ جاؤ۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ایڈم سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس ازلی معصومیت چہرے پہ سجائے اندر داخل ہوا۔ شرما کے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

"تمہارا کام بہت مشکل تھا ایڈم۔ مگر پتا ساتھ ہے اس لیے میں نے کر دیا ہے۔"

نوجوان نے جھک کے دراز کھولا اور ایک فائل نکال کے اس کے سامنے رکھی۔ ایڈم جلدی سے کرسی کھینچ کے بیٹھا اور فائل کھولی۔ سب سے پہلے صفحے پہ جمی بن سلام نامی اس آدمی کی تصویر لگی تھی جو ہوٹل کے اس کمرے میں رہائش پذیر تھا۔

"تو پھر کون نکلا یہ آدمی؟ کوئی کرمنل؟ کوئی مافیا کا بندہ؟ یا جاسوس؟" ایڈم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

اس کا سرکاری ایجنسی کا آفیسر دوست ہاتھ باہم پھنسائے آگے ہوا اور سنجیدگی سے بولا۔

"ایڈم... یہ کوئی مجرم یا برا آدمی نہیں ہے۔ یہ بالکل کلین ہے۔ ایک نوکری پیشہ، اچھی شہرت والا وکیل ہے جو ہانگ کانگ میں ایک لاء فرم کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کے ماں باپ ملاکہ میں رہتے ہیں۔ ان سے ملنے آتا ہے۔ بیوی بچے ہانگ کانگ میں ہی ہوتے ہیں۔"

ایڈم نے سنجیدگی سے صفحے پلٹائے۔ فائل میں کچھ تفصیلات اس شخص کی نیک نامی کی گواہی دے رہی تھیں۔

"یہ تو اتنا کلین ہے کہ ایک پارکنگ ٹکٹ تک نہیں ہے اس کے ریکارڈ پہ۔ تم اس کی تحقیقات کیوں کر رہے ہو؟"

"کچھ تو ہے اس کے بارے میں۔ کچھ تو ہوا ہے۔" وہ بے چینی سے صفحے پلٹانے لگا۔ مضطرب [illegible] ہر طرف سے کئی جذبات نے اس پہ حملہ کر دیا تھا۔

"کچھ ہوا تو [illegible] سیدھا سادہ آدمی ہے۔ وکیل ہے۔ محنت [illegible] کرتا ہے۔ اپنے ماں باپ کے لیے وہاں سے [illegible] [illegible] اب تو یہ [illegible] بھی چلا جائے گا۔"

ایڈم ایک دم چہرہ اٹھا کے اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ وہاں اس کے کمرے میں تمہیں بھی [illegible]"

"تم اس کے کمرے تک پہنچ گئے۔"

"ایک منٹ ایک منٹ۔" وہ چونک گیا۔ "وہ اتنے دن سے یہاں ہے۔ اس نے اب تک ماں باپ کو [illegible] وہ ہوٹل میں کیوں رہتا ہے اس کے پاس کیوں نہیں ٹھہرا؟"

"ہاں میں نے پتہ کروایا تھا۔ وہ [illegible] اس کے گھر تک [illegible] مگر وہ شاید وہاں [illegible] نے بھی دروازہ نہیں کھولا۔"

"تو کیا اس کا ماں باپ سے فون پہ کوئی رابطہ نہیں ہے؟ تم [illegible] باہر سے آنے والا [illegible] کال [illegible] کیسے کر آتا ہے؟"

"کہہ رہا ہوں نا۔ معلوم کیا تھا میں نے۔ مجھے [illegible] کا کہنا ہے کہ اس کی ماں باپ سے کوئی ناراضی چل رہی ہے۔"

ایڈم ایک دم جوش سے سیدھا ہوا۔ چہرہ چمک اٹھا۔ "تو وہ اس کے لیے دروازہ نہیں کھولتے۔"

"ایڈم گھروں میں [illegible] مسئلے ہو جاتے ہیں۔ اس سے وہ کرمنل نہیں بلکہ ایک [illegible] ہے جو ماں باپ کو منانے کے لیے یہاں آیا بیٹھا ہے۔"

"چلو... کچھ تو بات ہے نا۔" ایڈم خوشی خوشی فائل لپیٹنے لگا۔ [illegible]

[illegible] اگر ایڈم کی خوشی اس میں تھی تو ٹھیک ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

☆☆☆

[illegible]

عصرہ کو دیکھا' پھر نظر انداز کر کے ٹائی کے بل دیتا رہا۔

عصرہ نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور آنکھیں رتجگے کے باعث گلابی تھیں۔

وہ چپ چاپ اس کے کندھے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ فاتح نے ٹائی کسی اور کف لنک اٹھانے کے لیے جھکتے ہوئے بولا۔

''میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ فائل والی بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''فاتح میں تمہاری کیمپین میں تمہارا ساتھ دوں گی۔'' وہ آئینے میں فاتح کا چہرہ دیکھ کے بولی تو وہ وہیں ٹھہر گیا۔ پھر کف لنک بھول کے سیدھا ہوا اور حیرت سے اس کی طرف گھوما۔

''ساتھ دو گی مطلب؟''

''میں تمہارے ساتھ.... کیمپین چلاؤں گی۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''جہاں کہو گے چلوں گی۔ ریلی میں' دعوتوں پہ' فنڈ ریزنگ پہ۔ ہر جگہ سیاسی بیوی کا رول پلے کروں گی۔ بچے اور میں امریکہ نہیں جائیں گے۔ ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ اشعر بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔ میں رات اس سے ملی اور میں نے اسے راضی کر لیا ہے۔ اس نے فنڈز کے لیے چیک بھی کاٹ دیا ہے۔ وہ کیمپین کو فنڈ کرے گا۔'' پھر چپ ہوئی۔ دونوں سنگھار میز کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم کسی لیکن کی طرف جا رہی ہو۔'' اسے دیکھتے ہوئے کف لنک اٹھایا۔

''لیکن....'' وہ زور دے کر بولی۔ نظریں فاتح کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔ ''تم ہمارے درمیان سے آریانہ کی پھانس نکالو گے۔''

فاتح کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ کف کا بٹن بند کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''یعنی؟''

''میری صرف ایک شرط ہے اور اگر تم اس کو مان لو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پلیز فاتح میری پوری بات سن لو۔''

''مجھے منظور ہے۔ جو بھی ہے۔'' اس نے کف لنک رکھے اور نرمی سے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''عصرہ مجھے کوئی بات اس سے زیادہ خوشی نہیں دے سکتی کہ تم میری جدوجہد میں میرے ساتھ کھڑی ہو۔''

''مگر پہلے میری بات تو سن لو۔'' وہ ملتجی انداز میں بولی اور پھر اشعر کے الفاظ دہرا دیے۔ وہ تحمل سے سنتا رہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے ویسے۔ اتنے سال بعد اس سب کو....'' مگر عصرہ کے تاثرات دیکھ کے گہری سانس لی۔ ''اوکے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ ڈن۔'' اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

عصرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ مسکرا دی۔

''ٹھیک ہے۔ پھر میں اور ایلش تمہارے ساتھ ہیں۔''

وان فاتح کے کندھوں سے بوجھ سا اتر گیا۔ سارے مسئلے جیسے حل ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

آج تالیہ گھر نہیں آئی تھی۔ وہ آفس آیا تو وہ اسے دروازے پہ ملی۔ اسے دیکھ کے لمحے بھر کے لیے تو وہ چونک گیا پھر سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔

وہ سیاہ اسکرٹ کے اوپر سفید منی کوٹ میں ملبوس تھی۔ بالوں کا باوقار جوڑا بنائے' گردن میں موتیوں کی لڑی پہنے' اسٹول سر پہ جمائے اور سامنے مفلر کی طرح بکل مارے' وہ اونچے عہدے پہ فائز ملے کاروباری یا سیاسی عورتوں کی طرح لگ رہی تھی۔

اسے دیکھ کر وہ مسکرادی اور اس کے پیچھے آفس میں چلی آئی۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھا تو تالیہ نے میز پہ چیک اس کے سامنے رکھا۔ فاتح چیک اٹھا کے مسکرایا۔

''ہاں مجھے عصرہ نے بتایا ہے کہ اس نے اشعر کو فنڈنگ کے لیے راضی کر لیا ہے۔''

وہ جو بہت جوش سے کہنے لگی تھی' اس بات پہ مسکراہٹ پھیکی ہوئی۔ گم صم سی ہو کے فاتح کو دیکھنے لگی۔

''اشعر نے اپنے لیے اچھا فیصلہ کیا۔ اس کے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ یہ چیک فنانس میں دے دو۔'' وہ بے نیاز اور مطمئن سا کندھے اچکا کے کہہ رہا تھا اور تالیہ کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔ خاموشی سے چیک اٹھایا تو وہ بولا۔

''یہ چیک کب بھیجا اس نے؟''

''کل شام میں' سر۔'' وہ بے دلی سے کہہ کے مڑنے لگی۔

''تو تم مجھے نہیں بتاؤ گی کہ اسے عصرہ نے نہیں تم نے کنوینس کیا تھا؟'' تالیہ بے یقینی سے واپس مڑی۔ وہ مسکرا کے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

''آپ کو..... کیسے پتا؟''

''کیونکہ یہ چیک دو دن پہلے کاٹا گیا ہے۔ اور تمہیں یہ شام کو ملا ہے جبکہ عصرہ اور اشعر رات میں ملے تھے۔ اور میں ان دونوں کو اچھے سے جانتا ہوں۔ اشعر' عصرہ کو کنوینس کر سکتا ہے' وہ اشعر کو نہیں۔ اور پھر تم نے کہا تھا کہ تم میرا فنڈنگ کا مسئلہ حل کرو گی تو مجھے تمہاری شکل دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تم یہاں مجھے اپنی ڈیل یاد کروانے آئی ہو۔ سو بولو..... کیا چاہیے تمہیں؟''

وہ قلم کو انگلیوں میں گھماتا کہہ رہا تھا اور اس کے لب خودبخود مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

''بول دوں' سر؟''

فاتح نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میک اوش''

وہ الفاظ نشتر کی طرح دل میں پیوست ہوئے۔ بہت سے آنسو بھی گلے میں جمع ہوئے مگر وہ مسکرادی وہ واپس اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''میں آج سے آپ کی باڈی وومن کے ساتھ ساتھ آپ کی پولیٹیکل سیکرٹری اور کیمپین مینیجر بھی ہوں گی۔''

''یعنی میری چیف آف اسٹاف؟''

''بالکل سر۔ میں آپ کے لیے کام کرنے والے تمام عملے کی چیف ہوں گی۔ میرا خیال ہے میں نے یہ پوزیشن ارن کی ہے۔''

گردن اکڑا کے بولی تو وہ مسکرا دیا۔ سوٹ پہنے' بالوں کو جیل سے دائیں طرف جمائے' وہ نکھرا نکھرا اور تازہ دم لگ رہا تھا۔

''شیور۔ اپنا اپائنٹمنٹ لیٹر بنا لاؤ' میں دستخط کر دوں گا۔'' وہ راضی تھا۔ مطمئن تھا۔ نرم پڑ چکا تھا۔

''اور سر..... اشعر صاحب ایک پارٹی پہ آپ کو لے جانا چاہتے ہیں.....''

جہاں مجھے وہاں اشعر اور عصرہ کی تشفی کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔'' وہ سر جھٹکتے ہوئے فائلز کی طرف متوجہ ہوا تو وہ چونکی۔

''کیا کرنا ہوگا؟''

''اٹس اے فیملی تھنگ' تاشہ۔'' شائستگی سے اسے اس کے مقام کا احساس دلایا اور فائل کھول لی۔ وہ ذرا پھیکی پڑی۔ ظاہر ہے وہ اس کی فیملی کا حصہ نہ تھی۔ بس چپ چاپ مڑ گئی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ پوری تمکنت سے عثمان کی کرسی پہ بیٹھی اپنے سامنے رکھی فائلز کا موازنہ کر رہی تھی۔ یہ اسٹاف کا اعمال نامہ تھا جو اس نے ان سارے دنوں میں جمع کیا تھا۔

(طاقت تب مضبوط ہوتی ہے جب اس کا اظہار کیا جائے۔) مراد راجہ کے الفاظ اس کی سماعتوں میں آج بھی گونجتے تھے۔

پھر وہ ایک کاغذ لے کر اٹھی اور باہر ہال میں آئی۔

ہال میں قطاروں کی صورت آفس کیبن بنے تھے..

کی بورڈز کے کھڑکنے کی آوازیں....فون کی گھنٹیوں کا شور....

ہر طرف لوگ فائلوں اور لیپ ٹاپس میں سر دیے بیٹھے تھے۔

تالیہ ہال کے سرے پہ کھڑی تھی...اس نے

چہرے پہ غصہ طاری کر رکھا تھا۔
اور سیدھ میں دیکھ رہی تھی... ہال کے آخری سرے کی طرف جہاں کیبن ختم ہوتے تھے۔ آخری کیبن میں ایک لڑکی سر جھکائے کام کرتی نظر آرہی تھی۔

اس لڑکی کو نگاہوں میں رکھے تالیہ قدم قدم چلنے لگی۔

فائلیں اٹھائے آگے پیچھے جاتے لوگ ہٹ ہٹ کے اس کو راستہ دینے لگے۔

وہ ماتھے پہ بل ڈالے تیز تیز چلتی' اس لڑکی کے سر پہ آرکی۔

کیبن کی دیوار چھوٹی تھی۔ اندر بیٹھی لڑکی چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

"میں آپ کو نوکری سے فارغ کرتی ہوں۔ ایک باکس میں اپنا سامان ڈالیں اور رخصت ہو جائیں۔ اور یہ... یہ آپ کا ٹرمینیشن لیٹر ہے!"

اس نے ایک لفافہ لڑکی کی طرف اچھالا۔

وہ لڑکی ہکا بکا سی اٹھ گئی۔ اردگرد کے لوگ بھی گردنیں نکال نکال کے دیکھنے لگے۔

"مگر... بے تالیہ... میرا قصور کیا ہے۔"

"آپ چھٹیاں بہت کرتی ہیں۔ آپ کو دو دفعہ زبانی اور دو دفعہ تحریری نوٹس جا چکا ہے جبکہ آفس کے قوانین کے مطابق دو زبانی اور ایک تحریری نوٹس کے بعد ٹرمینیشن لازم ہو جاتی ہے۔ آپ کو عثمان نے زیادہ مواقع دیے ہیں مگر میں عثمان نہیں ہوں۔" بلند آواز میں وہ تمکنت سے کہہ رہی تھی۔ سب دم سادھے سن رہے تھے۔

"میں وان فاتح کی چیف آف اسٹاف تالیہ بنت مراد ہوں۔ میرے الفاظ یہاں حرف آخر ہوں گے۔ میری وارننگ حتمی ہوگی۔ جو کام نہیں کرے گا وہ یہاں نہیں رہے گا۔ اور جو فاتح صاحب کے ساتھ مخلص ہو کے کام کرے گا' صرف وہی یہاں رہے گا۔ آپ فنانس سے اپنے ڈیوز لے لیں اور شام تک یہ سیٹ خالی کر دیں۔ میں آپ کی پورے مہینے کی تنخواہ ایشو کروا رہی ہوں۔"

اس لڑکی نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ پھٹی پھٹی نظروں سے تالیہ کو دیکھا۔

"یو کانٹ فائر می!"

"اوپس! آئی جسٹ ڈڈ" وہ سنجیدگی سے کہہ کے پلٹ گئی۔

کیبن کے درمیانی راستے سے گزرتی وہ سیدھ میں آگے بڑھتی گئی اور سب اسے خاموشی سے جاتے دیکھتے رہے۔ یہ چال' یہ اٹھی گردن' یہ حکمیہ لہجہ.....جو پیغام وہ دینا چاہتی تھی' وہ سب تک بخوبی پہنچ چکا تھا۔

تالیہ مراد اب ان کی باس تھی اور اس کی بات نہ ماننے کا انجام یہاں سے بے دخل ہو جانا تھا۔

☆☆☆

اشعر تھوڑی دیر کے لیے اپنے آفس میں آیا تھا جب اس نے رملی سے سارا واقعہ سنا۔ لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ چپ چاپ باہر چلا گیا۔

نیچے عمارت کے سامنے کھڑی اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے عثمان کو کال ملائی۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم وان فاتح کے کسی دشمن سے جا کے نہیں ملو گے' لیکن اب میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم وان فاتح کی سب سے بڑی دشمن کے پاس جاؤ گے۔ میٹنگ میں ارینج کروا دوں گا۔ تم نے بس ان سے وہ کہنا ہے جو میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں۔"

وہ اندر بیٹھ گیا تو رملی نے دروازہ بند کر دیا۔ چمکتی سیاہ کار کے سیاہ شیشے اندر کا منظر ڈھانپ گئے اور ان کے اوپر اونچی عمارت اور آسمان کا عکس نظر آنے لگا۔

☆☆☆

کے ایل پہ وہ رات گہری سیاہ ہوتی چلی گئی تو بادل یکایک بوجھل ہو کے برسنے لگے۔ تالیہ کے گھر پہنچنے تک بارش تیز ہو چکی تھی۔ وہ پورچ میں کار روک کے باہر نکلی تو برآمدے کے زینوں پہ ایڈم کو بیٹھے

دیکھا۔ وہ ہاتھوں پہ چہرہ ٹکائے جانے کب سے منتظر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کے وہ مسکرا دی اور دروازہ بند کر کے اس کی طرف آئی۔

"تم ملاکہ سے کب آئے؟"

"جب سارا دن اس آدمی کی فوٹیج دیکھ دیکھ کے تھک گیا تو آگیا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ تالیہ چابی سے دروازہ کھولنے لگی۔ ایڈم ساتھ ہی اسے اپنے دوست سے ملی معلومات سے آگاہ کیے جا رہا تھا۔ وہ مسکراہٹ دبائے سنتی گئی۔

"تم خوامخواہ اس بے چارے کے پیچھے پڑے ہو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھا تھا اور تالیہ کچن میں کھڑی کافی کا پانی رکھ رہی تھی۔ اس کی بات پہ وہ جل سا گیا۔

"کم از کم آپ تو ظالم سماج جیسی باتیں نہ کریں۔"

"میں تو ہمیشہ سے ہی ظالم شہزادی مشہور تھی۔" شہزادی نے کندھے اچکائے۔ اب وہ رمبوتان (پھل) ٹوکری میں نکال رہی تھی۔

"نوکری کیسی جا رہی ہے؟ کتنوں کے داہنے ہاتھ کٹوا دیے؟"

"آج پہلی ٹرمینیشن کی ہے۔ دل کو سکون سا مل گیا۔"

"یا اللہ۔ کس غریب کی نوکری چھینی ہے آپ نے؟"

"وہ یہ ڈیزرو کرتی تھی اور ویسے بھی کسی نہ کسی کو تو فائر کرنا تھا۔ سب کو پیغام بھی تو دینا ہوتا ہے نا کہ نیا باس آچکا ہے۔" وہ وہیں کھڑی سادگی سے بتاتی پھل پلیٹ میں سجا رہی تھی۔

"آؤچ۔ سیاست بڑی گندی چیز ہے پھر تو۔"

"تمہاری سوچ سے بھی زیادہ گندی۔" اس نے ٹرے میں پلیٹیں سجائیں اور اسے لیے سامنے لاؤنج میں آئی۔ ٹرے میز پہ رکھی تو ایڈم نے فوراً ہاتھ بڑھایا مگر تالیہ نے پلیٹ اٹھائی اور صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اسے گود میں رکھ لیا۔

"میں سارے دن کی تھکی ہاری آئی ہوں۔ یہ میرے ہیں۔ فریج میں مزید پھل پڑے ہیں۔ اپنے لیے خود لے کر آؤ۔" اور ابرو اچکا کے ایک ادا سے کھانے لگی۔ ایڈم نے بھنویں بھینچ کے خفگی سے اسے دیکھا۔

"قدر کیا کریں میری۔ میں نہ ہوتا تو آج ملائیشیاء کے اسکولز میں آپ کے جھوٹے سچے کارناموں کی کتاب نہ پڑھائی جاتی۔"

تالیہ نے بس ناک سکوڑا اور پھل کھاتی رہی۔ پھر ایڈم سنجیدہ ہوا۔

"آپ نے جلدی میں بتایا ہی نہیں اس دن کہ ذوالکفلی نے کیا کہا؟"

تالیہ نے بس یہی بتایا تھا کہ وہ آدمی ذوالکفلی تھا اور اس نے اسے تین سوال دیے تھے۔ تفصیل نہیں بتا سکی تھی۔ وہ دونوں اس روز کے بعد آج مل رہے تھے۔

"وقت کے تین سوال ہیں جن کا جواب اگر وان فاتح معلوم کر کے سمجھ جائیں تو ان کی یادداشت واپس آسکتی ہے مگر وہ بہت عجیب سوال ہیں۔"

"تو پھر ہم اسکالرز کے پاس جائیں گے' لائبریریز کھنگالیں گے' کچھ بھی کریں گے مگر جواب ڈھونڈیں گے۔ آپ مجھے وہ سوال لکھوائیں۔" وہ بہت امید سے کہتا جلدی سے قلم کاغذ سنبھال کے بیٹھ گیا۔ سامنے صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھی تالیہ نے تینوں سوال دہرا دیے۔ ایڈم نے انہیں نہیں لکھا۔ بس ٹکر ٹکر تالیہ کو دیکھنے لگ گیا۔ اسے ایڈم کے ساتھ ہمدردی ہوئی۔

"کہا تھا نا' بہت عجیب سوال ہیں۔ کہاں سے ڈھونڈیں گے جواب۔"

"سیریسلی بے تالیہ... آپ کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟" اس نے قلم بند کر کے پرے ڈال دیا تو وہ یکدم سیدھی ہوئی۔ آنکھوں میں بے یقینی اتری۔

"تمہیں ان کے جواب آتے ہیں؟"

"کس کو نہیں آتے؟ یہ تو ٹالسٹائی کی کہانی سے اخذ شدہ ہیں۔"

"تو مجھے بتاؤ نا۔ کیا جواب ہے ان کا۔"

"پہلے!" اس نے مسکرا کے پھل سے بھری پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ تالیہ نے منہ بنا کے پلیٹ میز پہ رکھی اور انگلی سے پرے دھکیلی۔ "اب بولنا شروع کرو ایڈم۔"

ایڈم بن محمد نے ایک رمبوتان اٹھایا' مزے سے دانت گاڑے' تھوڑی دیر چبایا اور گویا ہوا۔ "ایک بادشاہ یہ تین سوال ہر ایک سے پوچھتا تھا کہ کسی کام کا سب سے اہم وقت کون سا ہوتا ہے؟ انسان کی زندگی کا سب سے اہم کام کون سا ہوتا ہے؟ اور انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہوتا ہے۔"

وہ پھر سے پھل کھانے کے لیے رکا تو وہ بے چینی سے بولی۔ "ایڈم لمبا قصہ نہ سناؤ' بس جواب بتاؤ۔"

"صبر' شہزادی صاحبہ۔ صبر۔" اس نے مزے سے پھل چباتے ہوئے کہا۔ پلیٹ اب اپنے گھٹنوں پہ رکھ لی تھی۔ "آپ کو پوری کہانی سنی پڑے گی۔ اگر آپ کتابیں پڑھتی ہوتیں تو یہ دن نہیں نہ دیکھنا پڑتا مگر خیر... ایک بادشاہ یہ سوال سب سے پوچھا کرتا تھا مگر کوئی اسے تسلی بخش جواب نہ دے پاتا۔ پھر کسی نے اسے ایک درویش کا بتایا جو علم و دانائی سے مالا مال تھا۔ بادشاہ بھیس بدل کے اس کے پاس گیا' ویسے اس زمانے میں بادشاہ کتنے مزے سے بھیس بدل لیتے تھے۔ آج کل تو..."

"آگے ایڈم' آگے۔" اس نے دانت پیسے۔

"اچھا... اچھا..." ایڈم نے لاشعوری طور پہ دایاں ہاتھ ذرا اونچا کر لیا اور قصہ سنانے لگا۔

"بادشاہ درویش کے پاس گیا تو دیکھا وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے گڑھے کھود رہا ہے۔ ساتھ پودے بھی رکھے ہیں۔ بادشاہ نے اس سے وہ سوال پوچھے تو وہ چپ رہا۔ بادشاہ بھی اس کے ساتھ کام کروانے لگا۔ دونوں نے پودے لگا لیے تو جھاڑیوں سے کراہنے کی آواز آئی۔

دیکھا تو ایک آدمی زخمی ہوا پڑا ہے۔ بادشاہ فوراً اس کو اٹھا لایا اور قریب چھپے اپنے سپاہیوں کو بلا لیا۔ وہ فوراً آئے اور زخمی کی مرہم پٹی کی۔

اس نے رک کے ایک پھانک منہ میں رکھی اور تالیہ نے بہت تحمل سے اسے کھاتے دیکھا۔

"زخمی نے بتایا کہ اس کے بھائی کو بادشاہ نے پھانسی دلوائی تھی اور وہ بادشاہ کو بھیس بدل کے جاتے دیکھ کے اسے قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا مگر راستے میں سپاہیوں نے اس پہ حملہ کر دیا' اور اب بادشاہ کی رحم دلی دیکھ کے وہ سخت شرمسار ہے۔ بادشاہ کو اس پہ ترس آ گیا اور اسے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ شاہی طبیب کے ساتھ روانہ کر دیا۔

پھر درویش سے سوالوں کے جواب پوچھے تو درویش بولا کہ وہ تو آپ کو پہلے ہی مل چکے ہیں۔ بادشاہ بہت حیران ہوا اور بولا کہ میں نہیں سمجھا۔ تب درویش نے بتایا کہ اگر تم میری کمزوری پہ ترس کھا کے میری مدد کرنے نہ رک جاتے تو وہ آدمی جو تمہاری گھات میں بیٹھا تھا' تمہیں گھائل کر دیتا اور تم میرے ساتھ نہ ٹھہرنے پہ پچھتاتے۔

"اس وقت تمہارا سب سے اہم کام میری مدد کرنا تھا۔ اس کام کا سب سے اہم وقت "اسی وقت" تھا اور میں تمہارے لیے سب سے اہم شخص تھا۔ پھر جب وہ زخمی آیا تو اس کے زخم صاف کرنا اسی وقت ضروری تھا۔ اور وہ تمہارے لیے سب سے اہم کام اور سب سے اہم شخص بن گیا۔ اس لیے اے بادشاہ یاد رکھو کہ کوئی بھی کام کرنے کا سب سے اہم وقت "اب" ہوتا ہے۔ ناؤ۔ ابھی اسی وقت۔ کیونکہ ہمارے پاس اپنے "حال" میں سب سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ مستقبل کا کوئی بھروسہ نہیں۔

"اسی طرح سب سے اہم شخص وہ ہوتا ہے جو اس وقت تمہارے ساتھ ہے۔ چاہے وہ جو بھی ہو۔ زندگی کے اس حالیہ فیز میں جو ہمارے ساتھ ہے وہی سب سے اہم ہے۔ ماضی میں بچھڑے لوگوں کا غم اور مستقبل میں ملنے والے لوگوں کی تمنا غیر اہم ہے۔

"اور سب سے اہم کام اس موجودہ اہم شخص کے ساتھ بھلائی کرنا ہے۔ کیونکہ انسان کو دنیا میں اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ جو اس کے ساتھ ہے' اس سے وہ بھلائی کرے۔"

وہ یک ٹک سن رہی تھی اور ایڈم بولے جا رہا تھا۔ وہ بالکل چپ سی تھی۔

"تو بے تالیہ... بات بس اتنی سی ہے کہ وقت کے ان تینوں سوالوں کا جواب "حال" میں پوشیدہ ہے۔ انسان کو ہر کام کل پہ ٹالنے کے بجائے بروقت شروع کرنا چاہیے۔ اور اصل وقت "اب" ہوتا ہے۔ مستقبل کے خیالی پلاؤ بنانا غلط ہے۔ خوابوں کے لیے آج سے محنت شروع کر دینی چاہیے۔

اور اہم شخص وہ ہے جو زندگی کے حالیہ فیز میں ہمارے ساتھ ہے۔ کوئی کولیگ' یا گھر والے' یا ہاسٹل کے ساتھی' یا میاں بیوی... اس شخص کو ہر ایک سے زیادہ اہم رکھنا ہے ہم نے اور اس کے ساتھ بھلائی کرنا اور اس کا خیال کرنا' اس سے وفا نبھانا ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ جس دن وان فاتح یہ سمجھ جائیں گے' وقت ان کو ان کی یادیں لوٹا دے گا۔"

مگر وہ بالکل کھوئی کھوئی سی دور خلا میں دیکھ رہی تھی۔

"میں جب ایئرپورٹ پہ تھی... سات سال پہلے... تو میں نے ایک سوال کا جواب پا لیا تھا۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

"مجھے میرے منہ بولے دادا کی خدمت کے بعد ان کی جائیداد سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی تھی جس کی مجھے امید تھی۔ وہ میرا مستقبل تھا۔ مجھے اپنے اصلی ماں باپ کے ملنے کی بھی امید تھی جو میرا [illegible] گئے تھے۔ مگر جب میری شادی ہوئی ایڈم تو میں نے ایئرپورٹ پہ آ کے ملائیشیا میں قدم رکھتے ہوئے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ میں ماضی اور مستقبل کے غم اور [illegible] کے صرف اس شخص کو اہم جانوں گی جو اس وقت میرے ساتھ موجود ہے۔ میرا شوہر سمیع۔"

"مگر بعد میں سمیع نے جو آپ کے ساتھ کیا' اس کے بعد آپ نے صرف مستقبل کا سوچنا کیا۔ کبھی پلاننگ' دولت کمانا' ہر شے مستقبل کے لیے تھی۔ حال پہ غور نہیں کیا۔ ہے نا۔"

تالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر چونک کے اسے دیکھا۔

"مگر ہم... کیسے وان فاتح کو ان تین سوالوں کے جوابات سمجھائیں ایڈم؟" وہ بے چین ہوئی۔

"یہ ان کی اپنی جدوجہد ہے' بے تالیہ۔ ہم چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔"

"لیٹ اٹ ہیپن نیچرلی۔"

اس کی بات نے فضا میں اداسیاں گھول دی تھیں۔ رمبوتان کی پلیٹ اب دونوں کے درمیان میز پہ دھری تھی اور وہ اس کے دونوں اطراف میں چپ چاپ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

☆☆☆

ایسی ہی ایک خالی سڑک تھی جو شہر کے حاکمی زون میں واقع تھی۔ اسٹریٹ پولز اس خوبصورت اور کھلی سڑک کو روشن کیے ہوئے تھے۔

وہاں قطار میں تین لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے سیاہ شیشے سڑک کا عکس دکھا رہے تھے۔ ایسے میں ایک کار کا دروازہ کھلا اور باہر کھڑا عصمان کھنکھارتا ہوا اندر بیٹھا۔ سلائیڈنگ ڈور بند کر دیا گیا اور کار کے اندر کی مدھم بتی روشن ہو گئی۔

اندر سٹنگ روم کی طرح آمنے سامنے نشستیں لگی تھیں۔ صوفہ کے ساتھ سوٹ میں ملبوس ایک آدمی بیٹھا تھا جو غالباً اس کا چیف آف اسٹاف تھا۔

"ملاقات کے لیے شکریہ' عزت مآب!" عصمان نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے سر کو جھکایا۔

"جو بھی کہنا ہے پانچ منٹ سے زیادہ مت لینا۔ [illegible] ری رائے وسل بلوورز کے بارے میں ویسے بھی بہت خراب ہے۔"

عصمان نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ اور گہری

سانس لی۔
"میں یہاں وان فاتح کے خلاف زہر اگلنے نہیں آیا۔ میں ان کا وفادار ملازم رہا ہوں اور کسی بھی قیمت پہ میں ان سے غداری نہیں کروں گا۔"
"واؤ۔" صوفیہ نے نزاکت سے اسے دیکھا۔ "تو پھر تم نے مجھ سے ملنے پہ اصرار کیوں کیا؟"
"کیونکہ میں اپنے ملک کو بچانا چاہتا ہوں۔"
"کس سے؟" اس نے ابرو بھینچے۔
عثمان نے کوٹ کی جیب سے ایک فائل نکالی اور اس کے سامنے کی۔ صوفیہ نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالتے ہوئے فائل گھٹنوں پہ رکھی اور کھولی۔ سامنے تالیہ کی تصویر جگمگا رہی تھی۔
"ہوں۔ یہ تو تمہارے ایکس باس کی نئی چیف آف اسٹاف ہے نا۔"
"یہ لڑکی فراڈ ہے۔ اس فائل میں اس کے شوہر کا پتا بھی لکھا ہے جو اس وقت جیل میں ہے۔ یہ چند سال پہلے جب کے ایل آئی تھی تو ایک غریب لڑکی تھی۔ اب اس نے دولت بنالی ہے اور یہ وان فاتح کے قریب ہو گئی ہے۔ یوں' میں تو اپنے باس کو اس سے بچانا چاہتا ہوں۔"
صوفیہ رحمن نے فائل بند کر کے لاپروائی سے اپنے چیف آف اسٹاف کو تھمادی۔
"مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ تم جاسکتے ہو۔"
عثمان کو اشعر نے اس جواب کے لیے تیار رہنے کا کہا تھا۔ وہ سلام کہتا خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی صوفیہ نے گردن موڑ کے اپنے چیف آف اسٹاف کو دیکھا اور سوچتے ہوئے بولی۔
"اتنی تیزی سے ترقی کرنے والی خوبصورت لڑکیاں یا کرمنل ہوتی ہیں یا کال گرلز۔ اگر وان فاتح کی چیف آف اسٹاف ان دونوں میں سے ایک نکلے تو یہ بہت بڑا اسکینڈل ہوگا' ہے نا۔"
اس کا ملازم مسکرایا اور سر کو خم دیا۔
"تم یہ فائل کل صبح کے ایل کے سب سے ایماندار پراسیکیوٹر کو دے دو۔ کل سے ہم..." جھک کے فائل پہ نام دیکھا۔ "تالیہ مراد کو انویسٹی گیٹ کرنا شروع کریں گے۔ حکومتی ذرائع' ایجنسیز سب کو استعمال کرو اور مجھے بتاؤ کہ یہ لڑکی کون ہے' کہاں سے آئی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔"
"یس میم!"

☆☆☆

ایڈم رہوتان کی پوری بات ختم کر کے چلا گیا تو وہ تھکی تھکی سی وہیں صوفے پہ لیٹ گئی۔ سارے دن کی تھکاوٹ کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کچھ دیر گزری تو چابی سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔
"تالیہ... تم یقین نہیں کرو گی مجھے تمہارے فاتح صاحب کا کون سا راز معلوم ہوا ہے۔"
داتن نے اندر آتے ہی خوف اور جوش سے بھرے انداز میں اسے پکارا۔ وہ صوفے پہ دائیں کروٹ لیٹی رہی۔ گال کشن پہ رکھے' وہ یہاں سے داتن کو آتے دیکھ سکتی تھی۔
"آریانہ والا راز؟" بس سادگی سے پکارا۔ داتن اثبات میں سر ہلاتی تیز تیز چلتی اس کے سر پہ آ کھڑی ہوئی۔
"یار تالیہ... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنی بڑی بات دنیا سے چھپائے گا۔"
"مگر مجھ سے نہیں چھپائی تھی۔ مجھے سب بتادیا تھا انہوں نے۔" وہ لیٹے لیٹے اداسی سے بولی۔
"خیر... اگر تم نے معلوم کرلیا ہے تو صوفیہ رحمن بھی کرسکتی ہے۔ ہمیں کوئی کاؤنٹر اسٹریٹجی بنانی ہوگی۔"
محض نظریں اٹھا کے داتن کو دیکھتے وہ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ویسے تم نے کیسے معلوم کیا؟ وہ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے اسے دفن کیا تھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔"
اس کے سرہانے کھڑی داتن بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ "دفن؟ کس کو؟" پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ "آریانہ مر چکی ہے؟ وہ تو صرف کھوئی تھی۔"
تالیہ کرنٹ کھا کے اٹھ بیٹھی۔ سنہری بال کندھوں پہ بکھر گئے۔

"تم یہی معلوم کر کے آئی تھیں داتن؟ تم بھی بتانے لگی تھیں مجھے؟" اسے احساس ہوا تھا کہ کچھ غلط ہے۔
"نہیں تو۔ مجھے تو تم سے پتا چل رہا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔ یا اللہ... اسے وان فاتح نے خود دفن کیا ہے؟" داتن نے کانوں کو چھوا۔ تالیہ گڑبڑا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"تو پھر تم مجھے کیا بتانے آئی تھیں؟ آریانہ کا تو ایک ہی راز ہے۔ مجھے فاتح نے خود بتایا تھا۔"
داتن نے افسوس سے اسے دیکھا اور صوفے کے کنارے بیٹھی' پھر پرس نیچے رکھا اور تالیہ کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کے سیاہ ہاتھوں میں تالیہ کے سفید ہاتھ ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔
"تالیہ... میری بچی... کیا تم واقعی وان فاتح کو جانتی ہو؟"
"ہاں... میں ان کو اچھے سے جانتی ہوں۔" سنہری بالوں کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ سانس روک کے وہ داتن کو دیکھ رہی تھی۔ "اور وہ آریانہ کے متعلق سب سے اہم بات مجھے بتا چکے ہیں۔ پیچھے کچھ باقی نہیں رہتا۔"
داتن نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے اس کے ہاتھ دبائے۔ "تمہارے نزدیک وان فاتح کی زندگی کا سب سے بڑا سچ کیا ہے' جس کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا؟"
تالیہ کی آنکھوں کے کنارے بھیگے۔ "یہ کہ ان کو اپنی بیٹی آریانہ سے زندگی میں سب سے زیادہ محبت تھی۔"
"اور اگر میں کہوں کہ یہ ایک جھوٹ ہے تو؟"
تالیہ نے تڑپ کے اپنے ہاتھ کھینچے۔ "غلط۔ بالکل غلط۔ ان کو آریانہ سے ہی سب سے زیادہ محبت تھی۔"
"ہاں تالیہ' یہ سچ ہے' اس کو آریانہ سے سب سے زیادہ محبت تھی' "اپنی بیٹی" آریانہ سے نہیں۔"
تالیہ مراد اپنی جگہ منجمد ہوگئی۔ برف کے مجسمے کی طرح ساکت اور جامد۔
"آریانہ فاتح کی بیٹی نہیں تھی۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا؟"

اس نے دیکھا' اپنے ذہن کے پردے پہ...
ایک عجیب منظر جس میں وہ خود بھی تھا
نیم تاریک کال کوٹھری میں فرش پہ [illegible]...
اس... جسم کے انگ انگ میں درد اٹھ رہا تھا...
کچلی سے بیٹھے خون کی لکیر گردن پہ [illegible]...
سامنے وہ دوزانو بیٹھی تھی...
سنہرے الجھے بالوں کی لٹ کے پیچھے...
نکھرا سا سیاہ کرتا پاجامہ پہنے...
وہ سر جھکائے اس کے ہاتھ پہ مرہم لگا رہی تھی...
گرم زخم پہ ٹھنڈا مرہم اسے اندر تک جلائے دے رہا تھا...
یکایک لڑکی نے آنکھیں اٹھائیں...
دونوں کی نظریں ملیں... اور وہ مبہوت رہ گیا...
وہ اس لڑکی کو پہچانتا تھا۔

☆☆☆

تالیہ مراد کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی اور اپنے سر پہ کھڑی داتن کو بے یقینی سے دیکھا۔
"آریانہ فاتح کی بیٹی نہیں تھی؟"
"اونہوں۔" داتن نے گردن دائیں بائیں گھمائی اور پھر دھپ سے اس کے ساتھ صوفے پہ آ گری۔
"جس بچی کو فاتح اور مصروف نے بیٹی کی طرح پالا تھا اور جس سے ان دونوں کو بہت محبت ہے' وہ ان کی سگی بیٹی نہیں تھی۔"
"ایں؟ تو پھر وہ کون تھی؟" وہ ہکا بکا سی داتن کو دیکھنے لگی۔ ساری نیند رفو چکر ہو گئی تھی۔
"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"
"تو داتی کیسے معلوم ہوا؟"
"کیونکہ تم نے مجھے وان فاتح کی فنانشل ٹرانزیکشنز چیک کرنے کے لیے کہا تھا۔ پیسہ کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ اب پیسے کا روٹ لیانہ صابری سے بہتر کوئی نہیں چیک کرسکتا۔ تو اسی مد میں مجھے وان فاتح کا ایک خفیہ بینک اکاؤنٹ ملا جس کو وہ زیادہ استعمال نہیں کرتا۔"
"اور؟" وہ دم سادھے سن رہی تھی۔

"دلچسپ بات یہ ہے کہ فاتح ایک زمانے میں اس اکاؤنٹ سے ایک مخصوص رقم ہر ماہ کسی رپورٹر کو بھیجتا تھا۔ رقم کافی زیادہ تھی اور آریانہ کی گمشدگی تک ادائیگی کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر بند ہو گیا۔"

"ظاہر ہے کوئی رپورٹر اسے بلیک میل کر رہا تھا اور میں پہنچ گئی رپورٹر کے پاس۔" داتن فخر سے بتا رہی تھی۔ "اس کی زبان کھلوانا مشکل نہ تھا۔ ویسے بھی آریانہ کی گمشدگی کے بعد اس نے خوف خدا کے ہاتھوں وان فاتح کو بلیک میل کرنا چھوڑ دیا تھا۔"

لاؤنج میں داتن کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ تفاخر سے مسکراتے ہوئے اپنی کارکردگی بتا رہی تھی اور تالیہ دونوں پیر اوپر کر کے بیٹھی بے چینی سے اصل بات سننے کی منتظر تھی۔

"اس رپورٹر کو گزشتہ الیکشن میں صوفیہ رحمٰن کے باپ کے کمپین منیجر نے وان فاتح پہ Oppo ریسرچ کرنے کے لیے ہائر کیا تھا۔ وہ رپورٹر میری طرح زیرک تھا اور بال کی کھال اتار لیتا تھا۔ میری طرح اس کی تفتیش انتہائی باریک بین اور......"

"تم اپنی یہ تعریفیں بعد میں بھی کر سکتی ہو۔ پہلے کام کی بات کر لیں؟"

داتن نے اسے خفگی سے گھورتے ہوئے ناک سکوڑی۔

"کہتے ہیں، اچھا دوست قسمت سے ملتا ہے اور اگر دوست میرے جیسا......"

"کیانہ صابری!" اس نے زور سے صوفے کی گدی پہ ہاتھ مارا۔

"رپورٹر۔ کیا معلوم ہوا رپورٹر کو؟"

داتن جلدی جلدی بولنے لگی۔

"جب آریانہ دو سال کی تھی تو وان فاتح نے اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بنوانے کے لیے ایک سرکاری افسر کو رشوت دی تھی۔"

"وہ بھی ناجائز کام کے لیے رشوت نہیں دے سکتے۔ ناممکن۔" وہ نہیں مان سکتی تھی۔

"رپورٹر نے جب سرکاری افسر کا بیان سامنے لا کے رکھا تو فاتح نے سچائی سے اعتراف کر لیا کہ اس نے واقعی برتھ سرٹیفکیٹ کے لیے رشوت دی تھی۔"

"تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی نہیں ہے۔"

"کیونکہ اس وقت اس بچی کی عمر دو سال تھی اور وان فاتح کی شادی کو صرف ایک سال گزرا تھا۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ "یعنی وہ عصرہ اور فاتح کی بیٹی نہیں ہے مگر ہو سکتا ہے وہ فاتح کی کسی پہلی بیوی یا......"

"رپورٹر کو بھی یہی لگا کہ یہ بچی یا تو کسی خفیہ بیوی سے ہے یا جائز نہیں ہے، مگر جب اس نے فاتح کو بلیک میل کرنا چاہا تو فاتح نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ بچی اس کی اپنی نہیں تھی، نہ عصرہ کی تھی۔ اس نے اسے اڈاپٹ کیا تھا۔"

"تو اڈاپٹ شدہ بچی پہ اتنا پردہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اتنے ماہ اس رپورٹر کو منہ بند کرنے کے لیے پیسے کیوں دیتے رہے؟"

"رپورٹر کا کہنا ہے کہ کچھ تو تھا جس کو وہ چھپانا چاہتا تھا کیونکہ اس نے جیسے ہی فاتح سے کہا کہ وہ صوفیہ کے باپ کو بتا دے گا تو فاتح اس کو پیسے دینے پہ راضی ہو گیا۔ البتہ جب بچی کھو گئی تو انسانیت کے ناتے اس رپورٹر نے فاتح سے رابطہ منقطع کر دیا۔"

"اگر وہ بچی شروع سے اس کے ساتھ تھی تو اس کا مطلب ہے اس نے شادی بھی اس بچی کو کاغذی ماں باپ فراہم کرنے کے لیے کی تھی۔" وہ چونک کے بولی۔

"ایک انٹرویو میں عصرہ نے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ فاتح کو شادی کی جلدی تھی۔"

"اور عصرہ نے اس کی مدد کی۔ وہ دونوں امریکہ میں رہتے تھے تو انہوں نے ہر طرح سے اس بچی کے معاملے کو کور کر کے رکھا۔ ملائیشیا میں لوگ یہی جانتے تھے کہ وہ فاتح اور عصرہ کی بیٹی ہے۔ انہوں نے اس کی عمر ایک سال کم لکھوائی تھی۔"

"اور یہ اِل لیگل برتھ سرٹیفکیٹ اس نے امریکہ کے بجائے ملائیشیا میں کیوں بنوایا؟"

"کیونکہ یہاں ناجائز کام زیادہ آسانی سے ہو جاتے ہیں۔"

تالیہ اب ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھے چھت کو دیکھتی سوچ رہی تھی۔

"یعنی وان فاتح نے اس بچی آریانہ کے لیے اپنی ساری زندگی بدل کے رکھ دی۔ عصرہ نے بھی اس کا مکمل ساتھ دیا۔ ماننا پڑے گا، وہ اچھی بیوی ہے۔ اس کے لیے اپنے بچوں کا تحفظ سب سے بڑھ کے ہے۔"

(نہ چاہتے ہوئے بھی اعتراف کیا۔)

"تم نے ایک دفعہ بھی میرا شکریہ ادا نہیں کیا، لڑکی۔" داتن پدوکا نے کافی دیر انتظار کے بعد سوچ میں گم تالیہ کو ٹہوکا دیا تو اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ابھی تو تم بڑا دوست دوست کا راگ الاپ رہی تھیں۔ دوستوں کو شکریہ اور سوری نہیں کہتے۔"

"مگر کچھ کھانے کے لیے تو کہہ دیتے ہیں نا۔"

وہ خفگی سے اٹھی اور خود ہی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھر کاؤنٹر کے قریب رکی۔ وہاں کوکو پھل کی ٹوکری اس دن سے ایسے ہی رکھی تھی۔

"یہ ایڈم کیوں بھیجتا ہے تمہارے لیے اتنے ہائی کیلوری تحفے؟"

"وہ نہیں بھیجتا۔"

"پھر کون؟" داتن چونک کے اس کی طرف گھومی۔ وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے سوچ میں گم نظر آ رہی تھی۔

"بتا دوں تو کون سا تم یقین کر لو گی؟"

داتن نے دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ رکھے اور بھنویں سکوڑ کے اسے دیکھا۔

"کیا تمہیں ہماری دوستی پہ اتنا بھی یقین نہیں ہے؟"

تالیہ نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ "تم یقین نہیں کرو گی۔ کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"تم آزما کے تو دیکھو۔"

تالیہ نے کاؤنٹر کے پار کھڑی متفکر سی داتن کو دیکھا اور مسکرائی۔

"اگر میں کہوں کہ میں نے اڑنا سیکھ لیا ہے؟ یا انسانوں کو ہاتھ کے اشارے سے سانپ، بچھو بنا سکتی ہوں؟ یا جس شے کو چھوؤں اس کو سونا بنا دیتی ہوں۔ تو کر لو گی یقین؟"

"تمہیں اب بھی شک ہے؟"

"اور اگر میں کہوں کہ......" داتن پہ جمی اس کی آنکھیں بھیگیں۔ آواز کپکپائی۔ "کہ میں نے وقت میں سفر کیا ہے؟ میں چھ سو سال پہلے کے ملاکہ کی شہزادی تاشہ ہوں؟ اور میں نے وہاں کے غلام فاتح سے شادی کر لی تھی؟ اس ایک رات میں ایڈم میں اور فاتح چار ماہ قدیم ملاکہ میں گزار آئے ہیں تو یقین کر لو گی؟"

کسی کھلی کھڑکی سے تیز جھونکا آیا اور اس کے چہرے پہ آئے بال پیچھے کو اڑنے لگے۔ اس کی گردن اٹھی تھی اور داتن پہ جمی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

داتن کے ہاتھ پہلو میں آن گرے۔ لب ہلکے سے کھل گئے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی قریب آئی اور میز کے کنارے پہ بیٹھی۔

"تو تم نے چابی کا قفل ڈھونڈ لیا تھا؟ اس کتاب میں لکھا تھا کہ وہ وقت کا دروازہ ہے۔ کیا واقعی وہ؟"

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنسو ست روی سے گرنے لگے۔ اس سفر کو یاد کرنا خوف اور تکلیف کو یاد کرنا تھا۔ وہ وقت کی قید، وہ مراد راجہ کا اصلی چہرہ جاننا، وہ جنگل میں ننگے قدموں سفر کرنا—یا اللہ!

"تم نے وقت کا دروازہ پار کر لیا؟ میں نے تمہیں منع کیا تھا مگر تم نے نہیں سنا۔" وہ ایک دم بے بسی سے غصہ ہوئی۔

"وہ کتاب درست کہتی تھی۔ تمہاری گردن کا نشان.... تم پمبورو تھیں۔ شکار باز۔ اوہ تالیہ! تمہیں کیوں لگا میں تمہارا یقین نہیں کروں گی؟"

"کیونکہ میں نے ساری عمر جھوٹ بولے ہیں اور دیکھو وقت نے کیسے میرے ساتھ جھوٹ بول دیا۔ مجھے ایسا سچ تھما دیا جسے کہنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ میں بہت تکلیف میں ہوں، داتن۔" وہ ہموار لہجے میں کہہ رہی تھی البتہ آنسو گرتے جا رہے تھے۔

"مجھی لیے میں محبت اور بھٹکے کے اس راستے پر چھوڑ گئی ہوں۔ [illegible] مجھے [illegible] ہو۔"

"میں نے بہت کوشش کی، بہت محنت کی ہے [illegible] خود کو [illegible] مجھے حقیقت کو [illegible] لوگ [illegible] مجھے [illegible] کا [illegible]"

[illegible]

قدم کے ساتھ دیکھا، اس کا تو جیسے بھیجہ کٹ گیا تھا۔

"مجھے شروع سے بتاؤ کہ اس رات کیا ہوا تھا۔" وہ واقعی تالیہ کے لیے پریشان ہو گئی تھی۔

پھر وہ جو بولنا شروع ہوئی تو صبح تک بولتی رہی۔

کچن کا کاؤنٹر پہ رنگین پھولوں سے بھری ٹوکری خاموشی سے ان دونوں کو صوفوں پہ بیٹھے باتیں کرتے دیکھتی رہی۔

روشنی پھیلنے لگی تھی جب داتن تیسری دفعہ چائے بنانے اٹھی تو رک کر اس کی طرف گھومی۔

"تم آج سے مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔ تمہیں تمہاری پچھلی ایڈلنگ دلانے کے لیے لیانہ صابری کو جو بھی کرنا پڑے وہ کرے گی مگر تمہاری امید نہیں ٹوٹنے دے گی۔ تم ابھی بھی بچی ہو تالیہ۔ اور جب انسان اچھا بن جاتا ہے تو اس کے گناہ اس کے پیچھے نہیں آتے۔"

"واقعی داتن؟" اس نے امید اور خوف سے داتن کا ہاتھ تھام کے پوچھا۔ "کسی کو کبھی نہیں علم ہو گا کہ میرا ماضی کیسا تھا؟ اگر میں مستقبل کو اچھے بچوں سے لگاؤں تو میرا ماضی اور پیچھے رہ جائے گا؟ [illegible] تھے۔"

"ہاں، تالیہ۔ تمہارا ماضی کبھی کوئی نہیں کھود سکے گا اور نہ ہی تمہارے جرائم تمہارے پیچھے آئیں گے۔" داتن نے بتانے کی کوشش کی۔

وہی تسلی تھی جو تالیہ نے تھوڑی دیر پہلے اسے دینے کے لیے کہا تھا۔

☆☆☆

اس صبح پراسیکیوشن آفس میں دو لوگ ایک میز کے گرد بیٹھے تھے اور ان کے درمیان ایک فائل رکھی تھی۔ سب سے اوپر [illegible] کی تصویر چسپاں تھی اور دیگر صفحات پہ اس کی ہسٹری فائل تحریر تھی۔

جو شخص تصویر اٹھا کے غور سے دیکھ رہا تھا، وہ ادھیڑ عمر کا سرمئی بالوں والا لمبا مرد تھا۔ آنکھوں پہ سلور فریم کا چشمہ لگائے وہ کشادہ پیشانی اور شگفتہ مزاج کا حامل انسان لگتا تھا۔ اس کا نام احمد نظام تھا اور وہ چیف پراسیکیوٹر تھا۔

"سنیں احمد!" سامنے بیٹھا آفیسر رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"یہ تالیہ بنت مراد ہے۔ وان فاتح بن رامزل کی پی آر کمپین مینیجر۔ ایک معروف سوشلائیٹ اور چیریٹی ورکر۔ اٹارنی جنرل کے آفس سے یہ فائل آپ کو اس لیے بھیجی گئی ہے تاکہ آپ معلوم کریں کہ کیا یہ لڑکی وہی ہے جو یہ خود کو کہتی ہے؟"

سلور بالوں والے پراسیکیوٹر نے تصویر رکھی، عینک اتاری اور آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے اسے غور سے دیکھا۔

"حکام بالا ایک دم سے ایک عام سی لڑکی میں کیوں دلچسپی لینے لگے ہیں؟"

"کیونکہ وہ ایک دم سے وان فاتح کے گرد نظر آنے لگی ہے۔"

"مگر سیاستدانوں کے گرد تو سارے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دولت مند Heirs (جانشین)۔ سوشلائیٹ (جانشین)، تاجر، کاروباری لوگ۔ عام

[illegible] سیاستدانوں کے قریب [illegible] مجھے [illegible]"

[illegible]

احمد نظام مسکرایا اور پیچھے ہو کے ٹیک لگائی۔

"میں اس آفس میں اتنے عرصے سے کام کر رہا ہوں، جتنے عرصے میں بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ میں جب کسی کیس کی ابتدائی فائل دیکھتا ہوں تو مجھے [illegible] کہ کیس میں کچھ ہے یا نہیں اور اس کیس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جب کوئی جرم ہوا ہی نہیں تو ایک بے چاری لڑکی کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟"

"اس فائل میں اس کے ایکس بوائے فرینڈ کا بیان بھی لکھا ہے جو کہ اس وقت جیل میں ہے۔ اس کا بیان پڑھ کے آپ کی رائے بدل جائے گی۔"

"کتنے لوگ ہیں جو اپنے ایکس کی تعریف کرتے ہیں؟ تو اس (فائل پہ نام پڑھا) تالیہ کے ایکس بوائے فرینڈ کی رائے کو میں کیسے معتبر مان لوں؟"

سامنے بیٹھے آفیسر نے گہری سانس بھری۔ سرکاری افسر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آپ اس کیس کو دو ہفتے کے لیے ٹرائل کے طور پہ لیں۔ اگر اس میں کچھ نہ ملے تو اسے چھوڑ دیجیے گا۔"

"صاحب اگر مجھے کسی مقام پہ یہ معلوم ہوا کہ ..." احمد نظام نے آگے کو جھک کے سنجیدگی سے تنبیہ کی۔ "یہ کیس صرف ایک سیاسی فشنگ ایکسپڈیشن تھا اور مجھے اس کا حصہ بنایا گیا ہے تو میں اسی وقت استعفیٰ دے دوں گا۔ میں وان فاتح اور سوفیہ رحمن ان دونوں سیاست دانوں سے نالاں ہوں۔"

[illegible]

"اس لڑکی نے ابھی تک کوئی جرم نہیں کیا جو ہمیں معلوم ہو اور نہ ہی [illegible] اگر وہ [illegible] تو میں اس فائل کو بند کر دوں گا۔"

اس کا لہجہ بے لچک اور اٹل تھا۔ یہاں کوئی لچک کوئی ڈھیل نہ تھی۔ سرکاری افسر نے [illegible] سے ہاتھ ملایا۔

"میرے خیال میں تو یہ کیس اتنی جلدی بند نہیں ہو گا۔"

☆☆☆

ٹیلیگرام کے دفتر میں معمول کے مطابق صبح سویرے ہی گھنٹیوں اور آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔ سارے کیبن قطار میں بنے تھے اور پروڈیوسرز، کمپوزرز اور ایڈیٹرز اپنے اپنے کی بورڈ میں سر دیے کام کر رہے تھے۔

ایڈم بن محمد کندھے پہ لیپ ٹاپ والا بیگ اٹھائے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چیک والی شرٹ اور سادہ انداز میں جمائے بال معمول کے مطابق تھے۔ آج اس نے سوٹ وغیرہ نہیں پہنا تھا۔ اب تو اس کی جاب پکی تھی۔ مگر کیا یہ آگے بھی پکی رہے گی؟ یہی اندیشہ اس کو پریشان کیے ہوئے تھا۔

ایڈیٹر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کے اندر سر نکال کے جھانکا تو وہ کام کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہی پہلے دن والے تاثرات ناک پہ غصہ۔ چہرہ جھکا ہوا تھا۔ ایڈم نے کھنکھارا۔

"سر...... میں آجاؤں؟"

انہوں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا تو وہ فوراً اندر آیا اور شروع ہو گیا۔ "سر! میں شرمندہ ہوں کہ اس ہفتے کوئی اسٹوری نہیں دے سکا۔ آپ نے مجھے جاب دی مگر میں آپ کی توقعات پہ پورا نہیں اتر سکا۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں اگلے ہفتے میں......"

"ایڈم! آؤ آؤ...... بیٹھو۔ کب آئے تم؟" ایڈیٹر کے چہرے پہ ایسی خوشی اتری کہ ایڈم کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ گنگ سا اس کو دیکھنے لگا جو کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اور اسٹوری کی کیا بات کرتے ہو؟ اتنی دلچسپ خبر ہم نے بریک کی، وہ بھی تمہاری وجہ سے۔ بیٹھو نا۔"

پہلے تو اسے لگا وہ طنز کر رہا ہے مگر ایڈیٹر کی خوش اخلاقی قدرتی تھی۔ ایڈم نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"میری کون سی اسٹوری؟ وہ ایکٹریس کے اسکینڈل والی تو آپ نے چھاپی ہی نہیں۔"

ایڈیٹر نے مسکرا کے ہاتھ جھلایا۔ "جانے بھی دو اسے۔ اصل اسٹوری تو تم نے حالم کے خط کے لفافے کے اندر ڈال کے دی تھی۔ وہ تو شکر ہے میں نے وہ لفافہ کھول لیا ورنہ وہ بٹن کیمرہ اور وان فاتح کی ویڈیو تو ردی کی ٹوکری میں چلی جاتی۔ ویسے کیا شاندار ویڈیو لیک کی۔ ہماری ویب سائٹ کے ہٹس ایسے اوپر گئے کہ......"

وہ جوش سے بتا رہا تھا اور ایڈم بن محمد کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

حالم کے بنگلے تک کا سفر اس نے غصے، صدمے اور بے بسی کی جس حالت میں طے کیا، صرف وہی جانتا تھا۔ گیٹ بند تھا۔ اس نے زور سے گھنٹی بجائی، پھر غصے سے چھوٹا گیٹ پھلانگا اور تیزی سے پورچ میں آیا۔ بند دروازے کو زور سے دھڑ دھڑایا۔

"آرام سے...... آرام سے!" داتن نے دروازہ کھولا اور ساتھ ہی برہمی سے اسے ٹوکا، مگر ایڈم کا سرخ چہرہ اور بھنچی ہوئی بھنویں دیکھ کے ٹھہری۔ "تمہیں کیا ہوا؟"

"یہ تالیہ کہاں ہیں؟" وہ غرایا۔

"جہاں اس وقت سارے کنگ میکرز ہوتے ہیں۔ اپنے سیاستدانوں کے گرد۔"

وہ تیزی سے مڑا اور گیٹ کی طرف بڑھا تو داتن نے پکارا۔ "تمہارے خیال میں تمہیں کوئی سیاسی پارٹی کے دفتر میں اس ایٹی ٹیوڈ کے ساتھ گھسنے دے گا؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟" لہجہ ابھی تک سخت تھا۔

ایڈم واپس گھوما اور چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"آف کورس آپ تو جانتی ہی ہوں گی۔ بہرحال یہ تالیہ سے کہیے گا مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ انہوں نے میرے ذریعے...... میرے ذریعے (زور دے کر) فاتح صاحب کی ویڈیو لیک کروائی تھی۔"

"تو؟"

اس نے کندھے اچکائے تو ایڈم نے غصے اور بے بسی سے سانس باہر خارج کی۔

"تو یہ کہ مجھے ان کے فاتح صاحب سے دھوکہ دہی کرنے سے زیادہ اس بات کا افسوس ہے کہ انہوں نے کہا تھا وہ خود کو بدل رہی ہیں۔ اور میں نے یقین کر لیا تھا۔ مگر وہ اب بھی ویسی ہی ہیں۔"

"اکیلی کیوں بدلے وہ؟" داتن نے غراتے ہوئے باہر قدم رکھا تو وہ ٹھہر گیا۔

"تم کیوں نہ بدلو؟ فاتح رامزل کیوں نہ بدلے؟ ساری دنیا کیوں نہ بدلے؟" وہ پورچ پہ قدم قدم اس کے قریب آرہی تھی۔ بھاری بھرکم داتن نے ہاتھ دونوں پہلوؤں پہ جمار کھے تھے اور غیض و غضب سے چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

"صرف میری تالیہ کیوں بدلے؟ اس نے تو طے کر لیا ہے کہ وہ اپنے اصل سے نہیں بھاگے گی اور اپنے ٹیلنٹ کو اپنے عزیز لوگوں کے فائدے کے لیے استعمال کرے گی مگر میں پوچھتی ہوں لڑکے تم لوگ کیوں نہ بدلو؟ وان فاتح کیوں مصلحت پسندی کی سیاست چھوڑ کے اپنی بیوی اور اس کے بھائی کے خوف سے آزاد ہو کے اپنے "اصل" کے ساتھ قدیم ملاکہ والا بے خوف انسان کیوں نہ بنے؟" وہ اسے گھورتے ہوئے قریب آرہی تھی۔ ایڈم کے تاثرات بدلے۔ قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا۔

"اور تم کیوں نہ بدلو؟ کب تک خودترسی کا شکار ہو کے بے روزگار پھرو گے؟ تم اس ڈنر پہ اسی جگہ کھڑے تھے جہاں عثمان نے کھڑے ہو کر وہ ویڈیو بنائی تھی۔ ہم نے بٹن کیمرے کو چیک کیا تو وہ وائی فائی سے کنیکٹڈ نہیں تھا مگر عثمان کے فون سے ضرور تھا۔ اشعر وغیرہ کے پاس ویڈیو ہو یا نہ ہو، عثمان کے پاس اس کی کاپی ضرور تھی۔ کبھی نہ کبھی اسے لیک ہونا تھا اور تم پہ الزام لگتا۔ مگر جانتے ہو عثمان نے تم پہ الزام کیوں نہیں لگایا؟"

وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھی اور وہ چوکنا سا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دیوار سے کمر ٹکرائی تو رک گیا۔

"کیونکہ تالیہ نے تمہیں وہ ڈھال تھما دی تھی جس کو اٹھائے تم کسی کی خبر لیک کر سکتے ہو، کسی کا راز کھول سکتے ہو، کسی کی جاسوسی کر سکتے ہو۔ تمہیں اس چیز کا لائسنس مل گیا ہے ایڈم۔ اور جانتے ہو وہ ڈھال کیا ہے۔"

"رپورٹر ہونا!" دیوار سے لگا ایڈم دھیرے سے بولا۔ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ "کیونکہ رپورٹر یہ سب کر سکتا ہے۔"

"بالکل، ایڈم بن محمد!" داتن اس کے عین سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ "تمہیں اب امیونٹی مل گئی ہے اور جاب بھی۔ تمہیں کیا لگتا تھا، تمہیں بغیر کسی ڈگری یا قابلیت کے کام کے بڑے سے اخبار میں ریونی جاب مل جائے گی؟ وہ وڈیو تمہاری ہی دی تھی۔ اسی سے تمہیں عزت ملنے لگے گی۔ وہ ویڈیو وان فاتح کے گرد بیٹے عثمان جیسے لوگوں کو دور کرنے کا ہتھیار تھی۔ وان فاتح کو آزاد کرنے کی چابی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی فاتح کی ویڈیو بنانے کی کوشش نہیں کرے گا کیونکہ اس ویڈیو سے اس کو ملنے والی عزت اشعر جیسے لوگوں کی عبرت کے لیے کافی ہے۔ اس لیے آئندہ تالیہ پہ غصہ کرنے کے بجائے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یہ گیٹ پھلانگنا بہتر ہو گا۔"

ایڈم پہ گھڑوں پانی پڑ چکا تھا۔

تو یہ طے تھا کہ صرف تالیہ کو نہیں بدلنا تھا۔ اس کے گرد موجود باقی دنیا کو بھی تالیہ کے مطابق خود کو تبدیل کرنا تھا۔ چاہے خوشی سے، چاہے زبردستی۔

"ظاہر ہے، جب میں نے سنا تو مجھے غصہ آیا مگر......" ایڈم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے شانے اچکا دیے۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ پھر ایک دم وہ چونکا۔

"آپ نے کہا قدیم ملاکہ والا فاتح۔ آپ کو کیسے پتا؟"

داتن نے گہری سانس لی، ہاتھ پہلوؤں میں گرائے اور آنکھیں گھمائیں۔ "ظاہر ہے تالیہ میری بہترین دوست ہے۔ اس نے تمہارے وقت کے سفر کی روداد پہلے دن ہی سنا دی تھی مجھے۔"

"پہلے دن؟" ایڈم نے مشکوک انداز میں ابرو اٹھائی۔

"مطلب دوسرے دن۔"

ایڈم نے دوسری ابرو بھی اٹھائی۔

"مطلب...... کل بتایا اس نے۔"

داتن برے موڈ سے بولی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔ ماحول سے تنی خود بخود چھٹنے لگی۔

"تو بالآخر انہوں نے آپ پہ یقین کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔" اس کے چہرے کی سرخی ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی مگر اب وہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ چیزیں

سیاہ اور سفید نہیں ہوتیں۔ چیزیں اس سے زیادہ پیچیدہ ہوتی ہیں۔

"اس کو پیچھے سے مجھ پہ یقین تھا۔" اس نے شانے اچکائے مگر اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد وہ دونوں لاؤنج سے ملحقہ اوپن کچن میں میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ماحول کی [illegible] اب چائے کی خوشبو میں گھل کے ختم ہو چکی تھی۔ البتہ دانش کے چہرے کے زاویے بدستور اکھڑے اکھڑے سے تھے۔

"آج چائے ٹھیک سے نہیں بنی۔ ضائع ہونے سے بہتر ہے تم پی لو۔ تمہیں اپنے کڑوے رویے کی سزا بھگتنی چاہیے۔"

"آپ مجھے اس چیز کے ساتھ بھی چائے کی پیشکش کر سکتی تھیں، جس کو خوش اخلاقی کہتے ہیں۔"

"میرے سامنے [illegible] خوش۔" وہ اسی طرح [illegible] اس کے سامنے چائے کے برتن لگاتی گئی۔ "ویسے بھی یہ ادب آداب تمہارے [illegible] میں بچے ہوں گے۔ ہم تو [illegible] زمانے کے لوگ ہیں۔ [illegible] جنریشن۔"

"تو یہ جلیہ نے سب بتا دیا؟" ایڈم نے [illegible] میں [illegible] اٹھایا اور گھونٹ بھرا۔ چائے بے حد خوش ذائقہ تھی۔

"ہاں۔ یہ بھی کہ تم وہاں سو رہے تھے۔ ہاہاہا۔ تصور کرو۔ سو رہے۔" وہ ہنس رہی تھی۔ "ویسے مجھے افسوس ہے کہ تمہارا سامان [illegible] کے گھر سے نہیں نکلا۔"

"سامان؟"

"ہاں۔ جلیہ نے کہا تم نے کچھ چیزیں وہاں چھپائی تھیں روزمرہ کی مگر واپس آ کے کھدائی پہ وہ نہیں نکلیں۔ افسوس ہوا۔"

وہ واقعی فکر کر رہی تھی مگر ایڈم سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"وہ صرف "چیزیں" نہیں تھیں اور نہ ہی فقط "میں" نے چھپائی تھیں۔ شاید ہے جلیہ شرمندگی سے بچنے کو بات چھپا گئی۔ وہ پورا خزانے سے بھرا صندوق تھا جو ہم دونوں نے [illegible] کے چھپایا تھا۔"

دانش کے ہاتھ سے چمچ زور سے ٹرے میں آ گرا۔ اس کا منہ کھل گیا۔

"خزانے کا صندوق؟ پورا صندوق؟" اس کے تو چہرے کے [illegible] روشن ہو گئے۔

"جی ہاں۔ پورا صندوق بھرا تھا ہم نے مگر کوئی ہمارے واپس آنے سے پہلے ہی نکال کے لے گیا۔"

"کون لے گیا؟ کہاں لے گیا؟ تم لوگوں نے کوئی تفتیش بھی نہیں کی؟ یا اللہ پورا صندوق؟" دانش کو ہول اٹھ رہے تھے۔

"سارا گھر کھود لیا۔ کچھ نہیں ملا۔ اب تو میں نے اس پہ فاتحہ بھی پڑھ لی ہے۔" [illegible] میں دونوں ہاتھ [illegible]

"چلو اٹھو۔ اسی وقت ہم [illegible] جا رہے ہیں۔ اللہ کی پناہ! تم لوگوں نے اپنا خزانہ اتنی آسانی سے کیسے چوری ہونے دیا۔" وہ ابھی اور [illegible] کے اٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔ ایڈم [illegible] کے کھڑا ہوا۔ چائے کا مگ میز پہ رکھ دیا۔

"مگر خزانہ تو غائب ہو چکا ہے۔ اسے اب کیسے ڈھونڈا جائے؟"

"کبھی اسکول گئے ہو؟ کبھی سائنس کی کتابیں پڑھی ہیں؟ مادے کا پہلا اصول یاد ہے؟" وہ [illegible] کہنے لگا کہ "اے خاتون! کتابوں تک نہ ہی آئیں تو اچھا ہوگا۔" مگر وہ بولتی جا رہی تھی۔

"مادہ نہ تخلیق ہوتا ہے نہ تباہ ہو سکتا ہے۔ اس کی بس حالت بدل جاتی ہے۔ خزانہ بھی غائب نہیں ہوتا۔ اس کا بس مالک بدل جاتا ہے۔ اور نئے مالک کو ان چیزوں کو بیچنا بھی پڑے گا اور جب وہ بیچے گا تو ہم اس کو ٹریپ کر لیں گے۔ اب راستے میں تم مجھے ہر چیز کی تفصیلی ڈسکرپشن دو گے۔ چلو بھی۔"

وہ مڑ کے بولی تو ایڈم بس اسے دیکھ کے رہ گیا۔

"یہ کتابیں نہ پڑھنے والا طعنہ آپ نے مجھے [illegible] دیا؟" وہ خفا ہوا۔

"کیونکہ تمہاری جنریشن کے لوگوں کو کتابوں سے الرجی ہے۔ سارا وقت اسکرینوں میں گھسے رہتے ہیں۔ کبھی کتابیں پڑھو تو جانو کہ دنیا کتنی بڑی ہے اور انسان کتنا کمزور ہے۔" وہ اپنے پرس میں جلدی [illegible] کہہ رہی تھی۔ ایڈم نے [illegible] اسے دیکھا۔

"ہو سکتا ہے ایڈم نے آپ سے زیادہ کتابیں پڑھی ہوں۔"

دانش نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ "میں [illegible] کے ایل کی سب سے بڑی لائبریری میں [illegible] ہوں۔ میں اپنے ساتھ چار کتابیں [illegible] ایک [illegible] ایک میں کھانے کے ساتھ اور ایک رات کو سونے سے پہلے۔ تم ایک سال میں کتنی کتابیں پڑھ لیتے ہو؟"

ایڈم کا منہ کھل گیا۔ [illegible] "آپ نے سچ کہا۔ مجھے [illegible] کے بارے میں [illegible] معلوم۔" [illegible]

[illegible]

☆☆☆

شام کی اس تقریب سے پہلے [illegible] سیدھا تقریب [illegible] جہاں صرہ اور ہاشم پہلے سے موجود [illegible]

[illegible]

[illegible]

"The Evil Queen"

[illegible]

نہیں ہوں۔ میں ایک عاجز ورکر ہوں جو فاتح رامزل کے تابع ہے۔ میں یہ سب ان کے "ساتھ رہنے" کے لیے کر رہی ہوں اور مجھے اس دنیا میں "حکومت کرنے کی" کوئی خواہش نہیں ہے۔ یہ پرچی لکھنے والا غلط ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ میں نے کتنی محنت سے خود کو بدلا ہے۔ میں اب وہ شہزادی نہیں ہوں جو قید خانے میں فاتح پہ تشدد کرتے دیکھ کے سپاہیوں پہ چلائی تھی کہ وہ ان کی ہونے والی ملکہ ہے۔ میں بس تالیہ ہوں۔" پرچی مروڑ کے پرس میں ڈال دی اور سر اٹھایا تو دھات میں اس کا عکس بدلا بدلا سا تھا۔ عکس میں تاج پہنے کامدار لباس میں ملبوس مسکراتی ہوئی شہزادی تاشا اس کو دیکھ رہی تھی۔

"پرچی درست کہتی ہے' تالیہ۔ تم اپنے اندر کی طاقت کی ہوس میں ڈوبی شہزادی تاشہ کو خود سے الگ نہیں کر سکتیں۔"

تالیہ نے جلدی سے سر جھٹکا۔ لفٹ کے دروازے کھل گئے اور وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ اسے اپنے اندر کی آوازوں کو ہر صورت دبانا تھا۔

تقریب ایک فارم ہاؤس پہ منعقد کی گئی تھی۔ وسیع لان کے درمیان میں مستطیل سا نیلا تالاب تھا جس میں غبارے تیر رہے تھے۔ تالاب نے لان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ دونوں اطراف میں مہمان گلاس تھامے' خوش گپیوں میں مصروف ٹہلتے دکھائی دیتے تھے۔

وہ فاتح کے کندھے کے پیچھے تھی۔ آلو بخارے کے رنگ کے منی کوٹ کو سفید اسکرٹ بلاؤز پہ پہنے' بالوں کو درمیان کی سیدھی مانگ نکال کے جوڑے میں باندھے' وہ چوکی اور محتاط نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے برعکس اس کا باس پرسکون نظر آ رہا تھا۔ ٹائی ندارد تھی اور سفید شرٹ کے اوپر سرمئی کوٹ پہنے' بالوں کو ماتھے پہ بکھیرے وہ مسکرا کے ہر آنے والے سے مل رہا تھا۔

وہ دونوں گارڈز کے ہمراہ لان کے سرے تک آئے تو سامنے عصرہ اور اشعر منتظر کھڑے تھے۔ عصرہ نے سرمئی اسٹول سر پہ اوڑھ رکھا تھا مگر اس کے باوجود سامنے سے بھورے بال اور موتیوں کا نیکلس دکھائی دیتا تھا۔ وہ فاتح کو دیکھتے ہی مسکرا کے اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔

اشعر بھی "آبنگ" کہتا آگے بڑھا اور اس کے آبنگ نے بھی فوراً۔ پُرجوش انداز میں اس کا ہاتھ تھام کے مصافحہ کیا۔ ان دونوں کے درمیان جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب وہ تینوں ایک تکون کی طرح مسکرا کے بات کر رہے تھے اور تین قدم دور کھڑی تالیہ کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

سیاسی مفاد کے لیے سب کتنے مزے سے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ انسان تو ابھی تک قدیم ملاکہ جیسا تھا۔ وہاں بھی ملکہ یان سوفو اور تالیہ مشترکہ دشمن (مراد رلجہ) کے خلاف اکٹھی ہو گئی تھیں۔

اور..... یکدم احساس ہوا کہ عصرہ چبھتی نظروں سے اس کی مسکراہٹ دیکھ رہی ہے تو اس نے چہرہ سیدھا کر لیا۔ عصرہ واپس فاتح کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تھینک یو فاتح!" وہ تشکر سے کہہ رہی تھی۔ "یہ کرنے کے لیے۔" ساتھ ہی کن اکھیوں سے لان کے دوسرے سرے کی طرف اشارہ کیا۔ تالیہ نے چونک کے ادھر دیکھا۔

تالاب نے لان کو دو حصوں میں یوں بانٹا تھا کہ حکومتی ارکان کا جمگھٹا دوسری طرف لگ چکا تھا۔ اور وہاں سب کے درمیان کھڑی صوفیہ رحمٰن نمایاں نظر آ رہی تھی۔

"فیملی کے لیے کچھ بھی۔" فاتح نے جواباً مسکرا کے شانے اچکائے۔ تالیہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اشعر' عصرہ اور فاتح کی مسکراہٹ کچھ کہہ رہی تھی۔

"کچھ ہونے جا رہا ہے' سر؟" اس نے بے چینی سے پوچھا تو عصرہ نے سرد مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"اِٹس اے فیملی تھنگ' تالیہ!"

"رائٹ!" تالیہ کی تنی پیشانی ڈھیلی ہو گئی۔ بس سر کو خم دے دیا۔ اشعر نے بھی محظوظ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہم صوفیہ رحمٰن سے آریانہ کا حساب لیں۔" اور تالیہ کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا جو تالیہ کی اگر فائل کھلی تو وہ زیادہ عرصہ تک آفس میں نہیں ٹکے گی۔ اس لیے اسے تالیہ کو پلان سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ آخری ڈنر میں اپنے شادی شدہ ہونے کا بتا چکی تھی اور اشعر کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو چکی تھی۔

فاتح اور اشعر ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

"اب عوام کو کھل کر بتانا بہت ضروری ہے کہ آپ کی قربانی کتنی بڑی تھی۔ لوگوں کو احساس ہونا چاہیے اور....."

"ایش میں یہ ہمدردی لینے کے لیے نہیں کر رہا بلکہ تمہاری اور عصرہ کی خواہش پہ کر رہا ہوں۔ اگر تمہاری حمایت کی یہ قیمت ہے تو مجھے منظور ہے۔" وہ دونوں دور ہوتے گئے تو ان کی آوازیں بھی دم توڑ گئی۔ تالیہ کی بے چین نگاہوں نے ان کا تعاقب کیا تو عصرہ کی آواز نے اس کی توجہ ہٹائی۔

"خود کو مت تھکاؤ' تالیہ۔ ہم فاتح کی فیملی ہیں اور ہماری بات وہ کبھی نہیں ٹالتا۔"

طنز سے بولی تو تالیہ زبردستی مسکرائی۔ پھر عصرہ بھی وہاں سے ہٹ گئی اور وہ بھری پارٹی میں اکیلی کھڑی رہ گئی۔

ان کی تکون دور اپنے مہمانوں میں مشغول ہو چکی تھی گویا آج فاتح کو تالیہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔

مگر بنداہارا کی بیٹی کو تنہا کھڑے ہونا کب برا لگتا تھا؟ آرام سے ایک مشروب سے بھرا گلاس اٹھایا اور قدم قدم آگے چلنے لگی۔ عقابی نگاہیں تالاب کے دوسری طرف کھڑی صوفیہ رحمٰن پہ جمی تھیں۔

وہ بھورے اسکارف کو چہرے کے گرد لپیٹے' یاجو رنگ پہنے' مسکراتے چہرے والی عورت تھی۔ نقش تیکھے مگر خوبصورت تھے۔ گردن یوں تنی تھی گویا سریا لگا ہو مگر چہرے کی میٹھی مسکراہٹ دل لبھاتی تھی۔ شاہانہ انداز میں مسکرا مسکرا کے ساتھ کھڑے افراد سے بات کر رہی تھی۔ یکدم نگاہیں اٹھا کے تالاب کے پار کھڑی تالیہ کو دیکھا۔

دونوں کی نظریں ملیں تو اسے بے اختیار ملکہ یان سوفو یاد آئی۔ کچھ تھا ان دونوں عورتوں میں جو ایک جیسا تھا۔ کچھ اپول کوئن جیسا!

صوفیہ اسے دیکھ کے مسکرائی اور دوبارہ سامنے والے شخص سے گفتگو میں مصروف ہو گئی۔

تالیہ کی نظر ابھی تک اس پہ جمی تھی۔ کچھ تھا جو اسے چبھا تھا۔

(میں نے اس عورت کے ساتھ کبھی کوئی اسکام نہیں کھیلا مگر اس کی یہ اندر تک اترتی نظر..... یہ معنی خیز مسکراہٹ کیسی تھی؟ جیسے کہہ رہی ہو۔ میں تمہیں جانتی ہوں!)

فاتح اپنے اقرباء کے درمیان کھڑا تھا جب عصرہ اشعر کو ایک طرف لے گئی' پھر اس کی کہنی تھامے قدرے بے چینی سے پوچھا۔

"ہم ٹھیک کر رہے ہیں نا' ایش؟"

"آف کورس' کاکا۔ کیا آپ کو صوفیہ سے آریانہ کا بدلہ نہیں لینا؟"

"ہاں مگر..... ہم کسی بے گناہ پہ الزام تو نہیں لگانے جا رہے نا ایش؟" وہ قدرے ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ "واقعی صوفیہ نے ہی ہماری آریانہ کو غائب کروایا تھا نا؟"

"آف کورس۔ اس کے علاوہ کون ایسا کر سکتا ہے' کاکا؟" پھر نرمی سے اس کے ہاتھ تھامے اور سمجھانے لگا۔ "آریانہ ہماری سنو وائٹ تھی اور صوفیہ رحمٰن وہ ظالم ملکہ ہے جس نے ہماری سنو وائٹ کو ہم سے دور کیا ہے۔ صوفیہ رحمٰن ہماری کہانی کی ولن ہے اور ہو سکتا ہے وہ اب بھی جانتی ہو کہ ہماری سنو وائٹ کہاں ہے۔ اس طرح کرنے سے شاید وہ اسے ہمیں لوٹانے پہ مجبور کر دے۔"

"واقعی ایش؟" وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔ "وہ ہمیں واپس مل جائے گی نا؟ ہماری سنو وائٹ؟ ہاں

مجھے یاد ہے تم اسے یہ کہتے تھے۔ سنو وائٹ۔" ایک آنسو مسکارا لگی آنکھوں سے ٹوٹ کے گرا اور گال پہ بہہ گیا۔

"وہ فیری ٹیلز میں جیتی تھی اور خود بھی فیری ٹیل ہی بن گئی۔"

"کاکا میرے تم سے اور آبنگ سے لاکھ اختلاف اور لڑائی جھگڑے ہو جاتے ہیں، میں جانتا ہوں، مگر ایک بات میں اللہ کو گواہ بنا کے کہتا ہوں کہ مجھے آریانہ سے بہت محبت تھی۔ اور اب اس ظالم ملکہ کے حساب دینے کا وقت آ گیا ہے۔" وہ اسے ٹھوس لہجے میں یقین دلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا یقین تھا کہ عصرہ کے سارے خدشے دور ہونے لگے۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

تالاب کے پار کھڑی صوفیہ رحمٰن نے گلاس کا آخری گھونٹ بھرا اور پھر خالی گلاس کو دیکھا۔ پھر ایک دم نظریں تالیہ کی طرف اٹھائیں۔ وہ ابھی تک اسی کو دیکھے جا رہی تھی۔ دونوں کے بیچ تالاب حائل تھا۔ صوفیہ نے مسکرا کے خالی گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

ملکہ کو مشروب درکار تھا۔ تالیہ مراد نے سر کو مسکرا کے اثبات میں جنبش دی اور آگے بڑھ گئی۔

چند لمحے بعد وہ ایک بھرا ہوا گلاس لیے صوفیہ کے قریب جا رہی تھی۔ اس کی چال متوازن اور گردن اعتماد سے اٹھی تھی۔ اسے معلوم تھا صوفیہ اس سے ملنا چاہتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ قریب آئی تو صوفیہ کے گرد سے (ہدایت کے مطابق) لوگ چھٹنے لگ گئے۔

اب وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تنہا کھڑی تھیں۔

"یانگ امت برحرمت!" (معزز ترین) تالیہ نے ادب سے گلاس پیش کیا۔ گردن جھکائی مگر نظریں اٹھائے رکھیں۔

یہ اس نے ایک غلام سے سیکھا تھا۔

یانگ امت برحرمت (وزیراعظم کا لقب) نے ہیروں کی انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سے گلاس تھاما اور محظوظ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"تو تم میرے کلاس فیلو کی نئی چیف آف اسٹاف ہو۔ ویسے اس کی بیوی تم سے خوش نہیں لگتی، ہے نا؟"

وہ جانتی تھی کہ صوفیہ اس کے اور فاتح کے درمیان کسی "تعلق" کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور ایسے الزامات پہ عقلمند لوگ دفاع نہیں کرتے۔

"ان کی بیوی تو خود ان سے بھی خوش نہیں لگتی۔ جیسے آپ کی والدہ آپ کے والد سے خوش نہیں لگتی تھیں۔"

صوفیہ کے چہرے پہ برہمی کی جگہ ہنسی در آئی۔ وہ ہلکا سا ہنسی۔

"بہادر ہو۔ بولڈ بھی۔ بی این کو تمہارے جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔" مسکرا کے گھونٹ بھرا۔

"وہ کیا ہے یانگ امت برحرمت کہ مجھے ملکاؤں اور سلاطین کی آنکھوں میں دیکھ کے بات کرنے کی عادت ہے، مگر ان کا ادب ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ آپ کو کوئی اور چیز لا دوں؟ آپ نے فرائیڈ ونگز چکھے؟ میں نے آپ کے انٹرویو میں پڑھا تھا کہ وہ آپ کے فیورٹ ہیں۔" ادب اور شائستگی سے پوچھا۔ بھورے اسکارف والی شاہانہ سی عورت کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"تمہارے انداز سے لگتا ہے تم کسی اعلیٰ خاندان سے ہو۔ وان فاتح کو تم جیسے لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔"

"بالکل۔ کیونکہ وان فاتح کے دشمن بھی بہت خاندانی ہیں۔"

"آہ تالیہ.....!" ملکہ نے گھونٹ بھرتے ہوئے شانے اچکائے۔ "میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ میں اس کی کمپیٹیٹر ہوں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ایسا نہیں سمجھتا۔"

"سیاست میں تو دونوں ایک ہوتے ہیں یانگ امت برحرمت!"

"غلط۔ دشمن وہ ہوتا ہے جو ذاتی دشمنی پہ اتر جائے۔ میں کبھی ذاتی دشمنی پہ نہیں اتری۔ میں نے

اس مقابلے کو ہمیشہ ڈگنیفائیڈ رکھا ہے مگر بے چارہ میرا کلاس فیلو۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بدگمان رہتا ہے۔" افسوس سے نچ کیا۔

"ڈگنیفائیڈ۔" تالیہ نے دبی دبی برہمی سے ابرو اٹھائے۔

"گستاخی معاف وزیراعظم صاحبہ مگر اس ڈگنیفائیڈ مقابلے کا کولیٹرل ڈیمج ان کی سات سال کی معصوم بچی بن گئی تھی۔ کبھی فرصت سے سوچیے گا۔ وہ اگر آپ کو اس کا قصوروار پبلک میں ٹھہرانے لگیں تو کچھ غلط نہیں کریں گے۔" جو اسے اشعر اور فاتح کا ارادہ لگ رہا تھا وہ بے دھیانی میں بول بھی گئی تو صوفیہ رحمٰن چونکی۔ تیزی سے تالاب کے پار دیکھا جہاں فاتح اور اشعر مسکرا کے لوگوں سے بات چیت میں مگن تھے۔

"تو اس لیے وہ اس پارٹی میں آیا ہے؟ تاکہ بھری محفل میں مجھے اپنی بیٹی کا مجرم کہہ سکے۔ میں بھی کہوں اس نے یہ دعوت کیوں قبول کی؟ نا ڈ آئی گیٹ اٹ؟"

تالیہ نے کچھ کہنا چاہا تو صوفیہ نے رعب سے ایک ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"بے تالیہ......" وہ اب سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اسے جو کہنا ہے، میں اسے کہنے دوں گی۔ اچھا ہے وہ اتنے سالوں کی بھڑاس نکال لے، مگر جب آریانہ کے کھونے کے بعد میں اس کے گھر افسوس کے لیے آئی تھی تو اس نے مجھ سے بڑی خفگی سے باہر نکل جانے کو کہا تھا کیونکہ وہ مجھ سے کوئی سخت بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میں نے اس وقت بھی اسے کہا تھا کہ فاتح جو دل میں ہے کہہ دو تاکہ میں وضاحت دے سکوں مگر وہ اتنے گرم دماغ کا ہے کہ توجیہات نہیں سن سکتا تو آج تم اس کو میرا ایک پیغام دے دینا۔"

کچھ تھا اس برف کی ملکہ کے لہجے میں جو تالیہ مراد کی ہڈیوں کا خون منجمد کر رہا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکے صوفیہ کو بولتے دیکھ رہی تھی۔

"اسے کہنا کہ صوفیہ رحمٰن کے حکومت کرنے کے اصول تم سے مختلف ہیں۔ میرے ایتھکس بھی مختلف ہیں۔ اس کی نظر میں، میں کرپٹ ہوں تو ٹھیک ہوں۔ مگر میں جو کرپشن کرتی ہوں، ڈنکے کی چوٹ پہ کرتی ہوں۔ میں اس بے وقوف اور ناشکری عوام کو جتنی سہولیات دے رہی ہوں، وہ ان کے لیے بہت ہیں۔ جو کچھ میں اس کے علاوہ کروں اس کے لیے میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوں۔ مگر میں تین بیٹیوں کی ماں ہوں۔ میرا دل اتنا سیاہ نہیں ہے کہ میں کسی کی بچی کو نقصان پہنچاؤں۔ اگر مجھے آریانہ کے ذریعے ہرٹ کرنا ہوتا تو میرے ایک اشارے پہ میری کمپین ٹیم لوگوں کو بتا دیتی کہ آریانہ اس کی بیٹی ہی نہیں ہے مگر میں نے کبھی اس پہ آریانہ کے حوالے سے کیچڑ نہیں اچھالا کیونکہ میں ایک ماں بھی ہوں اور ایک خاندانی عورت بھی۔ اور اس کو یہ بھی کہہ دینا کہ آج اگر اس نے پبلک میں مجھے قاتل یا اغوا کار کہا تو وہ اس حد کو عبور کرے گا جو ہمارے "مقابلے" کو مہذب رکھے ہوئے ہے۔ اس کے بعد میں آریانہ کی ولدیت کو اس کے خلاف جس طرح بھی استعمال کروں، نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔"

چبا چبا کے بولتی وہ ماتھے پہ بل لیے آگے بڑھ گئی اور تالیہ مراد سن سی وہاں کھڑی رہ گئی۔ گلاس اس کے ہاتھ میں گویا پتھر کا بن گیا۔

اس نے ایک عمر اتنے جھوٹ بولے تھے کہ اسے سچ اور جھوٹ کی تفریق آ گئی تھی اور ایک بات وہ جانتی تھی۔

یہ عورت جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ آریانہ کو صوفیہ نے نہیں پھروایا تھا۔ تو پھر کس نے؟

اور اگر فاتح اس پہ الزام لگا دے اور بعد میں وہ غلط ثابت ہو جائے تو؟ یا اللہ!

وہ تیزی سے تالاب کے اوپر بنے پل کی طرف لپکی۔

اسے فاتح بن رامزل کو اپنے پیروں پہ کلہاڑا

بارنے سے وہ کتراتا تھا۔ اسے فاتح کو غلط فیصلے سے بچانا تھا۔

اسی لیے اس نے یہ جواب حسان سے بچپن کے حاصل کی تھی تاکہ وہ فاتح کو وہ سب یاد کروا سکے جو ان دونوں نے قدیم ملاکہ میں سیکھا تھا اور جو وہ بھول چکا ہے۔ اس میں سے ایک تھے فاتح کا اپنی بیوی اور اس کے بھائی کے تسلط سے آزاد ہونا تھا۔

تالاب کے پل پہ ایک دم مہمانوں کا جمگھٹا بڑھ گیا تھا۔ بہت سے لوگ دوسری طرف جانا چاہ رہے تھے جہاں فاتح مطمئن سا کھڑا اور رپورٹرز سے بات کر رہا تھا جو اپنے مائیک اس کے چہرے کے سامنے کیے ہوئے تھے۔ ایک غیر رسمی سی پریس بریفنگ کا ماحول بن گیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اشعر اور صمرہ کھڑے تھے۔

"سر! آج آپ کو کافی عرصے بعد وزیراعظم صاحبہ کے ساتھ ایک چھت تلے دیکھا ہے۔" ایک رپورٹر تیزی سے پوچھ رہا تھا۔ فاتح نے مسکرا کے اوپر آسمان کو دیکھا۔ اور پھر واپس رپورٹر کو۔ "چھت؟ سیریسلی؟"

ہجوم میں قہقہہ سنائی دیا تھا۔

"مگر ایک ہی لان کے اوپر دیکھا جا رہا ہے آپ دونوں کو۔ کیا آپ کے درمیان مفاہمت کی کوئی امید ہے؟"

لوگ سست روی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ کسی کو دھکا نہیں دے سکتی تھی۔ بس تیزی سے ایکسکیوز می ایکسکیوز می کہتی راستہ بنا رہی تھی۔ کوئی اسے آگے نہیں جانے دے رہا تھا۔

ایسے لگتا تھا سارے راستے بند ہو گئے ہوں۔

ایسے لگتا تھا وہ قدیم ملاکہ میں ہو اور غلام فاتح کی بولی کوئی اور جیت رہا ہو۔ اور وہ بے بسی سے ہاتھوں میں زنجیریں پہنے غلام کو آزاد کرنے کے لیے تڑپ رہی ہو۔۔۔ رش تھا کہ چھٹتا ہی نہیں تھا۔

"مفاہمت؟" فاتح نے سنجیدگی سے ابرو اٹھائی۔ "اس خاتون کے ساتھ مفاہمت جس کی وجہ سے۔۔۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

تالیہ لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتی تیزی سے آگے آئی۔ وہ سامنے ہی ہجوم میں گھرا کھڑا تھا۔ تالیہ نے بے چینی سے اسے دیکھ کے نفی میں اشارہ کیا۔

(پلیز نہیں!) بنا آواز کے لب ہلائے۔ لمحے بھر کو اسے لگا کہ فاتح اس کو دیکھ رہا ہے مگر نہیں۔ کیمروں کی فلیش لائٹس کی چکاچوند نے اسے تالیہ کا منت بھرا چہرہ دیکھنے ہی نہیں دیا تھا۔

"اس خاتون کے ساتھ مفاہمت جس کی وجہ سے میری بیٹی مجھ سے چھن گئی؟ جنہوں نے مجھے اپنے اتحاد میں شامل نہ ہونے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکی سر عام دی تھی؟ مفاہمت میں کچھ لو اور دو ہوتا ہے جناب۔ صوفیہ رحمن مجھے کیا دے سکتی ہیں؟ کیا وہ مجھے میری بیٹی واپس کر سکتی ہیں؟ کیا وہ آریانہ کو لوٹا سکتی ہیں؟" وہ سنجیدگی سے مجمعے کو دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔

ایک دم سارے میں سناٹا ہو گیا۔ دبی دبی سرگوشیاں پہلی دفعہ پکار بنی تھیں۔ اتنے سال بعد پہلی دفعہ وان فاتح نے صوفیہ رحمن کو اپنی بیٹی کا مجرم کہا تھا۔

لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔ تالیہ بھی اپنی جگہ پہ بدحال سی رک گئی۔ پھر مڑ کے تالاب کے پار دیکھا۔ وہاں صوفیہ رحمن عجلت میں محفل چھوڑ کے جا رہی تھی۔ اس کے مصاحب اس کے ساتھ تھے۔ امن وامان کی صورت حال کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اب وہ خاموشی سے وہاں سے چلی جائے۔

"اور چونکہ وہ آریانہ کو نہیں لوٹا سکتیں تو آپ لوگوں کو مفاہمت کی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔" وہ مائیک میں سنجیدگی اور دکھ سے کہتا شخص ایک باپ لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت ضبط کے باوجود تکلیف دکھائی دے رہی تھی۔

کتنے ہی لوگوں نے دل پہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔

اتنے سال جو شخص اپنی بیٹی کے مجرموں کو نامزد کرنے کے بجائے خاموش رہا' آج اس نے خاموشی توڑ دی تھی۔ بہت سی گردنیں مڑیں اور وہاں سے نکلتی صوفیہ رحمن کو گلہ آمیز اور خشمگیں نظروں سے دیکھا گیا۔ ملامت' چبھن اور حقارت بھری نظروں نے وزیراعظم کا دور تک پیچھا کیا تھا۔

صوفیہ نے باہر جاتے ہوئے اپنے چیف آف اسٹاف سے سرگوشی کی۔ "فاتح کا ملازم درست کہہ رہا تھا۔ یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ اس کی کھوج لگاؤ۔ وان فاتح کو گرانے کے لیے یہی لڑکی کافی ہو گی۔"

☆☆☆

واپسی پہ اشعر ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ خاموش سی آگے بیٹھی تھی۔ فاتح اور صمرہ پچھلی سیٹ پہ براجمان تھے اور دونوں مطمئن سے اس پریس بریفنگ کو ڈسکس کر رہے تھے۔

"بالآخر ہم نے اپنی خاموشی کو توڑ دیا اور صوفیہ رحمن کو بے نقاب کر دیا۔ تھینک یو فاتح۔" صمرہ ممنون تھی۔ جیسے ماں کے دل کو ٹھنڈک پہنچی ہو۔

"ہاں۔ کبھی نہ کبھی تو اس سے حساب لینا تھا۔ آج سہی!" وہ بھی بالکل مطمئن تھا۔ یہ کہہ کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کار میں خاموشی چھا گئی۔ تالیہ نے ایک نظر بیک ویو مرر میں دکھائی دیتے میاں بیوی کو دیکھا۔

کتنا بورنگ کپل تھا۔ یہ ان کی فیملی کے لیے ایک بڑا موقع تھا جب وہ اپنی دانست میں اپنی بیٹی کا بدلہ لینے جا رہے تھے مگر اس کے بعد بھی یہ دونوں ایک دوسرے سے کتنے بے نیاز تھے۔

"آج آپ سے وزیراعظم صاحبہ کیا کہہ رہی تھیں' بی تالیہ؟" اشعر نے ڈرائیو کرتے ہوئے محظوظ انداز میں پوچھا۔ تالیہ نے ایک سپاٹ نظر اس پہ ڈالی۔

"وہ مجھ سے کیوں کچھ کہیں گی؟ میں ایک عام سی ورکر ہوں' اشعر صاحب۔ نہ میں آپ کی فیملی ہوں' نہ ہی کوئی سیاستدان۔ میرے جیسی ایک ادنیٰ کارکن سے وزیراعظم صاحبہ کیا بات کریں گی بھلا؟"

وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

"کوئی مسئلہ ہے تاشہ؟" فاتح نے سنجیدگی سے ابرو اکٹھے کیے [illegible] وقت سے بھی [illegible] نہ پائی [illegible] وہ [illegible] کی بات [illegible] کر سکی۔

"مسئلہ یہ ہے سر کہ آپ نے صوفیہ رحمن کو آریانہ کا مجرم [illegible] کہ بہت بڑی غلطی کی ہے کیونکہ آپ کی بیٹی کے ساتھ جو ہوا [illegible] صوفیہ رحمن نے نہیں کیا تھا۔"

اشعر نے تیزی سے گاڑی [illegible] ایک جھٹکے سے روکی۔

"واٹ؟" اشعر تحیر سے [illegible] گیا۔ صمرہ کا [illegible] اور فاتح [illegible] سے اسے [illegible]

"کیا۔ صوفیہ رحمن آریانہ کی قاتل نہیں ہے؟" [illegible] گئے تھے۔

"قاتل؟" کار میں خاموشی چھائی تو صمرہ کی بے یقین آواز سنائی دی۔ اشعر بھی [illegible] رہ گیا۔

"قاتل؟ ہم نے قاتل کہیں کہا؟" صمرہ بے قراری سے آگے ہوئی۔ اس کی بے یقین آنکھیں گلابی پڑنے لگی تھیں۔ تالیہ نے ایک [illegible] نگاہ اس پہ ڈالی۔

"یہ سوال آپ اپنے شوہر سے کیوں نہیں پوچھتیں جو ہر کام آپ کے مشورے سے کرتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی ان سے پوچھا کہ [illegible] جوان کے [illegible] میں ہوتے تھے؟ [illegible] آریانہ کی لاش کے پاس سے [illegible] ملے تھے؟ اگر آپ واقعی ایک فیملی ہیں تو پبلک میں اپنی بچی کا معاملہ اچھالنے کے بجائے پہلے آپ کو اپنے گھر والوں کو بتانا چاہیے تھا فاتح صاحب' کہ آپ [illegible] اور آپ جانتے ہیں کہ اس کی قاتل کون ہے۔ جیسے آپ نے مجھے جنگل میں اس رات بتایا تھا۔" وہ غراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کے سارے جسم میں

آگ سی بھر گئی تھی۔

"اور میں... میں اب آپ کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتی۔ میں ریزائن کر رہی ہوں۔ میں ایک شہزادی ہوں' کسی کی باڈی ووگن نہیں۔ چلے کیوں نہیں جاتے تم سب میری زندگی سے؟ تم مجھ سے زیادہ بڑے جھوٹے اور چور ہو۔"

غصے سے چلاتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں پہنی ہیروں سے مزین انگوٹھیاں نظر آنے لگیں۔ سر پہ ہاتھ رکھا تو وہاں تاج سجا تھا۔ اور نیچے وہ سرخ ریشمی کامدار لباس پہنے تھی...... چند لمحے کے لیے وہ شہزادی تاشہ بن گئی تھی۔

یا شاید...... بننا چاہتی تھی......

"وزیر اعظم صاحبہ آپ سے کیا کہہ رہی تھیں تالیہ؟"

اشعر کی آواز نے کوئی صور سا پھونکا۔ وہ بری طرح چونکی۔

ساری آوازیں دم توڑ گئیں۔ اس نے چونک کے خود کو دیکھا۔ (اوہ شکر۔ میں نے یہ ساری بکواس حقیقت میں نہیں کی۔)

کار میں سکون تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی اپنے اپنے فونز پہ لگے تھے۔ اور اشعر اس سے صوفیہ سے بات چیت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ تالیہ نے گہری سانس لی اور سر جھٹکا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس باربین نیشنل کے مردوں پہ تبصرہ کر رہی تھیں۔ سچ اے بورنگ پریٹی وومن!"

اسٹاپ آگیا تو وہ لاک کھولنے لگی۔ پھر گردن موڑ کے ان دونوں کو دیکھا جن کو خیال ہی خیال میں بہت کچھ سنا دیا تھا۔ جبراً مسکرائی اور ادب سے سلام کر کے باہر نکل گئی۔ (میں شہزادی تاشہ نہیں ہوں جو ان کو کھری کھری سنا دوں۔ میں تالیہ ہوں اور تالیہ ایک تابعدار لڑکی ہے۔)

کار زن سے آگے بڑھ گئی اور تالیہ بیگ کندھے سے لٹکائے بس اسٹاپ کے بینچ کی جانب بڑھ گئی۔

باریک ہیل کی ٹک ٹک اسے کندھے کے پیچھے سے سنائی دی تو اس نے اکتا کے کہا۔ "میرے پیچھے مت آؤ۔ مجھ سے دور رہو۔"

بس اسٹاپ پہ رات پھیلی تھی۔ اسٹریٹ پولز روشن تھے۔ سڑک کنارے چھپر تلے بینچ بنے تھے۔ وہ بینچ کی طرف بڑھ گئی مگر وہ تعاقب کار کے جوتے قریب آتے محسوس کر سکتی تھی۔ یکدم تیورا کے گھومی اور غصے سے اسے دیکھا۔

"کہا نا' مجھ سے دور رہو۔ میں تمہارے جیسا بڑا افورڈ نہیں کر سکتی۔"

سامنے کھڑی لڑکی ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔

اندھیرے فٹ پاتھ پہ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ ایک اسکرٹ بلاؤز اور سادہ جوڑے والی جھنجھلائی ہوئی سی تالیہ تھی' اور سامنے...... پیروں تک آتا سرخ کام دار لباس پہنے، گھنگریالے، سنہرے بال کندھوں پہ ڈالے' سر پہ تاج سجائے' شہزادی تاشہ تھی۔

"تم مجھے خود سے الگ نہیں کر سکتیں' تالیہ۔"

شہزادی کے انداز میں استہزاء تھا۔

"یو نو' مجھے پتا ہے تم یہاں نہیں ہو۔" وہ رکھائی سے کہہ کے بنچ پہ بیٹھی اور جھک کے جوتے اتارنے لگی۔ ہیلز سے پیر درد کرنے لگے تھے۔

"ظاہر ہے میں یہاں نہیں ہوں۔" شہزادی نے کندھے اچکائے۔ "میں تمہارے اندر کی شہزادی ہوں جسے تم ان لوگوں کے سامنے دباتے دباتے تھک گئی ہو۔ تمہارا لاشعور جو تم سے بات کرنا چاہتا ہے اور جسے تم مزید نظر انداز نہیں کر سکتیں۔"

وہ جوتے اتار کے سیدھی ہوئی اور تکان سے شہزادی کو سر سے پیر تک دیکھا۔

"سیریسلی؟ میرا دماغ کتنا امیجنیٹو ہو چلا ہے۔" پھر حسرت بھری سانس خارج کی۔ "تم شہزادی ہو اور میں اب تم نہیں ہوں۔"

"میں صرف شہزادی نہیں تھی۔ میں ملاکہ کی ملکہ

بننے والی تھی جب تم مجھے واپس اس نئے زمانے میں لائی تھیں۔" وہ گھمنڈ سے بولی تو تالیہ نے سر افسوس سے جھٹکا۔

"کسی نے آج میری آفس سیٹ پہ ایک چٹ [illegible] لکھا تھا۔ دی ایول کوئین۔ ملکہ بد۔" اور [illegible] سے جھکا دیا۔

"ملکہ تو تم تب بنتیں جب تم ملاکہ میں رہتیں۔ مگر تم...... تم نے اس خود غرض انسان کی باڈی ووگن بننا پسند کیا۔"

"پلیز...... مائنڈ یو!" تالیہ نے ناراضی سے سر اٹھا کے شہزادی کو دیکھا تھا۔ اس کے اندر کی شہزادی اس کے سامنے برہم برہم سی کھڑی تھی اور وہ اتنی پر تمکنت تھی کہ اس سے پھوٹتی روشنیاں نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ بس اسٹاپ کے بینچ پہ رات کے نیم اندھیرے میں بیٹھی تالیہ کے لیے اس شہزادی سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"تمہیں کیا بات تکلیف دے رہی ہے' تالیہ؟"

شہزادی افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔" باڈی ووگن نے بے چارگی سے کندھے اچکائے۔

"میں ان کے لیے سونے سے بھرے صندوق ہر دور میں لائی۔ حکمران کو ہمیشہ دوسرے لوگ خرید کے لے جاتے ہیں۔"

"تم اس کی بیوی ہو۔ تم ان لوگوں کو اس کی زندگی سے نکال کے کیوں نہیں پھینک دیتیں؟" شہزادی رعب سے گرجی۔

"اوہ پلیز!" اس نے اکتا کے سر جھٹکا۔ "میں کوئی ولن' کوئی ہوم ریکر نہیں ہوں۔ نہ بن سکتی ہوں۔ میں نے ایک عمر یتیم خانوں اور فوسٹر فیملیز کے درمیان کاٹی ہے۔ میں کبھی کسی کے گھر کو نہیں توڑ سکتی۔"

"تالیہ اس مسئلے کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ تمہیں عصرہ کو اس کی زندگی سے نوچ کے نکالنا ہوگا۔ صرف تب تم اس کے لیے اہم بنو گی۔"

"او تو ہاں۔" سادہ باڈی ووگن نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

"میں استعفیٰ دے دوں گی۔ ان کی زندگی سے چلی جاؤں گی۔"

"اف تالیہ۔" شہزادی نے دانت پیستے ہوئے پیر پٹخا۔ "اتنی مشکل سے تم ادھر تک پہنچی ہو۔ یہ سب گنوا دو گی؟"

"میں تھک گئی ہوں اس کے قریب رہتے رہتے۔"

"تم عصرہ سے جیلس ہو رہی ہو۔"

"ہاں میں جیلس ہو رہی ہوں۔ سب ہی ہوتے ہیں۔" بینچ سے ٹیک لگائے' بازو سینے پہ لپیٹے وہ خالی سڑک کو دیکھ کے تلخی سے کہنے لگی۔

"کوئی کسی کی دولت سے' کوئی کسی کے بچوں سے' کوئی کسی کے لائف پارٹنر سے۔ مگر میں کوئی غلط کام نہیں کروں گی۔ میں نے بہت مشکل سے...... بہت بہت مشکل سے سچ بولنا سیکھا ہے۔ میں اب کوئی بددیانتی نہیں کر سکتی۔"

پھر بے بسی سے بند مٹھی سینے پہ رکھی۔

"میرا دل زخمی ہوتا جا رہا ہے۔ ہر گزرتے دن تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اس کے ساتھ کیا وعدہ مزید نہیں نبھا سکتی۔ میں اس کے ساتھ اب نہیں رہوں گی کیوں کہ اس کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھنا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ میں کل استعفیٰ دے دوں گی۔"

"مگر......"

تالیہ نے زور سے ہاتھ جھلایا جیسے ہوا کے ناگوار جھونکے کو دور ہٹایا ہو۔ شہزادی غائب ہو گئی۔ اس کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔

بس آگئی تو اس نے ہاتھوں میں سینڈل اٹھا لیے اور ننگے پیر بس کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے شعور اور لاشعور میں چلتی لڑائی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک طرف جیت چکی تھی اور دوسری طرف اس نے فی الوقت پسپائی اختیار کر لی تھی۔

فی الوقت!

☆☆☆

جدید ملاکہ کے اس بازار میں صبح ہو چکی تھی اور اشیائے طعام کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ سن باؤ کی سرخ حویلی کے سامنے ایک ریستوران کے باہر بچھی میز کے گرد داتن اور ایڈم بیٹھے تھے۔

فجر کے وقت کی بارش کے باعث سڑک ابھی تک گیلی تھی۔ دھوپ ٹھیک سے نکلی ہی نہیں تھی اور صبح ٹھنڈی سی چھایا جیسی تھی۔

ان دونوں کے سامنے بھاپ اڑاتے چائے کے مگ رکھے تھے۔ داتن عینک لگائے نوٹ پیڈ پہ قلم چلا رہی تھی اور ایڈم ٹیک لگا کے سست سا بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔

''دو دن میں آپ نے سن باؤ کی ساری حویلی چھان ماری مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔''

''بھئی کسی نے خزانہ بہت پہلے نکال لیا ہے اور بڑی مہارت سے نکالا ہے۔ اب اس ''کسی'' کا سراغ لگانا ہوگا۔'' داتن ابھی تک پُرعزم تھی۔ ایڈم نے جمائی لی۔

''ہمیں واپس آئے ایک مہینہ ہوا ہے تو خزانہ اس سے پہلے کس نے نکالا ہوگا؟''

''اُف ایڈم۔ تم نے کبھی زندگی میں کچھ پڑھا لکھا نہیں ہے؟ سوائے تمہاری اس بنگارایا ملایو کے جو مجھے یقین ہے تم نے پیسے دے کر کسی سے لکھوائی ہوگی۔'' عینک کے اوپر سے اسے گھورتے ہوئے بولی تو ایڈم نے مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں اور جبراً مسکرایا۔

''جی بالکل.... مجھے کیا معلوم کتابوں کا؟ میں تو غالباً آپ کو ان پڑھ لگتا ہوں نا۔''

''تم اب ان پڑھ بھی نہیں لگتے۔'' فیاضی سے کندھے اچکائے۔

''پھر کیا لگتا ہوں؟''

''زیادہ سے زیادہ آٹھویں فیل!'' اور واپس نوٹ پیڈ پہ جھک گئی۔

ایڈم نے بہت سارا غصہ اندر اتارا اور تحمل سے پوچھا۔

''فہرست مکمل ہوگئی'' ہمارے ''خزانے کی؟''

''اے لڑکے.... اگر اس خزانے کو میں نے ڈھونڈ لیا تو اس میں میرا حصہ بھی ہوگا۔''

''آپ نے ڈھونڈ لیا تو پھر ہمیں تو ویسے ہی کچھ نہیں ملنا۔'' وہ مگ اٹھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ (سو شیاطین مرے ہوں گے تو ان خاتون نے جنم لیا ہوگا۔)

''مجھے پتا ہے تم اس وقت دل ہی دل میں مجھے شیاطین سے تشبیہ دے رہے ہوگے۔'' وہ کاغذ پہ جھکے بڑبڑائی تو ایڈم نے معصوم شکل بنا کے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں صرف شیاطین سے؟'' اور پلکیں جھپکائیں۔ داتن نے سیاہ آنکھیں اٹھا کے اسے گھورا پھر جواب کسی اور وقت کے لیے سنبھال کے نوٹ پیڈ سامنے کیا۔

''یہ دیکھو۔ فہرست مکمل ہے یا کچھ اور رہ گیا ہے؟''

ایڈم نے مگ رکھا اور نوٹ پیڈ اٹھا کے تمام چیزیں گننے لگا۔ اس کا حافظہ بہترین تھا۔ اسے ایک ایک شے یاد تھی۔

''شریفہ کے خطوط رہ گئے۔ میں نے شروع میں اس کا نام لیا تھا شاید آپ نے سنا نہیں۔ کیونکہ آپ اس وقت اپنی تعریفوں میں مصروف تھیں۔'' ساتھ ہی وہ کاغذ پہ آخری شے کا نام لکھنے لگا۔

''شریفہ کون؟''

''شریفہ بنتِ جابر۔ ہماری کنیز تھی محل میں۔'' پھر رکا۔ ''ٹیکنیکلی بے تالیہ اور ان کے ولن باپ کی کنیز تھی میں تو خیر سیلی میں وہاں گیا تھا اور......''

داتن نے زور سے نوٹ پیڈ کھینچا اور بے یقینی سے تحریر پڑھی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ قلم ایڈم کے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔

''ڈونٹ ٹیل می..... شریفہ بنتِ جابر کے خطوط؟'' داتن کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ ''وہ پانچ

...نے لوح کے بانی برس ہوتے تھے)

خطوط جو اس نے لوح کے ... اُف!'' اس نے ماتھے کو چھوا۔

''اُف ایڈم۔ ہاں مگر آپ کو کیسے معلوم؟'' اس کا منہ کھل گیا۔

داتن نے زور سے صفحہ پیڈ سے الگ کیا اور اس کے چار ٹکڑے کیے پھر بے بسی بھرے غصے سے اسے دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے تمہارا خزانہ کہاں گیا ہے۔ اور مجھے کیا سارے ملائیشیا کو معلوم ہے۔''

''ایں؟ کہاں؟''

''اُف ایڈم۔ تم کتابیں نہیں پڑھتے کیا؟'' داتن نے افسوس سے اسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

صبح کی کرنیں کے ایل پہ پھیلیں تو تالیہ کے کمرے کی کھڑکی سے روشنی اندر جھانکنے لگی مگر وہ ست سی لحاف اوڑھے لیٹی رہی۔ اس کا بیگ سائیڈ ٹیبل پہ دھرا تھا جس کے اوپر اس کا تازہ ٹائپ شدہ استعفیٰ رکھا تھا۔ اور چونکہ آج اس نے استعفیٰ جمع کروانے جانا تھا' سو صبح صبح جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آرام سے جائے گی' اور جاب چھوڑ آئے گی۔

فاتح سے ملاقات نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ (ناراضی سے سوچا۔) اتنی محنت اور مغز ماری کیوں کرے اس شخص کے لیے جو اسے کچھ سمجھتا ہی نہیں؟ اس آفس کے لیے جہاں لوگ اسے ایول کوئن سے تشبیہ دیتے ہیں؟ ہونہہ!

فون کی گھنٹی زور سے بجی تو اس نے موبائل اٹھایا۔ امید تھی کہ ایڈم یا داتن ہوں گے۔ جو نہ جانے کس شے کی تلاش میں ملاکہ گئے ہوئے تھے۔ وہ اتنی مصروف تھی کہ ان سے تفصیلی بات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ مگر وہ داتن یا ایڈم کی کال نہیں تھی۔

اشعر کالنگ۔ (یہ آج مجھ سے کچھ سنے گا۔) اس نے دانت پیسے اور فون کان سے لگایا۔

''جی اشعر صاحب؟''

وہ جواب میں برہمی سے شروع ہو گیا۔ ''کیا آپ نے ایمان بنتِ موسیٰ نامی لڑکی کو فائر کیا تھا؟''

''جی مگر تمام قانونی تقاضے پورے کر کے فائر کیا تھا۔ ڈونٹ وری کوئی ہمیں ـــ (سو) نہیں کرے گا۔''

''اور آپ نے اسے کیوں نکالا؟''

''کیونکہ میرے پاس ٹھوس وجوہات تھیں اشعر صاحب۔'' وہ سخت بےزار ہوئی۔

''اور سب سے بڑی وجہ کیا تھی؟''

ایک دم اس کے اندر کل شام سے بھری فرسٹریشن ابل ابل کے باہر چھلکنے لگی۔

''کیونکہ قدیم ملاکہ میں جب شہزادیاں تخت سنبھالتی تھیں تو کسی درباری کی گردن ضرور قلم کرواتی تھیں تا کہ سارے شہر کو معلوم ہو جائے کہ نیا باس کون ہے۔'' چبا چبا کے بولی۔

''تو پھر آپ کے لیے بری خبر یہ ہے بے تالیہ کہ یہ قدیم ملاکہ نہیں ہے۔ جانتی ہیں ان دونوں زمانوں میں کیا فرق ہے؟''

''آپ بتا دیں۔'' وہ بےزاری سے اٹھ بیٹھی تھی۔

''قدیم ملاکہ میں..... '' وہ چبا چبا کے بولا۔ ''ٹوئیٹر نہیں تھا۔''

تالیہ کی ساری تلخی اور کوفت اُڑن چھو ہو گئی۔ ایک جھٹکے سے وہ سیدھی ہوئی۔

''ایمان موسیٰ نے کیا کیا ہے؟ کوئی ٹویٹ؟''

''بات اب ٹویٹ سے آگے نکل چکی ہے۔ آفس آئیں۔ ہم اس وقت آپ کی وجہ سے کرائسز میں ہیں کیونکہ یہ قدیم ملاکہ نہیں ہے جہاں گردن اڑانے پہ درباری چپ چاپ مر جاتے تھے۔ یہاں لوگ ٹویٹ کر دیتے ہیں۔''

کال منقطع ہوئی تو تالیہ نے بے چینی سے موبائل نیچے کیا اور ٹوئیٹر کھولا۔

ایمان موسیٰ کی ٹویٹ سامنے تھی۔

اور وہ ٹویٹ..... وہ لرزہ خیز تھی۔

یا اللہ..... وہ لحاف پھینکتی تیزی سے بستر سے اتری۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

غزالہ جلیل راؤ

کون روٹھا

فروا گہری سوچوں میں گم سر جھکائے میز کی سطح ناخنوں سے کھرچ رہی تھی۔ وہ بہت الجھی الجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ ثانیہ نے اسے پریشان دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''کمال کہاں ہے۔ آج کل آفس نہیں آ رہا، خیریت تو ہے؟''

''مجھے خبر نہیں۔'' اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

''تمہیں خبر ہونی چاہیے۔'' ثانیہ نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے گہرے لہجے میں کہا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا تو بتا دیتی۔''

''حیرت ہے تمہیں معلوم نہیں فروا۔'' ارسلان جو ان کے قریب بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا۔ ان کی باتیں سن کر رہ نہ سکا۔ اس نے معنی خیز لہجے میں اسے کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' فروا نے ذرا تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔

''کافی دن نہیں ہو گئے کمال کو آفس سے غیر حاضر ہوئے۔''

''ہاں دو ہفتے ہو گئے کہہ کر گیا تھا کل آ جاؤں گا پھر لوٹا ہی نہیں۔''

''ویسے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا نمبر لگاؤ اور معلوم کر لو وہ کہاں ہے۔ آخر آفس کیوں نہیں آ رہا۔'' ارسلان نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''ایک بار نہیں کئی بار کال کی لیکن نمبر آف ...''

اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''کب سے نمبر آف ہے؟'' ثانیہ نے پوچھا۔

''دو ہفتے سے۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تشویش کی بات ہے۔'' ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔

''او مائی گاڈ! تو اب کیا ہو گا۔'' ثانیہ نے پوچھا۔

''اس کے گھر جا کے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے پھر تو ...'' ارسلان نے ایک بار پھر مشورہ دیا۔

''لیکن میں تمہیں ہرگز یہ مشورہ نہیں دوں گی فروا کہ تم اس کے گھر جاؤ۔'' ثانیہ نے اسے مشورہ دیا۔ وہ بہت اداس تھی۔ وہ بدگمان ہو گئی تھی اس کی طرف سے۔

''ہو سکتا ہے وہ تم سے مذاق کر رہا ہو۔'' ثانیہ نے ایک بار پھر کسی خیال کے تحت کہا۔

''اگر مذاق ہے تو ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے اسے۔'' ارسلان نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

''ہو سکتا ہے، کوئی وجہ ہو؟'' ثانیہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''کم از کم اطلاع تو کر سکتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے۔'' ارسلان نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

''یہ بتا سکتی ہو — وہ تم سے کیا کہہ کر گیا تھا فروا ...؟'' ارسلان اب سنجیدگی سے اس مسئلے کو ہینڈل کر رہا تھا۔

''وہ اپنے گھر والوں سے رشتے کی بات کرنے گیا تھا۔ اگلے دن لوٹ آنے کا کہہ کر۔'' اس نے

وں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے تمہاری ساری پریشانیاں دور ہو ...ں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ...س نے دو ہفتے سے ایک بار رابطہ نہیں کیا بلکہ نمبر ہی آف کر دیا۔'' ثانیہ نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''ہاں — میں بھی ثانیہ کی بات سے متفق ہوں۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔'' ارسلان نے فروا کے اترے چہرے کو دیکھا۔

''اللہ کرے کچھ ایسا نہ ہو جو ہم سوچ رہے

[illegible]

☆☆☆

گھر آ کر [illegible] تو [illegible] تھک گئی۔ سو کر اٹھی تو اس نے کمال کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی اور تیسری بیل پر کال ریسیو کرلی گئی۔

دوسری جانب نسوانی آواز ابھری تو اس نے پوچھا۔

"کون......؟"

"میں مسز کمال بول رہی ہوں۔"

اسے لگا وہ بہت بلند عمارت سے گر گئی ہو۔

اس نے کمال کی محبت کا ہاتھ تھام کر صدیوں کا سفر طے کیا تھا۔ وہ شب و روز کی قید سے آزاد ہو کر اس کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس کٹھن وقت میں وہ بہت تنہا ہو گئی تھی۔ وہ کسی سے بھی تو اپنے دل کی کیفیت بیان نہیں کر سکتی تھی۔

"کیوں دھوکا دیا تم نے کمال...... آخر کیوں۔ کیا تم سوچتے تھے مجھے پتا نہیں چلے گا۔ بے خبر رہوں گی۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن انہیں اس نے بے دردی سے پونچھ ڈالا۔ وہ رو کر خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک طویل خاموشی اس کے اندر پروان چڑھنے لگی۔ اس خاموشی کو امی نے توڑا۔

"[illegible] تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے تم ابھی [illegible] خاموش بیٹھی ہو۔"

"جی ٹھیک ہوں امی۔ بس یوں ہی [illegible]"

[illegible]

"کچھ رشتے آ رہے ہیں تمہارے لیے...... میں ان کو گھر بلانا چاہ رہی تھی۔ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتا دو...... میں ان ماؤں میں سے نہیں جو بچوں پر اپنی مرضی ٹھونستی ہیں اور ان کے ارمانوں کا خون کر دیتی ہیں۔"

اس نے لبوں کو بھینچتے ہوئے خاموش نگاہوں سے ماں کے چہرے کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر اس کی خوشیاں دیکھنے کی آرزو تھی۔ اس کے اندر ایک دم سناٹا اتر آیا۔ وہ کیا بتاتی ان کو۔ جس کا وہ بتانا چاہتی تھی وہ تو دھوکے باز نکلا تھا۔ اس پل اس کی آنکھوں میں نمکین پانی ابھرا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے وہ نرم گرم پانی اپنے اندر اتار لیا۔

"امی! فی الحال میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ جب کرنی ہوگی تو آپ کو بتا دوں گی۔" اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتیں وہ اٹھ کر اندر چلی آئی اور وہ اس کی پشت دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

چھ ماہ ہوئے تھے اسے جاب کرتے ہوئے جب کمال کی اپائنٹمنٹ اس کے آفس میں ہوئی۔

[illegible]

کمال بھی [illegible] نظر میں ہی اس کے حسن کا [illegible]

[illegible]

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی زندگی میں کوئی کمال سے زیادہ بھی اسے چاہ سکتا ہے۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو، اتنی اچھی کہ میری سوچ سے بڑھ کر۔" کمال کے لہجے میں بے پناہ [illegible]

اس [illegible] زندگی کے سب دروازے کھلے تھے [illegible] خواب لگتا تھا [illegible] دروازے ایک ایک کر کے بند ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے نرم گرم پانی بہہ رہا تھا۔ کمال کا چہرہ آنسوؤں کے [illegible] دھندلا رہا تھا اور وہ اس پانی میں ڈبکیاں کھاتی ہوئی [illegible] کے کنارے تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

اس کے خواب تعبیر پانے سے پہلے ہی [illegible] گئے تھے اور اس کی خوشیوں کے دن طلوع ہونے سے پہلے ہی رات کی سیاہی اپنے اندر نگل گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کمال کے ساتھ ہی زندگی ختم ہو گئی ہے۔

☆☆☆

وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو کر نکلی تو امی نے اسے نڈھال دیکھ کر تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آج آفس سے چھٹی کر لو اور میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس

[illegible]

"آپ ساتھ چل رہی ہیں کہ اکیلی [illegible]"

"[illegible] تیار ہوں [illegible] چلو۔" [illegible]

اس کا جسم [illegible] کی طرح تپ رہا تھا اور بدن میں شدید درد تھا۔ لیکن وہ ہمت کر کے نکل آئی۔ اس [illegible] اذیت [illegible] کی جا رہی تھی۔ وہ آج ہر حال میں فیصلہ کرنا چاہتی تھی آر یا پار۔ وہ لاہور سے دور ایک قصبے میں رہتا تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں دو سے ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ جب وہ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔ ایک حسین، تیکھے نین نقش کی لڑکی نے دروازہ کھولا۔

"آپ کون......؟"

بے ساختہ اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

"مسز کمال......" اس کے لبوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔

[illegible] سراپا، قلمی پلکیں، شنگرفی ہونٹ...... فروا کو اسے دیکھ کر رقابت کا احساس ہوا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو......؟" اس نے شہد آگیں لہجے میں کہا۔

"کمال سے......؟"

"کمال ہے۔۔۔؟ مگر کیوں؟ میرا مطلب ہے آپ اس کی کولیگ ہیں یا دوست؟" اس کی آواز میں ایک للکار تھی۔

"دوست یا کولیگ، کچھ بھی سمجھ لو۔ مگر آپ کون؟" اس نے دوبارہ تصدیق کے خیال سے پوچھا۔

"آپ کو بتایا تو ہے مسز کمال ہوں۔" وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اب شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

"کمال تیار ہو رہے ہیں۔ آپ اندر آ جاؤ۔" اس نے سامنے سے ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اس کے کہنے پر مرے مرے قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کا دل تو چاہا تھا کہ وہ واپس چلی جائے کمال سے ملے بغیر۔ لیکن وہ اس سے مل کر اسے شرمندہ کرنا چاہتی تھی کہ کمال نے اس کے ساتھ اچھا نہیں۔ وہ اس کی بیوی کو بتانا چاہتی تھی اس کا شوہر دھوکے باز ہے۔ وہ بیوی کے ہوتے ہوئے اس سے عشق بگھارتا رہا ہے اور اس سے شادی کا وعدہ کر کے گھر والوں سے بات کرنے کا کہہ کر آیا تھا۔

"اندر بیٹھیے۔ میں کمال کو بلاتی ہوں۔"

وہ فروا کو لیے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی اور خود دروازے سے پلٹ گئی۔ فروا اندر جانے کے بجائے وہیں کھڑی ہو کر گھر کا جائزہ لینے لگی۔ چھوٹا سا صاف ستھرا خوب صورت گھر تھا۔ ہر شے سے سلیقہ ظاہر ہو رہا تھا۔

"کمال! آپ کے آفس سے کوئی لڑکی آئی ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آئی ہوں۔ اس سے مل لیں۔"

"میرے آفس سے؟ کیا نام ہے اس کا؟" اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"فروا۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ پھر بولا۔

"بیگم جانی! اسے فوراً چلتا کرو۔ یہ وہی لڑکی ہے جو میرے پیچھے پڑی ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ میں اسے بتا بھی چکا ہوں کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی بے حد اچھی، نیک شریف، پاک باز عورت ہے۔ مگر پھر بھی میرے پیچھے لگی ہے۔ اس کی وجہ سے تو میں نوکری چھوڑ کر آیا ہوں اور اب یہ یہاں بھی پہنچ گئی۔ بہت ہی گھٹیا عورت ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ تمہاری ماں بھی شادی شدہ مرد سے میری شادی نہیں کرے گی تو کہتی ہے میں کورٹ میرج کروں گی۔ اس کی وجہ سے تو میں بے روزگار ہوں اور اب یہ پھر میرے پیچھے آ گئی ہے۔"

"...وہ ...سے تو ایسی نہیں لگتی۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"اس کی معصوم صورت پر مت جاؤ۔ بہت چالباز عورت ہے۔ اسے بٹھا کر کیوں اپنے گھر میں آگ لگانا چاہتی ہو۔ جاؤ اس سے کہو کہ کمال گھر پر نہیں ہے۔ اگر نہ جائے تو دھکے دے کر نکال دو۔"

اپنے بارے میں اس کے خیالات جان کر اس سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"کمال! انتہائی گھٹیا شخص نکلے۔ تم جتنا تمہارا ظاہر اچھا ہے اندر سے تم اتنے ہی بدصورت ہو۔ سیاہ دل کے مالک۔ دھوکے باز فریبی، مکار، اپنی نیک شریف، پاک باز بیوی کو بھی دھوکا دیتے رہے ہو۔ بے ایمان کمینے انسان۔"

اس نے فروا کے لیے کتنے غلط اور گھٹیا الفاظ استعمال کیے تھے۔ کمال کے لیے اس کے دل میں ایک دم ہی نفرت کی لہریں ابھری تھیں۔ وہ واپس لوٹتے ہوئے باہر نکل آئی۔ اب اس سے ملنے یا کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اب اس سے مل کر خود کو مزید ذلیل کرنا تھا۔

مرد کو سمجھنا اتنا ہی پیچیدہ عمل ہے جتنا گول روٹی بنانا مشکل ہوتا ہے۔ گول روٹی بنانے کی کوشش میں کبھی کبھی ساری زندگی گزر جاتی ہے۔ اسی طرح مرد کو سمجھنے میں زندگی بیت جاتی ہے۔ لیکن وہ سمجھ میں نہیں آتا۔

☆

تیرے میرے درمیاں فاصلہ عجیب تھا
دکھ بھری مسافتیں، آبلہ نصیب تھا

باعث جنوں کہیں یا کہیں وصال یار
اس ذرا سی بات پہ جو جل اٹھا رقیب تھا

خواہشوں کا کھیل تھا صبر آزما بہت
کب مجھے نصیب تھا جو رہا قریب تھا

تو رہے گی اب کہاں زندگی کبھی بتا
بے رفیق لامکاں جو ترا صبیب تھا

وہ گمان یقین سا اور خیال یار بھی
لڑکھڑا کے چل پڑے بام تھا قریب تھا

زندگی کی ہر خوشی حسن یار کے طفیل
دل شکن تھی جستجو، وہ مرا حبیب تھا

منصفی، عدالتیں، عدل کا نشاں نہیں
قاتلوں کا سرغنہ خود بنا حبیب تھا

زبیر فیصل عباسی

سلگتی شام دسمبر ہے

برگ ناتواں سوکھی ٹہنیاں
ایندھن بنیں آتش دان میں
اور کاغذ کے کچھ پرزے بھی ایندھن میں
کبھی وحشت کے ہاتھوں خود کو جلاتا ہوں
مگر رسوائی کی ہر آنچ سے
سب کو بچاتا ہوں
آتش دان تو ہر گھر ہے
شعلے، انگارے، دھواں
سلگتی شام دسمبر ہے
دسمبر کی تمام سختیوں کے باوجود
دل اب بھی تونگر ہے

ظریف احسن

WOMEN SKILLS GROUP

تو کیا یہ دل سے محبت کا اعتراف نہیں
کسی بھی بات پہ اب تجھ سے اختلاف نہیں

خدا خبر کہ یہ دُنیا ہمیں کہاں رکھے
ہمارے دل میں محبت بھی واشگاف نہیں

حروفِ خیر کی خاطر لڑے ہوئے دُشمن
ہمارا قتل قبیلے کو بھی معاف نہیں

ہمیں خبر تھی بچھڑنا ہے ایک دن آخر
سو تیرا چھوڑنا ایسا بھی انکشاف نہیں

میں کم نصیب خسارے کی زد میں آیا ہوں
وگرنہ تیری محبت سے انحراف نہیں

دیے جلانے کی کوشش گناہ ہے میثم
کوئی نہیں ہے یہاں جو مرے خلاف نہیں

میثم علی آغا

فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیشِ ملال سے بھی گئے

جو بت کدے میں رہے وہ صاحبانِ کشف و کمال
حرم میں آئے تو کشف و کمال سے بھی گئے

اسی نگاہ کی نرمی سے ڈگمگائے قدم
اسی نگاہ کے تیور سنبھال سے بھی گئے

غمِ حیات و غمِ دوست کی کشاکش میں
ہم ایسے لوگ تو رنج و ملال سے بھی گئے

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن ، نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خط و خال سے بھی گئے

عزیز حامد مدنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں، پھر توبہ کرو تو پھر بھی اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔" (ابن ماجہ [illegible])

فوائد و مسائل۔
یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کر لے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جا سکے تو جب بھی احساس ہو توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں، وہ معاف نہیں ہوں گے، البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

کہیں [illegible] مل گیا،

"اگر دل انسان کے اندر اللہ کے سوا ہر شے سے نفرت محسوس ہو رہی ہو تو [illegible] کا قرب مل گیا!"

بدعت کی تاریکی،

حضرت خواجہ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔
"جو کتاب و سنت کی روشنی میں علم نہیں [illegible] بدعت کی تاریکی یا شبہات کے غار میں گر جائے [illegible]"

ماریہ نذیر۔ سرگودھا

ماں کی دُعا،

ایک بے حد غریب گھرانے کے کچے صحن کے ایک کونے میں غریب ماں گھر میں آنے والے مہمانوں کے لیے بمشکل کھانے کا انتظام کر کے چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ صحرائی علاقے کی گرمی اور موسم کی شدت کو برداشت کرتی ماں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ انتہائی بنیادی ضروریات زندگی بھی میسر نہیں تھیں۔ گیس اور بجلی کا تو تصور بھی محال تھا۔ کچے صحن کے ایک طرف ایک شرارتی بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول تھا۔ لکڑیاں توڑ کر سوکھے چولہے میں ڈالتے ہوئے ماں گاہے بگاہے بچوں کی طرف نظر دوڑا لیتی تھی۔

اردگرد سے بے خبر اپنے بچپن کے مزے لینے والے بچوں کو دیکھ کر ماں آگ اور دھوئیں کی تکلیف بھول جاتی۔ اچانک تھر بھرے بدن والے ایک شرارتی بچے نے کھیلتے کھیلتے لکڑیوں والے چولہے پر پکے تیار شدہ ہانڈی میں پھرتی سے آ کر ایک مٹھی مٹی ڈالی اور یہ جا وہ جا۔
اب اس غریب ماں۔ تھکی ہوئی ماں۔ دل شکستہ ماں کے افسوس کا اظہار کرنا مشکل نہیں۔
لیکن نیک فطرت ماں نے جب بچے کی اس حرکت کو دیکھا تو بے اختیار کہا۔
"بیٹے کیا کر دیا تو نے ..... تجھے اللہ حرم شریف کا امام بنائے ....."
سخت پریشانی میں بھی اس ماں نے اپنی زبان کی حفاظت کی تھی۔ آج وہ شرارتی بچہ حرمین شریفین کا امام بنا کھڑا تھا۔
امام الحرمین الشیخ عبدالرحمٰن السدیس [illegible] سنانے کے بعد انگلینڈ کے [illegible] ہو رہے تھے۔ وہاں موجود ہر شخص [illegible] ہو چکا تھا۔
[illegible] تیرے حضرت کو سلام۔

فریال۔ پاکستان

صحیح لوگ،

اختلافات کا سر پر تھا۔ جھوٹے کے [illegible] بگڑ جانے کے بعد [illegible] سے اچھا۔

WOMEN SKILLS GROUP

"آپ میں سے کس کس نے اس کتاب کا نواں باب پڑھا ہوا ہے؟"
پوری کلاس نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ یہ دیکھ کر استاد نے کہا۔
"میرے مخاطب بالکل صحیح لوگ ہیں۔ کیونکہ اس کتاب میں کل آٹھ باب ہیں۔"
نمرہ اقرا۔ کراچی

جواب،

نپولین سے کسی نے پوچھا۔
"دُنیا کا سب سے بڑا جرنیل کون ہے؟"

نپولین کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "جولیس سیزر دوسرا بڑا جرنیل تھا۔"

اقصیٰ ناصر۔ گلستان جوہر

نمک پارے،

- آج کے انسان کی دو بڑی خواہشات ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کے پاس اپنا ذاتی مکان ہو۔ دوسری خواہش یہ ہے کہ اس کے پاس ایک گاڑی ہو جس میں بیٹھ کر وہ اپنے گھر سے فرار ہو سکے۔
- سویڈن کے ایک کارخانے میں نوٹس بورڈ پر لکھا تھا۔
"جو خواتین میکسی ٹائپ اسکرٹ پہنتی ہیں، وہ مشینوں کے قریب آنے سے بچیں۔"
نیچے کسی نے اپنے قلم سے اضافہ کر دیا۔
"اور جو خواتین منی اسکرٹ استعمال کرتی ہیں، وہ کارخانے میں کام کرنے والوں سے بچیں۔"
- ہالی وڈ کی سب سے مشکل مثلث جو ابھی تک حل نہیں ہو سکی، وہ یہ ہے کہ وہاں کی ایکٹریس لباس، کار اور شوہر میں سے کون سی چیز سب سے پہلے تبدیل کرتی ہیں۔
- برنارڈ شا نے ایک مرتبہ فیشن پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا تھا۔
"فیشن وہ تنہا چیز ہے جسے دیوانے رواج دیتے ہیں، عقل منداس کی پیروی کرتے ہیں۔"
صدف عمران۔ کے ڈی اے

منظور ہے،

پل پار کرنے والی موٹر گاڑیوں سے ٹول ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ جب ایک پرانی سی موٹر کار جس کا انجر پنجر ڈھیلا ہو رہا تھا، پل کے قریب آکر رکی تو چوکیدار نے ٹول ٹیکس کی شرح بتاتے ہوئے آواز لگائی۔
"تین روپے۔"
یہ سنتے ہی موٹر کار کے کوچا نچے سے ڈرائیور نے باہر چھلانگ لگا دی اور چوکیدار سے بولا۔
"مجھے منظور ہے۔ نکالو تین روپے اور سنبھالو یہ آ رہی ہے۔ میں اسی میں سوار ہو جاؤں گا۔"

خیال میرا خوشبو سا،

- اگر ہر رات مجھے آٹھ گھنٹے کی نیند نہیں ملتی تو دنیا کی خاکروب کی مانند سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔
(نیوٹن)
- اکثر کامیاب لوگوں کو شادی میں کامیابی نہیں ملتی۔
(بال گیٹی)
- دُنیا کے تمام اسرار پر ہم جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں، وہ اتنے ہی اور زیادہ پُراسرار بنتے جاتے ہیں اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اور تمام نظام عالم کے اوپر ایک ازلی و ابدی قوت موجود ہے جس کی تمام چیزوں پر حکومت ہے۔
(فیثا غورث)
- عورت کے لیے قدرت کا پہلا تحفہ حُسن ہوتا ہے اور قدرت اُس سے یہی تحفہ سب سے پہلے چھین لیتی ہے۔
(میرلے)
- وہ تو اچھا ہوا بلی کے پر نہیں ورنہ اس دُنیا میں چڑیوں کی نسل مٹ جاتی۔
(شیخ سعدی)
- پہلے قہقہے سے آخری مسکراہٹ بہتر ہے۔
(برطانوی کہاوت)

- دوسروں کی خوشی اپنے غموں کو تازہ کرتی ہے اور دوسروں کا غم اپنے غموں کو ہلکا کرتا ہے۔
(فرینکلن)
- کامیابی کے دو زینے "لگن" اور "خود اعتمادی" ہیں۔
(ٹالسٹائی)

ارم کمال۔ فیصل آباد

اقوال زریں،

- ہم درپیش اہم مسائل کا حل سوچ کی اسی سطح پر رہ کر نہیں کر سکتے جس پر ہم اس وقت تھے جب ہم نے اپنے ان مسائل کو پیدا کیا تھا۔
(البرٹ آئن اسٹائن)
- ہر سال ایک نیا ہنر ضرور سیکھو۔
(رولف کر)
- انجام کو ذہن میں رکھ کر کام شروع کریں۔
(سٹیفن آر کووے)
- کوئی شخص بھی کسی کو تبدیل ہونے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ہم سب کے اندر تبدیلی کا ایک دروازہ ہوتا ہے جسے صرف اندر کی جانب سے ہی کھولا جا سکتا ہے۔ کسی دلیل یا جذباتی فیصلے سے کسی اور کا دروازہ نہیں کھولا جا سکتے۔
(مارلین فرگوسن)
- ہمارے لیے ناممکن ہے کہ ہم قانون کو توڑ سکیں۔ ہم قانون کے مقابل صرف اپنے آپ کو توڑ سکتے ہیں۔
(سیسل بی ڈی میلی)
- برائی کے پتوں کو ہزار مرتبہ کاٹنے سے بہتر ہے کہ اس کی جڑ پر ایک بھرپور وار کیا جائے۔
(تھورلو)
- کوئی آپ کو آپ کی اجازت کے بغیر تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔
(ایلینٹ روز ویلٹ)

انیلا طالب۔ گوجرانوالہ

سمجھ دار،

ایک استانی نے اپنے شوہر کا موبائل چیک کیا۔ اسے تین نام بہت مشکوک لگے۔
1- میری جنت۔
2- نصیبوں والی۔
3- جانِ من۔
ظاہر ہے یہ دیکھ کر اس کا پارہ ساتویں آسمان پر چلا گیا۔ اس نے فوراً پہلا نمبر (میری جنت) ملایا تو دوسری جانب سے اس کی اپنی امی یعنی شوہر کی ساس نے جواب دیا۔
پھر اس نے دوسرا نمبر (نصیبوں والی) ملایا تو دوسری جانب سے اس کی چھوٹی آٹھ سالہ بہن نے جواب دیا۔
جب اس نے حیرت سے تیسرا نمبر (جانِ من) ملایا تو اس کا اپنا فون بج اٹھا۔
بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے خود پر انتہائی افسوس ہوا کہ اس نے کیوں اپنے معصوم شوہر کے کردار پر شک کیا! اسی پچھتاوے کو کم کرنے کے لیے اس نے اپنے پیارے شوہر کو ایک ماہ کی اپنی تنخواہ تحفے میں دے دی۔
شوہر نے اسی پیسے سے اپنی گرل فرینڈ کے لیے تحفہ خریدا جس کا نمبر اپنے موبائل میں اصغر الیکٹریشن کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

چند سُنہری باتیں،

- خطرہ مول لو، یا موقع گنوا دو۔
(آئن سٹائن)
- نیچے گرنا ایک حادثہ ہے مگر نیچے رہنا ایک مرضی ہے۔
(رابرٹ ریڈ فارڈ)
- وہ کرو جو صحیح ہے نہ کہ وہ جو آسان ہے۔
(مارٹن لوتھر کنگ)
- اگر تم وہ کرتے ہو جو ہمیشہ سے کرتے آ رہے ہو تو تمہیں وہی ملے گا جو ہمیشہ سے ملتا آ رہا ہے۔
(ٹونی رابنز)

مہ رُخ چوہدری۔ شیخوپورہ

WOMEN SKILLS GROUP

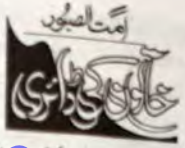

خواتین کی ڈائری

امتہ الصبوح

سرآئینہ میرا عکس ہے، پس آئینہ کوئی اور ہے

ہدیٰ نور کی ڈائری سے

بشیر بدر کی یہ غزل میری ڈائری میں کچھ دن پہلے ہی شامل ہوئی ہے۔ یہ غزل پڑھنے کا طور بتا رہی ہے کہ جو نہیں ملتا اور چلا جاتا ہے اس کے پیچھے اُداس ہو کر کیا حاصل۔ جو گزر گیا وہ لوٹتا نہیں۔ یہ غزل دیگر بہنوں کے لیے حاضر ہے۔

ہر وقت رنج و ملال کیا جو گزر گیا سو گزر گیا
اُسے یاد کر کے نہ دل دُکھا جو گزر گیا سو گزر گیا

نہ گلا کیا نہ خفا ہوئے یونہی راستے میں جُدا ہوئے
نہ تو بے وفا نہ میں بے وفا جو گزر گیا سو گزر گیا

وہ غزل کی ایک کتاب تھا وہ گلوں میں ایک گلاب تھا
ذرا دیر کا کوئی خواب تھا جو گزر گیا سو گزر گیا

مجھے پت جھڑوں کی کہانیاں نہ سُنا سُنا کر اُداس کر
تو خزاں کا پھول ہے مسکرا جو گزر گیا سو گزر گیا

تجھے اعتبار و یقیں نہیں، نہیں دُنیا اتنی بُری نہیں
نہ ملال کر میرے ساتھ آ جو گزر گیا سو گزر گیا

ماشا فاطمہ کی ڈائری سے

سلیم کوثر کی یہ غزل بار بار پڑھی اور کئی سال ڈائری کے اوراق پلٹتے ہوئے اس کے جیسے شعر پر نظر پڑی تو موجودہ عدالتی فیصلوں کے تناظر میں یہ شعر الہامی محسوس ہوا۔ اس لیے اس کا انتخاب کیا ہے۔ اس غزل میں تخلیقی حسن بھی فراوانی کے ساتھ موجود ہے۔

میں خیال ہوں کسی اور کا، مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سرآئینہ میرا عکس ہے، پس آئینہ کوئی اور ہے

تجھے دشمنوں کی خبر نہ تھی، مجھے دوستوں کا پتا نہیں
تری داستاں کوئی اور تھی، مرا واقعہ کوئی اور ہے

وہی منصفوں کی روایتیں، وہی فیصلوں کی عبارتیں
مرا جرم تو کوئی اور تھا، یہ مری سزا کوئی اور ہے

مری روشنی ترے خدوخال سے مختلف تو نہیں مگر
تو قریب آ تجھے دیکھ لوں، تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں، دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

جو مری ریاضت نیم شب کو سلیم صبح نہ مل سکی
تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہاں خدا کوئی اور ہے

حمیدہ خان کی ڈائری سے

رائیگانی انسان کا ازلی دکھ ہے۔ زندگی کی دوڑ میں بھاگتے بھاگتے انسان کو پتا بھی نہیں چلتا اور وہ تنہا رہ جاتا ہے۔ اس غزل میں اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔

دُھوپ میں سایہ بنے تنہا کھڑے ہوتے ہیں
بڑے لوگوں کے خسارے بھی بڑے ہوتے ہیں

ایک ہی وقت میں پیاسے بھی ہیں سیراب بھی ہیں
ہم جو صحراؤں کی مٹی کے گھڑے ہوتے ہیں

یہ جو رہتے ہیں بہت موج میں شب بھر ہم لوگ
صبح ہوتے ہی کنارے پہ پڑے ہوتے ہیں

ہجر دیوار کا آزار تو ہے ہی لیکن
اس کے اوپر بھی کئی کانچ جڑے ہوتے ہیں

آنکھ کھلتے ہی جبیں چُومنے آجاتے ہیں
ہم اگر خواب میں بھی تم سے لڑے ہوتے ہیں

بے ملال ایسے ہیں باغ کی ویرانی کا
جیسے ہم لوگ درختوں سے جھڑے ہوتے ہیں

فوزیہ ثمر بٹ کی ڈائری سے

صحرا صحرا جنگل جنگل
پھرتے ہیں ہم بے کل بے کل

دیکھ کے ساون کی بدلی کو
اکھیاں ہو گئیں جل تھل جل تھل

وہ جو ہم کو بھول گیا ہے
یاد ہمیں آتا ہے پل پل

اس کی چاہت میں سارے کے سارے
مجھ کو بھی پاگل پاگل

شام ہوتے ہی یاد آتی ہیں
اُس کی آنکھیں کاجل کاجل

اب تو اُس جیسا لگتا ہے
ہر اک چہرہ ہر اک آنچل

حنا سلیم اعوان کی ڈائری سے

میری ڈائری میں فرحت پروین شاکر کی یہ خوبصورت غزل آپ سب کی نذر۔

تیری خوشبو کا پتا کرتی ہے
مجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے

ابر برسے تو عنایت اُس کی
شاخ تو صرف دُعا کرتی ہے

ہم نے دیکھی ہے وہ اُجلی ساعت
رات جب شعر کہا کرتی ہے

رات کی تنہائی میں اب تو اکثر
گفتگو تجھ سے رہا کرتی ہے

دل کو اُس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جُدا کرتی ہے

اُس نے دیکھا ہی نہیں ورنہ یہ آنکھ
دل کا احوال کہا کرتی ہے

مصحفِ دل پہ عجب رنگوں میں
ایک تصویر بنا کرتی ہے

زندگی بھر کی یہ تاخیر اپنی
رنج ملنے کا سوا کرتی ہے

مسئلہ جب بھی چراغوں کا اُٹھا
فیصلہ صرف ہوا کرتی ہے

سرورق کی شخصیت
ماڈل ———— ایشا نور
میک اپ ———— روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ———— موسیٰ رضا

WOMEN SKILLS GROUP

نامۂ خواتین

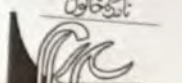

ہمارے نام

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email

طاہرہ یاسمین ------ ٹیکسلا کینٹ

مجھے بچپن سے لکھنے کا جنون تھا مگر میں منظر میں رنگ بھرنے کے ہنر سے نا آشنا تھی اس کے باوجود میں نے کوشش کی اور خواتین اور شعاع نے مجھے معتبر کیا۔ دسمبر کا شمارہ زبردست تھا۔ الف دن بدن زبردست ہوتا جا رہا ہے۔ عمیرہ نی واپ کے کیا کہنے الفاظ کا چناؤ دل میں اتر جاتا ہے۔ سدرہ حیات کا "سب ہی کھوٹ من کے تھے" ایک نئے انداز کی کہانی تھی، یہ بدلاؤ اچھا لگا۔ "رزق زوال" اچھا جا رہا ہے۔

ج: پیاری طاہرہ! دل میں آگے بڑھنے کا شوق اور لگن ہو تو انسان کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ آغاز ہمیشہ چھوٹی چیز سے ہوتا ہے۔ پھر محنت اور کوشش سے ہی انسان آگے بڑھتا ہے خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کومل فاطمہ ------ گاؤں فیصل آباد

لکھنے کا شوق بہت ہے لیکن اس ڈر سے کبھی ہمت نہیں کی کہ کیا پتا کوئی جواب ملے کہ نہیں۔ پہلی کہانی جب لکھی جب ناٹھ میں تھی۔ میری والدہ ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ میں نے بھی ناٹھ کلاس سے پڑھنا شروع کر دیے تھے۔ آج میں انگلش میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں، میری کہانی میں اور میری لکھائی میں ابھی کمزوریاں ہوں گی۔ لیکن میں امید کرتی ہوں کہ آپ میری حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔

ج: پیاری کومل! ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنے ڈر اور خوف پر قابو پایا اور ہمیں کہانی لکھ کر بھجوائی۔ ہم پہلی فرصت میں پڑھیں گے اگر تھوڑی سی بھی گنجائش ہوئی تو شائع بھی کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

ہاجرہ عمران ------ لاہور

سرورق ایک دم سے فریش کر گیا۔ کہنی ختمی نے دل میں اداسی سی بھر دی۔ شاید اس کی وجہ دسمبر سے جڑی اداس یادیں اور بڑے بڑے سانحات ہیں جو ہمارے زخم مندمل ہی نہیں ہو پاتے۔ آپ نے سقوط ڈھاکہ اور اے پی ایس کے سانحے کی بات کی۔ بالکل صحیح اور مثبت پیغام دیا کہ ہم لوگوں کی نااتفاقی اور تعصبات نے ہمیں یہ بھیانک دن دکھائے۔

اس بار کا شمارہ حسب روایت شاندار رہا۔ سب سے پہلے عمیرہ احمد کے الف کا تذکرہ ---- جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا جا رہا ہے، دلچسپی اور تجسس بے پایاں ہوتا جا رہا ہے۔ نمرہ احمد کا حالم مجھے بے حد پسند آ رہا ہے۔ سمیرا حمید کی ---- کچھ تحریریں جس طرح آپ نے کسی ہیرو کی انٹری کے بغیر لکھیں اور اتنی زبردست۔ ام الیقین نے مجھے اور مجھ جیسی عورتوں کو پچھلے ایک سال سے درپیش نت نئی لاحق بیماریوں سے لڑنے کا نیا حوصلہ ودیعت کیا ہے۔

"ہمارے نام" میں تمام خطوط دلچسپ رہے، بہن سلمیٰ ناز، آج کے دور کے حساب سے بیٹیوں کے بارے میں آپ کی فکر بجا ہے۔ مہناز یوسف کی آمد اچھی لگی۔

امبر خالد کا ناولٹ یہ دل بڑا نادان، ہلکی پھلکی مزے کی تحریر، اگر انجام کچھ اس طرح ہوتا کہ شجر کی شادی کی تاریخ طے کر دی جاتی جس پر وہ غصے میں زیادہ سے زیادہ کھانا شروع کر دیتی۔ اس پر سارا گھر پریشان ہوتا! ایک ہی سین میں ولی نے شجر کو قائل کر لیا، اسی طرح پورے ناولٹ کا سیکرٹ وہ سین، وہ گفتگو جو ولی اور اس کی ممی کے درمیان تھی، اسے کسی بہترین طریقے سے شجر پر کھلنا چاہیے تھا۔ تب ناولٹ مزید نکھر جاتا، مگر ابھی بھی بہت اچھا تھا، ہلکا پھلکا، انٹرسٹنگ سدرہ حیات کا "کھوٹ من کے تھے" پاپولر فکشن اور سسپنس کا بہت اچھا امتزاج رہا، ہاجرہ ریحان کے چھوٹے افسانوں میں ہمیشہ بڑا پیغام ہوتا ہے۔ ان کا افسانہ "توہین" بھی اسی طرح کے خوب صورت مثبت پیغام سے سجا ہوا تھا۔

قرۃ العین سکندر، آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک۔

"انا اور محبت" نوشابہ زینت کا افسانہ بے حد پسند آیا۔ جبیبہ انجم مجھے "چراغ کا جن" جیسی عورتیں بہت پسند ہیں مگر کسی غیر عورت پر ترس کھا کر اسے گھر ہی لے آنا ہرگز دانش مندی نہیں۔ نورین زہرا کا "حقیقت پسند" گھر گھر کی کہانی، "حنوط" کی کہانی بھی اچھی رہی۔

ج: پیاری ہاجرہ! دسمبر کے دیے زخموں میں تو اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اہل اختیار و اقتدار کو عقل سلیم دے اور وہ نفرت کی سیاست کو چھوڑ کر مثبت سیاست کریں۔ ایک بار ملک دو ٹکڑے ہوا اب نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

خواتین پر تفصیلی تبصرہ بہت جامع ہے آپ نے ہر تحریر پر تبصرہ کیا۔ یہ بات بہت اچھی لگی۔ ایک بات کہنا تو بھول ہی گئے، آپ افسانے کیوں نہیں لکھتیں آپ میں صلاحیت ہے لکھیں۔

بسمہ شانزے پارس نواب ------ کراچی

دن رات گھومتے پنکھوں، روشنی بکھیرتی لائٹوں، چولہے سے لپکتے شعلوں، سبزیوں اور پھلوں کی مناسب قیمتوں، پانی کی موٹی دھاروں اور مناسب کرایوں اور ---- اور! خوش آئند خوابوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں "بسمہ شانزے پارس نواب"۔

جی تو جناب خط کی اتنی انوکھی شروعات پر تو آپ خاصی حیران رہ گئی ہوں گی، اب عادت بنا لیں کیونکہ "تبدیلی آئی ہے" تو ایسے ہی خطوط آئیں گے۔ ہاہاہا۔

پرانا ہو چکا ہے یہ گھسا پٹا جملہ کہ جی بڑی بہنیں پڑھتی تھیں یا گھر میں پہلے سے آتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اسی لیے میں یہ سب نہیں کہوں گی، پر یہ ضرور عرض کروں گی کہ پڑھتی تھی، پڑھتی ہوں اور پڑھتی رہوں گی "ان شاء اللہ"

---- عمیرہ احمد کا ناول الف جس میں ہمیشہ کی طرح عمیرہ جی اپنے بگڑے امیر زادے ہیرو کو کان سے پکڑ کر اچھا انسان بنتی نظر آ رہی ہیں۔ نمرہ احمد بھی اپنے قارئین کو اچھا انسان بنتی دکھا رہی ہیں۔ میں شریف لکھتی ہوں ان دونوں لکھاریوں کی نگارشات اگر غیر مسلم بھی پڑھیں تو اسلام کے دائرے میں داخل ہو جائیں۔

باقی باتیں بعد میں کیونکہ ہماری امی جان کی بکس میں جانے کی تان شروع ہو چکی ہے۔ جاتے جاتے ایک بات بتا دیں، کیا مجھ میں لکھنے کے جراثیم موجود ہیں؟ میں لکھنا چاہتی ہوں جو کہ ضرورت بھی ہے اور شوق بھی۔

ج: بسمہ شانزے پارس! آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں ہم ایک ہی شخصیت کے ہیں۔ "تبدیلی تو آ گئی ہے" لیکن ہماری طرف وہ "تبدیلی نہیں آئی جو آپ کے ہاں آئی ہے" پنکھے چل رہے ہیں نہ ہی روشنی بکھیرتی لائٹیں ہیں، نہ چولہے سے لپکتے شعلے ہیں نہ مناسب کرائے اور سبزی کی مناسب قیمتیں۔

بجلی گیس، غائب ہو تو نہ پنکھے چلتے ہیں نہ لائٹیں روشنی بکھیرتی ہیں، پیٹرول کی قیمت بڑھنے کے ساتھ بس اور رکشہ کے کرایوں میں اضافہ ہو گیا ہے اور سبزی کی "مناسب قیمت" پتا نہیں آپ کی نظر میں "مناسب" کا مفہوم کیا ہے۔ "تبدیلی" نے تو ہمارے اوسان خطا کر دیے ہیں۔

لکھنے کی صلاحیت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ آپ کوئی کہانی لکھ کر بھجوائیں تو بتا سکتے ہیں صلاحیت ہے یا نہیں ہے۔

اریج خان ------ جلالپ

کتنے عرصے سے کیونکہ جہاں تک یادداشت جاتی ہے خود کو ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے پایا۔ امی کو بھی خواتین ڈائجسٹ کے ناول بہت زیادہ پسند ہیں۔ اس لیے ہمارا گھر شروع سے ہی شعاع اور خواتین کے شماروں سے بھرا رہتا ہے اور پاپا کہتے ہیں کہ "جس کو اصل" کتاب کہتے ہیں وہ تو تمہاری ماں نے کبھی پڑھی ہی نہیں ---- لیکن ہمارے لیے تو اصل نقل سب یہ ڈائجسٹ ہی ہیں۔ اردو زبان سے بھی انہوں نے ہی روشناس کرایا بلکہ دین دھرم سب یہیں سے سیکھا ہے۔ اب آپ ہم سے خاموشی توڑنے کی وجہ پوچھیں گے تو اصل بات یہ ہے کہ ہمیں آج تک خط پوسٹ کرنے کا طریقہ ہی معلوم نہ تھا، اب یونی

WOMEN SKILLS GROUP

ورسٹی میں داخلے کے لیے ڈاکومنٹس بھیجے تو سوچا آپ کو بھی خط لکھ کر حال دل کہہ دیں۔

خواتین ڈائجسٹ کے تمام ناول تو زبردست ہوتے ہی ہیں مگر ہمیں اس کے سلسلے بھی بے حد پسند ہیں۔

رائٹرز میں سمیرا حمید، سائرہ رضا، فائزہ افتخار اور نمرہ احمد ہماری پسندیدہ ہیں۔ اسپیشلی سمیرا حمید کے لکھنے کا اسٹائل سب سے منفرد اور بے حد خوب صورت ہے۔ ان سے کوئی سلسلہ وار ناول لکھوائیں پلیز! اور فائزہ افتخار تو نئی دی کو ہی پیاری ہو گئی ہیں۔ ان کو بھی واپس لائیں۔ نومبر کے شمارے میں ایک افسانہ "رشتے کچے دھاگے" پڑھا جس کے کچھ پوائنٹس بالکل سمجھ میں نہیں آئے لکھا گیا تھا کہ "سالوں گزر گئے نہ حنا گھر گئی اور نہ دو طلاقیں آئیں" جبکہ ہماری ناقص معلومات کے مطابق ایک طلاق کے تین ماہ بعد مکمل طلاق ہو جاتی ہے، باقی دو کی ضرورت نہیں رہتی۔ مزید لکھا گیا کہ " اس کی خوب صورتی اور ڈگریاں بھی اس کے کسی کام نہ آئیں۔" حنا نوکری کر کے بیٹے کو پال سکتی تھی، اس کا باپ بھی اس کو خرچہ بھیجتا، پھر بھی وہ "بھوک کا شکار" ہو گیا (معذرت کے ساتھ لیکن افسانے میں یہ ہی الفاظ استعمال ہوئے تھے) باقی ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔

اور اداکار " محب مرزا" کا انٹرویو شائع کریں پلیززز......

ج: پیاری اریج! بہت خوشی ہوئی کہ طویل عرصہ بعد آپ نے اپنی خاموشی توڑ دی۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ طلاق تین بار دی جائے تب ہی مکمل ہوتی ہے، تین طلاقوں کے درمیان میں وقفہ ضروری ہے۔

عالیہ بتول...... تحصیل گوجر خان

ان کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ جب بھی لکھتی ہیں تو مشکل لکھتی ہیں سمجھ ہی نہیں آتا اور میں جب بھی ان کا کوئی ناول پڑھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ اچھی، صحت مند اور خوب صورت شستہ اردو کی تشنگی یہاں سے پوری ہوتی ہے، شاید آپ نہ سمجھے ہوں یا سمجھ گئے ہوں کہ میں اور کسی کی نہیں فرزانہ کھرل کی بات کر رہی ہوں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ پلیز فرزانہ کو ان کے اسٹائل سے ہی لکھنے دیں۔

ج: پیاری عالیہ! آپ پریشان نہ ہوں فرزانہ آپ کو پسند ہیں تو ہمیں بھی پسند ہیں۔ ہم ان سے لکھواتے رہیں گے اور وہ اسی طرح لکھتی رہیں گی۔ ان شاء اللہ۔

هدیٰ نور...... کوٹلی آزاد کشمیر

"حالم" مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ مجھے الف بہت پسند آیا ہے۔ ابوالعلیٰ کا کردار بہت اچھا ہے اور ان کی باتیں بھی بہت گہری ہوتی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ مجھے پسند ہے اور اس کے بارے میں کہوں گی۔

تم کو دن رات یاد کرتے ہیں
تیرے آنے کی دعا کرتے ہیں

ج: پیاری ہدیٰ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں لیکن یہ کیا؟ صرف دو ناولوں پر تبصرہ......؟ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

ریحانہ چوہدری...... بدوملہی

سرورق بہت دیدہ زیب تھا "کہنی سنی" پڑھی تو دل بے اختیار اداس ہو گیا۔

مزنہ وقاص کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ "الف" کے بارے میں کیا کہیں۔ اچھا ہوا کہ فیصل کا غصہ جلد ختم ہو گیا۔ مومنہ کا اقدام لائق تحسین لگا۔ قرۃ العین سکندر کا افسانہ "دل مضطرب" نوشابہ زینت کا "انا اور محبت" بہت اچھے تھے۔ سدرہ حیات کا "سب ہی کھوٹ من کے تھے۔ دلوں کی داستان۔ توہین" ایک سبق آموز افسانہ تھا۔ نعیمہ ناز کا تاریخی پس منظر میں لکھا گیا ناول بھی......

"نامے ہمارے نام" میں اپنا نام خود تو نہ دیکھ سکی بیٹی ارجمند نے بتایا کہ ماما جی آپ کا لیٹر شائع ہوا ہے۔

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت سے ڈائجسٹ مانگا مگر ناں جی سارہ چوہدری (چھوٹی بیٹی) نے پکڑ لیا۔ بس پھر اس نے تو با آواز بلند لفظ لفظ پڑھ کر سنایا۔ (سارہ 2 کلاس میں پڑھتی ہے مگر ابھی سے تک بندی کرتی ہے) آپ نے شعاع اور خواتین کا حصہ بنایا ہمارے نام کو۔ مگر ہم نوشابہ زینت گجرات کے خط سے بہت حیران ہوئے کہ گجرات میں کس جگہ یا گاؤں میں کھانے کو زہر نہیں ملتا۔ کیونکہ گجرات تو بڑا اور قدیم تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ خامشی کو یاں ملے اور آپ کا باورچی خانہ دونوں اچھے لگے نفسیاتی الجھنیں میں عدنان صاحب کے مشورے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ڈائری کے اوراق بھی بہت دلکش تحریروں سے مزین تھے اور آپ کی اجازت سے بات کرنا چاہوں کہ فرزانہ کھرل کی تحریر "پھول منڈی" کے بارے میں کیا زبردست تحریر تھی۔ الفاظ کی بنت، بہت پر اثر کبھی تو لفظ رقص کرتے نظر آئے اور کس ہواؤں میں پرواز کرتے اور کہیں یہ ہماری سوچ کے لیے دلدل ثابت ہوئے۔ ہمارے دھیان کو اپنے اندر جذب کرتے کہیں گھنگرو کی طرح بجتے اور کہیں نشتر بنتے کہیں حوصلہ بڑھاتے، کہیں زخم کریدتے الفاظ کو رقم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اگر میں تعریف نہ کروں تو خود کو مجرم سمجھوں گی، معاشرے کے حساس رویوں کو پورٹریٹ کیا ہے یوں کہ لگتا ہے کہ گویا کوئی آرٹ فلم دیکھ رہے ہوں انہیں اتنی اچھی تحریر لکھنے پر بہت بہت مبارک باد پیش کر دیجیے گا۔

ج: پیاری ریحانہ! ارجمند اور سارہ کو ہماری طرف سے بہت پیار دیجیے۔ سارہ اتنی چھوٹی عمر میں پڑھ لیتی ہے اور آپ کو اچھے اچھے مشورے بھی دیتی ہے۔ بڑی بات ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذہین بچیاں ہیں آپ کی ویسے (ماں بھی کم ذہین نہیں ہے)

ریحانہ آپ کے خط پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ میں تخلیقی صلاحیت ہے آپ نے لکھنے کی کوشش کی ہے کبھی؟ اس طرف توجہ دیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ندا رفیق...... 156 ر ب دیڑھ جھنگ

خط لکھنے کی اصل وجہ عمیرہ احمد کا ناول الف ہے۔ بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں عمیرہ احمد۔ ہمیشہ کی طرح۔ ساری رائٹرز باکمال ہیں۔ بہت اچھا لکھ رہی ہے۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، سمیرا حمید، سائرہ رضا، ایمل رضا، قرۃ العین ہاشمی۔ عطیہ خالد، نازیہ رزاق، عفت سحر طاہر، راشدہ رفعت، مصباح علی سید، فاخرہ جبیں، نایاب جیلانی، قرۃ العین سکندر، شازیہ الطاف، نورین زہرا، صدف اور فرزانہ کھرل سب بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ فرزانہ کھرل کی تحریر ہمیشہ میں دو دفعہ پڑھتی ہوں۔ کیوں کہ ان کے کردار بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ میری یاد داشت بہت کمزور ہے مثلاً آنٹیوں کے بچے بھول جاتی ہوں۔ یعنی مجھے اپنی کزن اور کزنوں کا بالکل علم نہیں کہ وہ کتنے ہیں۔ میں کہانی اور افسانہ لکھ کے بھیجنا چاہتی ہوں آپ کو۔ آپ شائع کر دیں گے اور پلیز مجھے بتا دیں کہ صفحے کے ایک جانب لکھوں یا دونوں جانب۔

ج: پیاری ندا! "ہمارے نام" خطوں کے سلسلے کے اختتام پر ہر ماہ ایک باکس ہوتا ہے جس میں کہانی لکھنے کے بارے میں تمام ضروری باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ آپ پڑھ لیں ویسے آپ کو بتا دیتے ہیں۔ کہانی آپ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔

خواتین کی محفل میں آپ کی شرکت اچھی لگی۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

ڈاکٹر فریال خان...... ڈی جی خان

آپ کے مشورے پر عمل کر رہی ہوں مریض بھی چیک کر رہی ہوں اور خط بھی لکھ رہی ہوں۔ باجی جہاں تک گھر والوں کی بات ہے تو واقعی آپ نے صحیح کہا کہ ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے پتا نہیں مجھے کیا ہوتا ہے میری آنکھیں صرف کھلی ہوتی ہیں۔ باقی میری زبان اور کان بند ہو جاتے ہیں۔ حق باہ باجی کر دی ناں آپ نے شریکوں والی بات کہ خط تاخیر سے ملا، مجھے یہ بتائیں ہم لوگوں نے کبھی شکوہ کیا کہ ڈائجسٹ تاخیر سے موصول ہوا جو کہ ہر بار ہی ہوتا ہی کبھی 12 کو، کبھی 18 کو۔ الف اور حالم تو بس پرچے کی جان ہیں۔ رزق حلال بہت اچھا جا رہا ہے۔ کھوٹ من کے تھے بہتر تھی۔ باقی سب بھی اچھے تھے۔ سائرہ رضا، سمیرا حمید، ایمل رضا، فرحت اشتیاق کو بہت مس کر رہی ہوں۔ اور نمرہ احمد سے درخواست ہے کہ پلیز پردے کے حوالے سے ایک اور تحریر پلیز۔ آپ کی تمام تحریروں نے بہت ان مٹ اثرات چھوڑے ہم لوگوں پہ۔

جہاں تک بات ہے کھانے کے شوقین ہونے کی، یقین کریں میرے دائیں طرف گول گپے والا، بائیں طرف سموسے والا۔ ناک کی سیدھ میں دہی بڑوں والا۔ میں بس خوشبو سونگھ سونگھ کے خوش ہوتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی چکھ لیتی ہوں بس دو دو پلیٹس۔ ہاہاہا زیادہ نہیں۔

اور ہاں یاد آیا اب نے سب کو کہا کہ آپ ہر دفعہ خط

WOMEN SKILLS GROUP

لکھا کریں۔ بس مجھے نہیں کہنا۔ اللہ یہ عزت ہے ہے ہمارے ڈاکٹروں کی۔

ج: فریال ! ہمارے دل میں ڈاکٹروں کی بہت عزت ہے بس تھوڑا دور دور رہتے ہیں ڈاکٹروں سے۔ ڈر جو لگتا ہے دواؤں سے۔ اب بھی دوا کھائی ہے ایک نئی تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ گول گپے، سموسے اور دہی بڑے۔ کیا مزے دار چیز آپ کا کلینک ہے۔ اور صرف دو دو ٹیبلیٹس ؟؟؟؟ یعنی یہ "صرف" نہیں۔ سچ کہیں اچھے چٹ پٹے کھانوں کی شوقین ڈاکٹر وکیل ہارو بھی ہے۔ ہم تو جب بھی ڈاکٹر کے پاس گئے انہوں نے سادہ کھانے کی ہدایت کی ویسے سچ سچ بتائیں آپ اپنے مریضوں کو کیا ہدایت کرتی ہیں؟

"آپ ہمیں ہر ماہ ہی کہیں ہر ہفتہ خط لکھیں اتنے مزے دار خط پڑھ کر تو ہمارا موڈ بھی خوش گوار ہو جاتا ہے۔ ایک ضروری وضاحت نیمرہ ناز کے ناول کا نام "رزق حلال" نہیں رزق زوال ہے۔ فہرست میں سہوا "رزق حلال لکھ دیا گیا۔

ماریہ نذیر..... بھاگٹا نوالہ

2004ء سے خواتین، شعاع کے قاری ہیں۔ بہت بہت اچھے رسالے ہیں دونوں۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اک بات کہنی تھی آپ سے کہ ہمیں ڈائجسٹ ملتا ہی 10 کو ہے۔ سو اگر آپ کو ہمارا خط لیٹ ملے تو بھی اگلے ماہ ہی شائع کر دیجیے گا۔

اب بات ہو جائے ناولز کی تو قسط وار ناول تو سارے ہی لا جواب ہوتے ہیں۔ افسانوں میں سبق سیکھنے کو ملتا ہے۔ بس آپ سے درخواست ہے راحیل رضا، سائرہ رضا اور فرزانہ کھرل سے قسط وار ناول لکھوائیں۔ اور ہاں سچ سمیرا حمید سے بھی قسط وار ناول کی فرمائش ہے۔

آپ کے جوابات کی میں بہت بڑی فین ہوں۔ صرف آپ کا جواب سننے کے لیے کاغذ قلم اٹھایا ہے۔

ج: پیاری ماریہ! چودہ سال سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہیں اور ہماری محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہیں ۔ یہ تو زیادتی ہے ہمارے ساتھ۔ ہم تو اپنے قارئین کی رائے کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کریں۔

فریحہ عزیز شیخ..... کنڈیارو

میں نے دو بار پہلے بھی پوچھا تھا اور اب پھر پوچھ رہی ہوں۔ پلیز بتا دیں میری کہانی (تھجے رب سے مانگا) قابل اشاعت ہے یا..... ردی کے ڈھیر کی زینت بن گئی؟ سوچا تھا اب کبھی خط نہیں لکھوں گی۔ لیکن جب کہانیاں پڑھیں تو..... روتے ہوئے ہوئے واہ مزہ آ گیا کمال کر دیا۔ سائرہ رضا کی جمال زہرا نے اور سمیرا حمید کی ام الیقین نے ..... میں الکھ..... مجھے الفاظ نہیں مل رہے ان کی تعریف کے لیے۔ ام الیقین کا وہ ڈائیلاگ تو دل میں اتر گیا ..... جو زمین سے بلند..... وہ ان سے ہوتا ہے۔ واہ واہ مجھے دیبا اور والد کا کردار بہت پسند آئے۔ باقی سارے لوگ ظالم لگے۔ جمال زہرا میں زہرا کے ساتھ بہت برا ہوا اور یہ سب اس کے والد کی وجہ سے ہوا سیف اللہ نے بھائی کی بیٹی کے لیے اپنی بیٹی کی زندگی برباد کر دی۔ کہانی پڑھ کے مجھے سائرہ رضا کو دیکھنے کا شوق ہوا تو میں نے فوراً نیٹ پر سرچ کر کے دیکھا تو ایک چشمے والی خاتون آ گئیں۔ اب پتا نہیں وہ سائرہ رضا تھیں بھی یا نہیں۔ الف بھی اچھا جا رہا ہے مومن حد سے زیادہ مغرور ہے۔ تھوڑا کم کیجیے۔ ہیرو پر اتنا غرور اچھا نہیں لگتا۔

ج: فریحہ ! آپ نے کس کو دیکھ لیا۔ سائرہ رضا چشمہ نہیں لگاتی ہیں۔ آپ کا خط تاخیر سے موصول ہو یا موصول ہی نہ ہو تو بتایئے ہم کیا کریں۔ (کبھی کبھی صفحات کی مجبوری بھی وجہ ہوتی ہے) ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ سب بہنوں کے خط شامل کیے جائیں۔ لیکن اگر خط شامل نہ ہو تو ہماری محبت پر شک نہ کیا کریں۔ ہماری اپنی قارئین سے محبت انمٹ اور لازوال ہے۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔

شازیہ ستار..... ڈی جی خان

الحمد للہ زندگی جیسے جا رہے ہیں نہ جانے زندگی ہمیں گزار رہی ہے یا ہم زندگی کو؟ شکر ہے اس رب پاک کی ذات کا، جینے کا وسیلہ کوئی نہ کوئی تھما ہی دیتا ہے۔

آنٹی دسمبر کا شمارہ ڈی جی خان میں بہت لیٹ ملا ہے۔ میری طرف سے سوال پوچھنے پر آپ کی طرف سے "پراسرار خاموشی" نا قابل سمجھ ہے۔ پہلے کافی عرصے افسانہ VIP زکوۃ بھیجا مگر کوئی اتا پتا نہیں..... اب مجھے

لازمی بتائیں کہ آپ کو میرا ناولٹ "میں راحیل ہوں" موصول ہوا ہے کہ نہیں۔ کہنی کئی میں آپ کی باتیں تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر ایسے..... جیسے اک سے جاتے ہیں پھر غور و فکر کی دعوت خود کو دیتے ہیں۔ "کرن کرن روشنی" بہت ہی مفید ترین سلسلہ ہے۔ فریدہ وقاص سے ہمارا سلان سے ملاقات اچھی رہی۔ نمیرہ احمد کا "الف" میں قلب مومن کے بارے میں جو میں نے اندازے لگائے وہ صحیح ثابت ہو رہے ہیں میری بھابھی کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا گردوں کا۔ مومنہ پر جیسے اب اچھا وقت آنا شروع ہوا ہے۔ ایسا شاید میرے بھائی کے ساتھ بھی اچھا وقت اللہ کرے شروع ہو جائے۔ (آمین)

ج: پیاری شازیہ! یہ کیا بات ہوئی زندگی ہمیں گزار رہی ہے یا ہم زندگی کو گزار رہے ہیں۔ یہ یاسیت والی باتیں ہمیں اچھی نہیں لگتیں۔ خوش رہیں، خوش رہیں۔ اگر برا وقت بھی ہے تو گزر جانے کے لیے ہے پھر اچھا وقت بھی آئے گا اور آپ بیٹی کو موٹا کرنے کے چکر میں نہ پڑیں اگر وہ چاق و چوبند ہے اور کوئی بیماری نہیں ہے تو دبلا ہونا کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آج کل لوگ موٹاپے سے کس قدر پریشان ہیں اور دبلا ہونے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں۔

نیمرہ ناز کے ناول کا نام رزق زوال ہے۔ رزق حلال نہیں ہے۔ آپ کی کہانی موصول ہو چکی ہے لیکن ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ناہید اسماعیل..... کراچی

پیاری آپی! مجھے احساس ہے کہ بہنوں کی محفل کسی بحث و مباحثے کے لیے نہیں سجائی گئی ہے لیکن پھر بھی میری التجا سمجھ کے یہ شائع کر دیں جو میں سلمیٰ اعوان صاحبہ سے کہنا چاہتی ہوں۔

پلیز سلمیٰ بہن اگر میرا تبصرہ آپ کی دل آزاری کا سبب بنا ہے تو صدق دل سے معافی چاہتی ہوں آپ میرے لیے ہر رشتے میں قابل احترام ہیں۔ قارئین کے ایک تواتر سے ایسے خطوط آتے ہیں جن میں رسالوں سے بگڑ جانے اور ان پر سختی پابندی کا ذکر ہوتا ہے آپ کا نام محض اس لیے استعمال ہو گیا کہ اس سے پہلے والدین میں سے کسی نے نہیں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے آپ کی یا کسی بھی ماں کی تربیت کو کمزور ہرگز نہیں کہا میں نے ماؤں

کی بہت [illegible] کہا ہے [illegible] میں [illegible] کی سب [illegible] جن کی [illegible] سے [illegible] ہے لیکن [illegible] سب سے زیادہ [illegible] یاد [illegible] ہے [illegible] مجھ سے [illegible] نہیں [illegible] آپی سے [illegible] بھی [illegible] ہرگز نہیں تھا۔ [illegible] کی ناراضی اور بدگمانی دور ہو جائے گی۔

"کہنی کئی" پڑھ کے ہمارے دل سے بھی [illegible] کے لیے بے اختیار دعا نکلی اور جو حالات اب ہیں اس کی دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اس شمارے کی سب سے اچھی تحریر "رزق زوال" نیمرہ ناز نے کمال کی لکھی ہے۔ عجیب غم و غصہ نفرت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ پڑھتے رہے اس تحریر کو پڑھ کے اطمینان بھی ہوا کہ غداری کی عبرتناک سزا ملی [illegible] نسل۔ دل چاہتا ہے کہ ایسی تحریریں اکثر آیا کریں۔

"کرن کرن روشنی" ہمیشہ کی طرح مفید اور معلوماتی۔ نفسیاتی الجھنیں میں دونوں خطوط پڑھ کے یوں لگا جیسے کسی افسانے نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے سچ کہا ہے کسی نے کہ کبھی کبھی حقیقت، کہانی سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ "خاموشی کو بیان ملے" تبسم بشیر نے اچھا تعارف کروایا۔ انہیں بھی عنیزہ سید پسند ہیں "ہمارے نام" میں تمام ہی خطوط اتنے زبردست آتے ہیں کہ اگر ان پر تبصرہ کیا جائے تو یقیناً ایک افسانے جتنی جگہ تو ضرور ہی لیں گے۔ ریحانہ چودھری نے اپنے کھیت (کھیت ہی کہنا چاہیے نا؟) کا ذکر کر کے للچا کے رکھ دیا۔ عروج یوسف اور ڈاکٹر فریال کے خط نے بھی مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔ سرزیہا گلزار کا خط پڑھ کر اور ان کی لائبریری کا جان کر منہ سے بے ساختہ "واہ" نکلی اور جب کوئی سمیرا حمید کی تعریف کرتا ہے تو ہم پتا نہیں کیوں بے حد خوش ہونے لگتے ہیں۔

ج: ناہید! ہر بار ہی آپ کا تبصرہ لاجواب ہوتا ہے۔ ام الیقین پر آپ نے جو تبصرہ کیا، وہ ہم نے سمیرا کو پوسٹ کر دیا ہے۔ سمیرا حمید کی تعریف پر ہم بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔ آپ کی پسندیدہ مصنفہ ہمیں بھی بے حد پسند ہیں۔

سحر تبسم سحری..... مغل پورہ

پچھلے چند ماہ سے خط نہیں لکھا تو دل بے قرار رہا۔ خواتین سے محبت ہی بہت ہے کیا کریں۔ پر شاید میں آپ

WOMEN SKILLS GROUP

کو یاد نہیں ہوں؟" "کبھی کبھی" میں مدیر کی باتیں افسردہ کر گئیں۔ سروے کے سوال پڑھے دل کیا کہ شرکت کروں پر پھر سوچا کہ کیا پتہ شامل ہی نہ ہوں؟ "کرن کرن روشنی" ہمیشہ کی طرح ذہن کو روشنی بخشتی محسوس ہوئی۔ قدرت اللہ شہاب انکل جی کا روکھا پھیکا رہا۔ ان کی شاعری دیا کریں مجھے ان کی شاعری زیادہ پسند ہے، پلیز! "مرزا وقاص اور ہمارا دسترخوان" کے انٹرویو بہت بورنگ تھے ذرا مزہ نہیں آیا۔ نبیلہ ابر راجہ کا ناول کافی بھاری ہے آخری قسط کب ہوگی؟ "کھوٹ من کے تھے" سدرہ حیات کا ناول بس اوکے اوکے تھا۔ مریم عزیز۔ اور نبیلہ عزیز سے مکمل ناول لکھوائیں پلیز! "یہ دل بڑا نادان ہے" امبر خالدہ کی تحریر بھی اچھی لگی، یہ کیا آپ لکھاری ہیں "تو ہیں، چراغ کا جن اور دل مضطرب لاجواب تحریریں تھیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی تو ہر چیز لاجواب ہے۔ "خاتون کی ڈائری" میں سے عائشہ فاطمہ، حمرہ خان، ماہ نور کوثر، فاکہہ کنول کی غزلیں پسند آئیں۔ عروسہ یوسف کی طرح ہم بھی ہلکی پھلکی کہانیوں کے لیے ہی ترس گئے۔ "آپ کا باورچی خانہ" میں طاہرہ یاسمین کا سلسلہ کافی مختصر مگر اچھا لگا۔ "نفسیاتی ازدواجی الجھنیں" نورین کو عدنان بھائی نے بالکل صحیح مشورہ دیا۔ دوسری طرف اختلال علی کی بے توفیقی پر سرپیٹ لینے کا دل کیا۔ پلیز عدنان بھائی کے مشورے پر عمل کریں۔ "بیوٹی بکس" میں اصل کے مشورے ہمیشہ زبردست اور سادہ ہوتے ہیں۔

ج: پیاری سحر! آپ کو خواتین سے محبت ہے اور ہمیں آپ سے محبت ہے۔ آپ سے ہی کیا ہمیں اپنی تمام قارئین دل سے عزیز ہیں۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ یاد نہیں کیا۔ جس طرح آپ ہمیں یاد کرنے کے باوجود خط نہیں لکھ پائیں بالکل اسی طرح ہم بے شک اظہار نہ کریں لیکن اپنی تمام قارئین کو یاد رکھتے ہیں۔ تفصیلی اور جامع تبصرہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی رائے مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

فرح افتخار ــــ کراچی

یوں تو میں نے خواتین ڈائجسٹ لیٹ پڑھنا شروع کیا تھا یعنی یونیورسٹی لائف کے بعد مگر جب پڑھا تو یقین جانیے بس اسی کے ہو کر رہ گئے پھر چاہے خریدیں یا احباب سے لے کر پڑھ لیں بہرحال سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ خواتین ڈائجسٹ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ ہر کلاس (طبقے) کی خاتون کا فیورٹ رسالہ ہے۔ ہم نے ایسی لاڈلی، لاابالی بچیوں کو بھی پڑھتے ہوئے دیکھا ہے جنہیں گھرگرہستی کا دور دور تک کوئی شوق نہیں تھا اور نہ کبھی دلچسپی رہی مگر شادی کے بعد [illegible] زندگی میں انہیں خوب نباہ کرتے ہوئے پایا۔ تو یقیناً اس کا سہرا خواتین کی رائٹرز کو جاتا ہے۔ جہاں تک میری پسندیدہ رائٹرز کا تعلق ہے تو ان میں عمیرہ احمد تو کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ [illegible] احمد نے بھی مصحف جیسا ناول لکھ کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ [illegible] احمد نے بھی ام الصبیان لکھ کر ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا [illegible] نعیمہ ناز بھی ہمیشہ خوب لکھتی ہیں۔ بشریٰ احمد بھی مجھے بہت پسند ہیں [illegible] لکھنے والیوں میں تحریم ولی کا افسانہ روشن کی [illegible] پلاٹ اور کرداروں کے حوالے سے کافی ہائی اپروچ کا لگا۔

"نفسیاتی ازدواجی الجھنوں" کے حوالے سے میرا ایک ادنیٰ سا مشورہ ہے کہ آپ عدنان بھائی کے پچھلے سارے کالمز پر مشتمل ایک کتاب ضرور شائع کروا دیں اس اقدام پر تمام قارئین آپ کو بہت سراہیں گی۔

اس کے علاوہ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ ساتھ شعاع بھی ہمارے زیر مطالعہ رہتا ہے اس میں ایک سلسلہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ج: پیاری فرح! آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

کوثر خالد سودا ــــ جڑانوالہ

آگہی کا ابتلا ہے اور میں
اک مشکل مرحلہ ہے اور میں
بے نیازانہ روش ہے "اور وہ"
صبر و تسلیم و رضا ہے اور میں

یاسمین کنول ــــ پسرور

لب پہ اب نغمے بھی مچلتے نہیں
قلم اب گیت بھی تو لکھتا نہیں
دل کہ کھو جاتا تھا نظاروں میں
اب کسی بات سے بہلتا نہیں

مریم امان ــــ لیہ

پہلے ہوتی تھی فکر فردا کی
اب کوئی اور پریشانی ہے
دوسروں کو دکھا نہیں سکتے
درد ہے یا کوئی نشانی ہے

بنت راجپوت ــــ ڈیرہ اسماعیل خان

[illegible] جب بچھڑ گئے کب جدائی کا غم
دل [illegible] ٹوٹے ہوں گے

شہیرہ اقبال ــــ ڈھولن پیک

تجھ کو دیکھا [illegible]
تجھ کو پایا تو [illegible]

ملائکہ کوثر ــــ [illegible]

بادل جو گرجتے ہیں وہ برسا نہیں کرتے
محسن کبھی احسان کا چرچا نہیں کرتے
آنکھوں میں بسا لیتے ہیں روٹھے ہوئے منظر
جاتے ہوئے لوگوں کو پکارا نہیں کرتے

اقرا طیب ــــ [illegible]

اب اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

سعدیہ جواد ــــ کھاریاں

اک نئے سال کی آمد کا سہارا لے کر
بیت جائیں گے نجانے کتنے دسمبر

حافظ شفا گل ــــ ملتان

سب سے مشکل ہے اذیت پہ گوارا کرنا
دل سے اترے ہوئے لوگوں میں گزارا کرنا

فرح بنت العزیٰ ــــ پاک پتن

مختصر اہل ستم پر ہی نہیں ہے موقوف
لوگ اپنوں کی عنایت سے بھی مر جاتے ہیں

ہنی نور ــــ آزاد کشمیر

ہر اک عکس کے ماتھے پر الم کی داستانیں ہیں
کوئی چہرہ بھی پڑھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
بڑے لوگوں کے اونچے بد نما اور سرد محلوں کو
غریب آنکھوں سے تکتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

ماریہ نذیر ــــ [illegible]

کتنی محنت ہے تجھ سے لفظوں کے سہارے [illegible]
محسوس کر کے احساس کو اب [illegible]

مقدس عقیل ــــ لاہور

مجھے [illegible] کسی طرح سے مان لوں!
میرا پہلا قدم اب بھی تیری گرفت تک ہے

اقصیٰ ظہیر ــــ کراچی

دسمبر خشک راتوں میں تنہائی
تیری یادوں [illegible]
[illegible]
[illegible]

آمنہ احسان ــــ کھاریاں

دسمبر جب بھی لوٹا ہے میرے خاموش آنگن میں
میرے بستر پہ بکھری ہوئی کتابیں بھیگ جاتی ہیں

WOMEN SKILLS GROUP

خاموشی کو بیاں ملے

ادارہ

فاطمہ راجپوت ...... ضلع اوکاڑہ

1) میرا نام تو فاطمہ ہے لیکن پیار کے نام بہت سارے ہیں جیسے فاطو، فاطی، کوتی اور بھی بہت سارے ہیں مگر لکھے نہیں جاسکتے۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں، دو بڑے بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں، میں سب سے چھوٹی ہوں۔

گھر میں ویسے تو میرے چچا کی فیملی بھی ساتھ ہی رہتی ہے۔ بھابیاں بھی ہیں، چچا کی بیٹیاں ہیں مگر "ہم" خود کو اکیلا ہی محسوس کرتے ہیں کیونکہ والدہ کا دس سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ بھائی اور ابو جاب پر۔ بہنیں اپنے گھروں میں ہوتی ہیں۔ کہانیاں پڑھنے کا شوق بہنوں اور کزنز سے ہوا اور سب ناول اکٹھے کرنے کا بہت شوق ہے اور پڑھنے کا بھی۔ الف اے کیا ہے، درمیان میں کچھ سال پڑھائی چھوڑ دی تھی، اب بی اے کا ایڈمیشن بھیجا ہے۔ آپ کی دعا سے اور اللہ کے کرم سے پاس کرلیا تو بڑی بات ہوگی کیونکہ کچھ لوگوں نے چیلنج دیا ہے۔ کھانا بنانے کا شوق بھی ہے اور اچھا کھانے کا بھی مگر بناتے ہم ذرا موڈ سے ہیں۔

2) سب سے مشکل سوال اف۔ خامیاں وہ بھی اپنی بتانا ذرا مشکل ہوتا ہے اور ماننا بھی کچھ لوگ مانتے نہیں ہیں نا؟ میری سب سے بڑی خامی جذباتی بہت ہوں، غصہ بہت شدید قسم کا ہوتا ہے اور غصے میں اونچا بہت بولتی ہوں۔ جذبات میں آ کر بولنا شروع کروں تو اگلے بندے کو لگتا ہے لڑ رہی ہوں۔ البتہ دل کی اچھی ہوں، دوستوں کی دوست ہوں اور اگر کوئی دشمنی کرے تو معاف نہیں کر پاتی۔ جب تک اگلا بندہ بات کی وضاحت نہ کرے ویسے تو اس وقت مجھے اپنی خامیاں ہی یاد آ رہی ہیں۔

خوبی یہ ہے کسی سے حسد نہیں کرتی، خوش اخلاق ہوں جہاں بھی جاتی ہوں، گھل مل جاتی ہوں۔

3) خواتین سے اور شعاع سے رشتہ آٹھویں تھی، وہ تھی فرحت اشتیاق کی "متاع جاں ہے تو" اس کے بعد کرن، شعاع، خواتین۔ کزنز کی درازوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے وہ رسالے نکالتی جن میں فرحت، عمیرہ، نبیلہ عزیز، راحت، شازیہ چوہدری کی کہانیاں ہوتیں وہ پڑھتی تھی۔ جب ان کے پرانے رسالے ختم ہوئے تو 2013ء سے خود خرید کر پڑھتی ہوں۔

امر بیل، پیر کامل، شکست شب، بیلی راجپوتاں دی، زر روز ماتوں کا سویرا، کچ مینوں مرن دا شوق، نمل، جنت کے پتے، مصحف، شہر دل کے دروازے اور بہت سے نام تو اب یاد نہیں آرہے، پڑھ چکی ہوں۔ رسالے کا بہت شدت سے انتظار رہتا ہے مگر دس کے بعد ہی شکل دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔

4) سالگرہ باقاعدہ تو نہیں مناتی مگر 2012ء سے اب تک کی سالگرہ راحت جاں اپیا منا دیتے ہیں۔ کیک بھیج کر اور میری پسند کا گفٹ بھی ملتا ہے۔ بارہ بجے وش کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک بیسٹ فرینڈ ہے وہ بھی بارہ بجے وش کرتی ہے اور کوئی وش کرے نہ کرے فرق نہیں پڑتا۔ البتہ میں ایک شاعرہ کے دیتی ہوں اور اچھی سی شاعری لکھتی ہوں جو سب کو پسند آتی ہے۔ کبھی خالی خولی نہیں لکھ کردیا، کچھ نہ کچھ دینا اچھا لگتا ہے۔

5) شاعری بہت زیادہ پسند ہے کزنز کو جب اپنی ڈائری سے شعر یا کوئی نظم سناتی ہوں تو ہمیشہ ہر شعر پر واہ واہ ملتی ہے۔ حسب حال جو سناتی ہوں، ہی ہی ہی۔ فیورٹ شاعر محسن نقوی، فرحت عباس شاہ، فیض احمد فیض، احمد فراز، پروین شاکر، احمد ندیم قاسمی اور وصی شاہ بہت پسند ہیں۔

پسندیدہ شعر......

وہ سامنے تھا مگر نگاہ اس کو چھو نہ سکی
یہ احترام کی حد تھی یا حوصلے کم تھے

اپنی فیورٹ رائٹر نمرہ کے حلم سے۔

"انسان جلد باز بنایا گیا ہے یعنی جلد رد عمل دینے والا۔ اس کا مطلب ہے ہم انسانوں خود کو اپنی اصلاح کرنا ہوگی۔ ہمیں ذرا ذرا سی بات پر رد عمل دینے سے خود کو روکنا ہوگا۔

6) اگر دوسروں کے منہ سے نکلے الفاظ ہمیں کنٹرول کرنے لگ جائیں تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم اپنی ذات [illegible] کریں کیونکہ جب یہ ٹوٹتا ہے تو انسان خود پہلے ٹوٹتا ہے۔

شازیہ ارشد...... قصور

1) میرا نام شازیہ ارشد ہے اور میں قصور شہر میں رہتی ہوں۔ یہاں مشہور دربار بلھے شاہ اور کھانے میں قصوری میتھی اور فالودہ شامل ہیں۔ کبھی آپ بھی آیئے گا ہم آپ کو یہ چیزیں کھلائیں گے۔ ہم چھ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ چار بہنوں کی شادی کے بعد مابدولت بیک وقت اپنے ڈھیر سارے بھانجے بھانجیوں کی خالہ، آپی، آنٹی کے عہدے پر فائز ہو چکی ہوں۔

فارغ وقت میں کتابیں پڑھنا ہمارا مشغلہ ہے، چاہے وہ ڈائجسٹ ہوں یا میگزین، کورس کی کتابیں ہوں یا اخبار کا ٹکڑا چاہے کہیں سے بھی مل جائے۔ اس کے علاوہ اپنی کیوٹ سی بھانجی نشاط عرف بلی کو ٹیوشن پڑھانا ہوتا ہے۔ دوستوں میں بہت عزت ہے، اسکول ہو، کالج ہو یا اکیڈمی ہر جگہ اساتذہ سے، دوستوں سے عزت، پیار اور محبت ڈھیر سارا ملتا ہے۔

2) خامیاں اور خوبیاں: ہر انسان میں خامیاں اور خوبیاں ہوتی ہیں۔ صاف گو ہوں یعنی جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہوں۔ میں حساس ہوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھنٹوں سوچتی رہتی ہوں۔ غصہ بڑی جلدی آتا ہے۔ محبت کرنے والی ہوں۔ سونیا کے الفاظ......

"شازیہ تم دل کی بہت صاف ہو، تمہیں آگے بھی ایسے ہی لوگ ملنے چاہئیں۔"

"تم بہت اچھی دوست ہو۔" سمیعہ کی تعریف۔

میری پیاری امی کے پیارے الفاظ۔

"بہنوں کی شادی کے بعد جس طرح شازیہ نے گھر سنبھالا ہے، قابل تعریف ہے یہ بات۔"

میرا غصہ میرا دل خون بڑھا دیتی ہے۔

"فرینڈلی بہت زیادہ ہوں۔" (کلثوم)

"سچ کہوں تو دنیا میں بہت سی دوستیں بنائی ہیں لیکن تم جیسی کوئی نہیں۔" (ثمینہ)۔

"[illegible] رہتی ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتی ہیں۔" (مریم)۔

"شازیہ! تمہارے جیسی دوست اللہ تعالیٰ ہر کسی کو دے، میں ہمیشہ تمہیں کو یاد رکھوں گی۔" (اقراء)۔

آپ بہت اچھی ہیں، ہر وقت خود بھی ہنستی مسکراتی ہیں اور دوسروں کو بھی۔ یہ سب میری دوستوں کی میری بارے میں رائے ہیں۔ آپ اس سے اندازہ لگالیں کہ میں کتنی اچھی ہوں (آہم)۔ ویسے میری کزن سعدیہ کو میرے ہاتھ کی بریانی پسند ہے۔

3) خواتین سے وابستگی کو بہت سال ہوگئے ہیں لیکن باقاعدگی سے پڑھتے ہوئے پانچ سال ہوئے ہیں۔ خواتین، شعاع میں لکھنے والی ہر رائٹر پسندیدہ ہے۔ ان سے بہت سیکھا ہے۔ ایسی بہت سی تحاریر ہیں جو ہمیں یاد رہیں گی۔ ان میں ماہا ملک کی "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" کا شاہ عالم۔ نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" میں جہان اور حیا کا کردار برسوں یاد رہے گا۔ عمیرہ احمد کا "امر بیل" کا عمر جہانگیر۔ "من سلویٰ" کی زینب ضیاء اور کرم اور "یارم" میں امرحہ اور عالیان، یہ نہ بھولنے والے کریکٹر ہیں۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم کی۔ یہ ساری تحاریر ایسی ہیں جو یاد رہ نہیں جائیں گی بلکہ یاد بن کر ذہن پر نقش ہو جائیں گی۔ ڈائجسٹ میں لکھنے والی ہر رائٹر کو سلام۔ جن کی محنت سے ہم اتنی عمدہ کہانیاں پڑھتے ہیں۔

4) سالگرہ باقاعدہ تو نہیں مناتی، کبھی کوئی گفٹ دے دیتا ہے۔ اکیڈمی میں ایک دوست نجمہ نے سرپرائز گفٹ دیا جو بہت اچھا لگا۔ گھر میں بھانجے بھانجیاں گفٹ دے دیتے ہیں، ویسے بھی اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے، زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے۔

5) مجھے شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے ہاں تھوڑا بہت پڑھ لیتی ہوں۔ میرا فیورٹ شعر جو آج کل زبان پر رہتا ہے۔ ویسے دل کی بات ہے اس میری پسند بدلتی رہتی ہے۔

یوں تو پہلے بھی دور دور تھے اور دلوں میں کدورت بھی
تو نے رسم بھلا دیا ورنہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی

*

WOMEN SKILLS GROUP

ڈراما سیریل سالوری کا تیمور

باتیں ہیں گی اور فضل ہے

شاہین رشید

1۔ اصل نام اور پیار کا نام؟
[illegible]
2۔ پیار کا نام؟
[illegible]
3۔ تاریخ پیدائش؟
23 [illegible] 1989ء۔
4۔ [illegible]
[illegible]
5۔ [illegible] آپ کا نمبر؟
[illegible]
6۔ اردو [illegible]؟
اردو [illegible]۔
7۔ شادی؟
[illegible]
8۔ [illegible]
[illegible]
9۔ [illegible]
2014ء میں [illegible]
10۔ [illegible] ایک [illegible]؟
[illegible]
11۔ [illegible] کس کے ہاتھ میں [illegible]؟
ان کے ہاتھ میں [illegible]۔
12۔ ایک اچھا خواب جو آپ [illegible] ہوں؟
میرے خواب [illegible]۔
13۔ آپ کا صبح کب طلوع ہوتا ہے؟
[illegible]
14۔ صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟
چائے۔
15۔ بھوک کو کم کرنے کے لیے کیا کھاتے ہیں؟
[illegible]
16۔ پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟
محبت ہے پاکستان سے [illegible]

17۔ [illegible]
18۔ [illegible]
19۔ [illegible]
20۔ [illegible]
21۔ آپ کے [illegible]
22۔ [illegible]
23۔ [illegible]
24۔ [illegible]
25۔ [illegible]
26۔ [illegible]
27۔ ایک خواہش جو حسرت بن گئی؟
[illegible]

28۔ [illegible]
29۔ [illegible]
30۔ [illegible]
31۔ [illegible]
32۔ [illegible]
33۔ [illegible]
34۔ [illegible]
35۔ [illegible]
36۔ [illegible]
37۔ [illegible]

WOMEN SKILLS GROUP

میرے مطابق میں پرفیکٹ ہوں۔ اور میں لوگوں کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتا۔ اور اللہ اتنی ہدایت دے مجھے کہ باقاعدگی کے ساتھ نماز پڑھوں۔

38۔ فخر کا کوئی لمحہ؟
جب پہلی بار اپنے آپ کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا تو اپنے آپ پر بہت فخر ہوا تھا۔

39۔ بچپن کی کوئی بری عادت؟
میری نظر میں بچپن میں کوئی عادت بری نہیں ہوتی۔ بچپن میں سب کو شرارتی ہونا برا لگتا ہے۔ مگر شرارت سے ہی انسان سیکھتا بھی ہے۔

40۔ ضدی ہیں؟
جی طبیعت میں بہت زیادہ ضد ہے میری۔

41۔ بہترین انتقام؟
کامیابی سے ہم کنار ہونا اور زیادتی کرنے والے کو کچھ کر کے دکھانا۔

42۔ لاتعلق ہو جاتے ہیں ان لوگوں سے جو؟
جو مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں اُن سے میں تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتا۔

43۔ اگر آپ کا والٹ زمین پر گر جائے تو کیا کیا نکلے گا؟
میرا کارڈ اور بیگم کی تصویر۔

44۔ پسندیدہ فاسٹ فوڈ؟
پیزا۔ کہیں کا بھی 'کھانے سے انکار نہیں کر سکتا۔

45۔ کھانا نامکمل لگتا ہے اگر؟
اگر سلاد نہ ہو تو کھانا نامکمل لگتا ہے۔

46۔ پیسہ محفوظ رہتا ہے اگر؟
اگر آپ اسے خرچ نہ کریں تو ـــــ لیکن خرچ کریں گے تو اور آئے گا۔

47۔ بہترین رومینٹک ہیرو ئن آپ کی نظر میں؟
میں اور میری بیوی۔

48۔ ہر کامیابی کے پیچھے بہت سے لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے' آپ کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟
مجھے میری فیملی اور بیگم کا ساتھ ملا ان سب کے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔

49۔ کبھی اسٹریٹ کرائم کا شکار ہوئے؟
نہیں کبھی نہیں۔

50۔ ٹاک شو کے بہترین تجزیہ نگار؟
"حامد میر"

51۔ نصیحت بری لگتی ہے؟
جب مجھے کوئی اپنے آپ کو چینج کرنے کا مشورہ دیتا ہے یا نصیحت کرتا ہے تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔

52۔ جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟
سنگل۔ اکاؤنٹ اپنا اپنا۔

53۔ ایک تاریخ جو بھول نہیں سکتے؟
اپنی شادی کی تاریخ۔

54۔ ایک کھانا جو کسی وقت بھی کھا سکتا ہوں؟
"پیزا۔"

55۔ کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟
اسپورٹس چینل پہ ریموٹ خود بہ خود رک جاتا ہے۔

56۔ اپنا ڈراما دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟
کہ میں اپنے آپ کو کیسے مزید بہتر کر سکتا ہوں۔

57۔ کیا آپ برانڈ کانشیس ہیں؟
نہیں میں برانڈ کانشیس نہیں ہوں۔

58۔ پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟
"جیوا۔"

59۔ "کوکنگ سے دلچسپی یا لگاؤ؟
مجھے کوکنگ سے بے حد لگاؤ ہے۔ بہت شوق ہے کوکنگ کا۔

60۔ ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟
شاہد آفریدی کی زندگی پر اگر فلم بنے تو شاہد آفریدی کا رول کرنا چاہتا ہوں۔

61۔ ایک کردار جو بھول نہیں سکتا؟
ایک تھیٹر پلے کیا تھا جس کا نام "جھانجھر دی پاون" اس میں "حمزہ" کا کردار کیا تھا۔

62۔ ایک کردار جو کر کے پچھتائے؟
ابھی تک ایسا کوئی کردار نہیں کیا اللہ کا شکر ہے۔

63۔ آپ کی فیوچر پلاننگ؟
اللہ کو بہتر پتا ہے ہماری پلاننگ کے بارے میں کیونکہ اللہ ہی بڑا پلان کرنے والا ہے۔

64۔ عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟
دونوں۔

65۔ ایک خواب جو بار بار دیکھتا ہوں؟
"امی" میں گھر لینے کا خواب بار بار دیکھتا ہوں۔

66۔ پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟
ہر وہ اسٹریٹ جہاں "پیزا" اور "باربی کیو" ملتا ہو۔

67۔ اگر میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟
تو میری زندگی بہت سکون میں ہوتی۔ کیونکہ مجھے میک اپ پسند نہیں ہے۔ مجھے میک اپ سے نفرت ہے۔

68۔ شادی میں پسندیدہ رسم؟
رسم تو کوئی نہیں ہے ـــــ لیکن ہر انسان کو اپنی اوقات مطابق اپنی جیب کے مطابق ہی خرچ کرنا چاہیے۔ چاہے وہ تحفہ ہو یا کیش ہو۔

69۔ ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟
اپنے ہاتھ کا۔

70۔ بدلہ لیتے ہیں؟
بالکل بھی نہیں ...... میں فوراً معاف کرنے والوں میں سے ہوں۔

71۔ کب فریش ہوتے ہیں؟
رات کے بارہ بجے۔

72۔ اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟
دونوں کے یعنی اپنے تجربے سے تو انسان سیکھتا ہی ہے مگر میں دوسروں کے تجربے سے بھی سیکھتا ہوں۔

73۔ اس دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟
اللہ کا بہترین تحفہ ہے' انسان کے دل میں محبت اور پیار کا جذبہ۔

74۔ لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟
سیلفی کی یا پھر کہتے ہیں کہ مُکری کر کے دکھائیں۔

76۔ آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟
عجیب تو نہیں کہہ سکتے۔ لیکن میں "آسکر ایوارڈ" جیتنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ اور ان شاء اللہ پوری ہوگی خواہش۔

77۔ قسم کھائی آپ نے؟
جی کر رہا ہوں۔ دو قسمیں۔

78۔ بچپن کا کوئی کھلونا جواب بھی آپ کے پاس محفوظ ہے؟
جی ـــــ "میرا دل"

79۔ فوبیا ہے؟
جی ـــــ پانی کا اور سانپ سے بہت ڈر لگتا ہے۔

80۔ کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟
جی ـــــ جی ـــــ محبت اندھی ہوتی ہے۔

81۔ کیا اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟
اگر مجھے اندازہ ہو جائے کہ میری غلطی تھی تو میں فوراً معافی مانگ لیتا ہوں۔

82۔ دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟
دونوں کی، مگر اس کا انحصار اس پر ہے کہ سچویشن کیا ہے۔

83۔ غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟
ہاہاہا ـــــ وہ یہاں نہیں بتا سکتا۔

84۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے یا ٹائم لگتا ہے۔

85۔ محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟
کسی کو بھی نوازنے کا پورا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے ـــــ اور ہاں ـــــ محنت کرنا بھی بہت ضروری ہے۔

99۔ اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟
تو میں اپنا پرانا وقت یاد کروں گا۔ جب شہرت نہیں تھی۔ اللہ سب آسان کر دے گا۔

☆

WOMEN SKILLS GROUP

خبریں [illegible]

[illegible] سہیل

ریشم

شوبز کی دنیا میں طویل عرصے تک اپنی اداکاری سے خود کو [illegible] [illegible] اداکارہ ثابت کرنے والی اداکارہ ریشم کو آپ [illegible] ایک عرصے کے بعد ٹی وی کے کسی ڈرامے [illegible] [illegible] گے۔

ریشم سمجھتی ہیں کہ کسی [illegible] اداکار کے لیے حق کردار نبھانا اس کی [illegible] زندگی [illegible] [illegible] چیلنج ہوتا ہے۔

ریشم کا کہنا ہے کہ یہ اداکار کی [illegible] ہے کہ وہ کسی فلم یا ڈرامے میں اپنے کردار کو دیکھنے والوں کے لیے قابل قبول بنائے۔ ہر مرتبہ بالکل نیا اور پہلے سے قطعی مختلف نظر آنا ہوتا ہے۔ اسی لیے میں کم کم ہی اسکرین پر نظر آتی ہوں۔

(اچھا ہم سمجھے تھے کہ کوئی آپ کو [illegible] بھی اپنا ہی نہیں ہے کیوں کہ ...؟)

چیلنج

مریم قیس کا چہرہ اب ٹی وی دیکھنے والوں کے لیے نیا نہیں ہے۔ ان کے کریڈٹ پر کئی ڈرامے اور کمرشلز ہیں جن کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ٹی وی کے لیے ایک اچھا اضافہ ہیں۔ مریم قیس کو شوبز میں قدم رکھے ابھی تین چار سال ہی ہوئے ہیں۔

مریم قیس اسلام آباد میں پیدا ہوئیں۔ (اور ان کے فن کی آب یاری کراچی میں ہو رہی ہے۔) انہوں نے اسلام آباد سے ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ مریم کی ایک چھوٹی بہن اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔

مریم کا کہنا ہے کہ "جب ایکٹر خود کو ڈائریکٹر سمجھنے لگے تو وہ اپنے کام سے بھی جاتا ہے اور وہ پھر کاسٹ کے لیے بھی مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔"

(مریم! کبھی کبھی ایکٹر اپنے تجربے کی بنیاد پر نو آموز ڈائریکٹر کو بہتر مشورہ بھی دے دیتا ہے۔)

احترام

فیض [illegible] فیسٹیول کے پہلے روز ایک سیشن میں فیض احمد فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی اور بھارت سے آئی کیفی اعظمی کی بیٹی شبانہ اعظمی نے فیض اور کیفی اعظمی کے درمیان دوستی کے حوالے سے گفتگو کی... انہوں نے دونوں شاعروں کے برصغیر کے لوگوں میں امن، پیار، انسانیت اور دوستی کے پیغام کی بھی بات کی۔

شبانہ اعظمی اور جاوید اختر نے فیض اور کیفی اعظمی کی شاعری بھی پڑھ کر سنائی۔

شبانہ اعظمی اور جاوید اختر کا کہنا تھا کہ پاکستانی عوام کی جانب سے ان کے شاندار استقبال پر وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور انہیں اس دورے میں جو محبت اور احترام ملا ہے وہ اس کو کبھی نہیں بھولیں گے۔

الزام

[illegible] صوفیہ مرزا کا [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نے [illegible] چالان ہو گیا۔ جس کے خلاف [illegible] نے [illegible] [illegible] کی تصویر بھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھا ...؟)

[illegible] کا کہنا ہے کہ [illegible] [illegible] رفتار [illegible] [illegible] [illegible] سے بھی کم [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible] نے اوور اسپیڈنگ پر چالان [illegible] [illegible] مانگی تو انہوں نے دکھانے سے انکار [illegible]

[illegible] نے مزید کہا کہ چالان کی [illegible] [illegible] [illegible] کی۔ پولیس اہلکاروں کا رویہ [illegible] غنڈوں کی طرح کا تھا۔

(ٹریفک پولیس کا ان الزامات کے جواب میں کہنا تھا کہ صوفیہ مرزا کا اوور اسپیڈنگ پر چالان کیا گیا وہ ایک سو بارہ کی رفتار سے گاڑی چلا رہی تھیں۔ [illegible] سو روپے کا چالان کر کے پانچ سو روپے واپس بھی کیے گئے۔ [illegible] نے سب انسپکٹر کے ساتھ بدتمیزی بھی کی۔

کچھ ادھر ادھر سے

فروری 1987ء میں ڈاکٹر عبدالسلام نے امریکی جماعت کے اراکین کو ایک چٹھی لکھی کہ "آپ پاکستان پر دباؤ ڈالیں اور ہتھیاروں اور [illegible] وظیفوں پر [illegible] کر ادارے کے خلاف کیے گئے اقدامات حکومت پاکستان واپس لے۔ (ڈاکٹر عبدالسلام، پاکستان)

● ٹی وی اسکرین پر ایک [illegible] [illegible] کچھ کر بہت اچھا [illegible] [illegible]۔ سر گودھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible]

جنہیں رب نے گرفتار کیا تھا انہی دل کا دورہ پڑنے [illegible] [illegible] [illegible] کر اسپتال لایا گیا۔ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی زندگی اور [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] کے عہد میں [illegible] [illegible] ہوں۔

(اقتباس: [illegible] حسن قریشی۔ [illegible] حال)

آپ کا باورچی خانہ

شانزیہ اسلام ہاشمی

کھانے پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کھانا پکاتے وقت صفائی، صفائی اور صفائی کا خیال رکھتی ہوں۔ گھر والوں کی پسند ناپسند کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ ویسے میں جو بھی پکالوں وہی آرام سے کھالیا جاتا ہے اور غذائیت کے لحاظ سے میں سبزی گوشت والیں سب چیزیں پکانے کی کوشش کرتی ہوں۔

میری پیاری سی دو بیٹیاں ہیں جو مزے دار کھانا شوق سے کھاتی ہیں اس لیے کوشش ہوتی ہے کہ کھانا مزیدار ہو۔

س: گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں۔ کھانے کا وقت ہے۔ آپ فوری طور پر کون سی ڈش تیار کر کے پیش کریں گی؟

ج: گھر میں مہمان بتا کر آتے ہیں اور ان کے لیے کولڈ ڈرنک بسکٹ وغیرہ لے آتے ہیں ورنہ پلاؤ زندہ باد، دائنہ منٹوں میں تیار۔

پلاؤ بنانا تو ہر کسی کو آتا ہے بقول میرے (ان کے) تم پلاؤ اچھا بنا لیتی ہو۔ سو ترکیب حاضر خدمت ہے۔

پیاز	دو بڑی (باریک کاٹ لیں)
گوشت	مٹن یا بیف ایک کلو
چاول	ایک کلو
نمک مرچیں	حسب پسند

پیاز براؤن کر کے گوشت شامل کر دیں۔ چکن گل جائے تو ادرک لہسن کا پیسٹ نمک مرچیں ٹماٹر شامل کر کے بھون لیں۔ پھر ناپ کر پانی ڈالیں اور نمک ڈالتے وقت اس میں تھوڑا سا چکن کیوب شامل کر دیں چاول گلا کے دم پر رکھ دیں اور اس ننھی سی ٹپ کا اگر اچھا رسپانس آئے تو دعائیں دیں۔

س: کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج: کچن میں بے ترتیبی بالکل پسند نہیں۔ صاف ستھرے برتن اور صاف ستھرا فرش ورنہ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ ویسے میں ہاتھ کے ہاتھ صفائی کرتی جاتی ہوں۔ فرش کو پوچا لگا کر چمکا کے رکھتی ہوں۔ رات کو ہر چیز جگہ سے رکھ کے سوتی ہوں۔

س: ناشتے میں کیا بناتی ہیں۔ کسی خصوصی چیز کی ترتیب؟

ج: ناشتہ بہت ضروری چیز ہے۔ جو مزے دار نہ ہو تو کھانے کو دل نہیں کرتا۔ سو کبھی کبھی بازار سے کوفتے کا سالن، رات کا بچا ہوا سالن اور ساتھ پراٹھے۔ (ویسے میں پراٹھے بالکل نہیں کھاتی) چائے صرف میرے میاں لیتے ہیں میں نہیں پیتی۔ صبح ناشتے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کر سکتی (دم والے آلو انڈوں کا پتا نہیں کیا کیا) کیونکہ ٹائم نہیں ہوتا۔ سادہ سا ناشتہ تلے ہوئے انڈے اور روٹیاں زندہ باد۔

س: مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: مہینے میں کھانا تو کافی بار باہر کھاتے ہیں۔ اور اکثر منگوا بھی لیتے ہیں۔ لیکن جب سے ہوٹلوں میں چھاپوں والی خبریں سنی ہیں۔ رپورٹس دیکھی ہیں تب سے کم ہو گیا ہے۔

س: کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا خیال رکھتی ہیں۔

ج: کھانا تو موسم کے حساب سے ہی اچھا لگتا ہے۔ سخت سردی کا موسم اور گاجر کا حلوہ (کڑاہی بھر کے) اور گرمیوں میں الگ رنگ کے ٹھنڈے فیکس واؤ، کبھی اسٹرابری کبھی آم، فالسے کا شربت اور سردیوں میں خوب پکے ہوئے بڑے بڑے تازہ کینو کالے نمک کے ساتھ امردو۔

س: اچھا کھانا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج: اچھا کھانا پکانے کے لیے موڈ کا اچھا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ جلا ہوا کھانا آپ کا منہ چڑا رہا ہوگا۔

موسم کے پکوان

حمیرا جیلانی

چنا چاٹ

اجزاء:۔

چنے	ایک پاؤ
آلو	ایک کپ
ہرا دھنیا	حسب پسند
پیاز	ایک کپ
پاپڑی	آدھا کپ
چاٹ مسالا	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
نمک	حسب ضرورت

چٹنی کے لیے

املی کا رس	ایک کپ
کھجور	آٹھ عدد
گڑ	دو کھانے کے چمچے
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
کالا نمک	آدھا چائے کا چمچہ

چٹنی کے لیے:۔ ایک برتن میں املی کا رس، کھجور، گڑ، چینی، لال مرچ، نمک، چاٹ مسالا ڈال کر بیس منٹ کے لیے پکائیں۔ پھر ٹھنڈا کر کے استعمال کریں۔

چاٹ کے لیے:۔ ایک ڈش میں ابلے ہوئے چنے، آلو (ابلے چھلے اور کٹے ہوئے)، تین چوتھائی کپ چٹنی اور پھینٹا ہوا دہی — ڈال دیں۔ (دہی کو پانی ڈال کر پتلا کر لیں) پھر باقی چٹنی ڈال کر اوپر پاپڑی (توڑ کر)، کٹی ہوئی پیاز، دھنیا اور چاٹ مسالا ڈال دیں۔ کھٹی میٹھی چنا چاٹ تیار ہے، ٹھنڈی یا گرم سرو کریں۔

چکن شاشلک

اجزاء:۔

چکن (بغیر ہڈی کا)	آدھا کلو
ادرک لہسن پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سویا ساس	دو چائے کے چمچے
سرکہ	دو چائے کے چمچے
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	دو چائے کے چمچے
اسٹکس	حسب ضرورت
شملہ مرچ	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد (کیوب میں کٹے ہوئے)
پیاز	دو عدد

ترکیب:۔

تمام اجزاء کو ملا کر چکن پر اچھی طرح لگا دیں اور آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب تمام سبزیوں کو چوکور شکل میں کاٹ کر چکن کے آمیزے کے ساتھ کاٹ کر ملا دیں۔ اب چکن اور سبزیاں اسٹک پر لگائیں (پہلے پیاز، پھر ٹماٹر، پھر شملہ مرچ پھر چکن) ایک کھانے کا چمچہ تیل میں فرائی کریں۔

WOMEN SKILLS GROUP

نفسیاتی الجھنیں

آرزو ..... کراچی

س: چھ ماہ پہلے میرا رشتہ طے ہوا، وہ صاحب دوبئی میں جاب کرتے تھے۔ طے یہ ہوا کہ چھ ماہ بعد چھٹی پر آئیں گے تو شادی ہوگی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد میری نند نے مجھے موبائل لا کر دیا جو انہوں نے بھجوایا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ میں نے امی کو بتایا تو انہوں نے کہا اگر وہ اصرار کر رہے ہیں تو بات کرلو۔ لیکن تھوڑی احتیاط کرنا۔ مختصر بات کرنا۔ کیونکہ منگنی کچا رشتہ ہے۔ ختم بھی ہو سکتی ہے۔ زیادہ بات چیت الجھنوں کا باعث بن سکتی ہے۔

شروع شروع میں تو میں احتیاط برتتی رہی، بات چیت، ہوں، ہاں سے آگے نہ بڑھی پھر میں اپنے رنگ پر آگئی۔ یہاں یہ بتاتی چلوں کہ میں خطرناک حد تک سچ بولتی ہوں۔ خاندان بھر میں منہ پھٹ مشہور ہوں اپنی بھی کوئی خرابی ہو تو صاف بتا دیتی ہوں۔ جھوٹ کا پردہ نہیں ڈالتی۔

ایک دن انہوں نے باتوں کے دوران مجھ سے پوچھا۔ تمہیں کھانا پکانا آتا ہے۔ میں نے صاف گوئی سے کہا میں نے آج تک چائے بھی نہیں بنائی۔ کچن کا سارا کام امی اور بھابھیاں کرتی ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔

پھر کچھ دن بعد انہوں نے کہا۔ تمہیں پاکستان میں میری ماں بہنوں کے ساتھ رہنا ہوگا۔ جب تک بہنوں کی شادی نہیں ہوتی۔ میں تمہیں دوبئی نہیں لے جا سکتا کیونکہ یہاں میں اپنے دوستوں کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتا ہوں۔ تمہارے یہاں آنے کی صورت میں مجھے علیحدہ فلیٹ لینا پڑے گا جو بہت مہنگا ہے۔ بہنوں کی شادی کے بعد میں تمہیں بلا لوں گا۔

واضح رہے ان کی تین چھوٹی بہنیں ہیں۔ ایک کی شادی طے ہو چکی ہے۔ دو ابھی پڑھ رہی ہیں۔ میں نے اپنی ازلی صاف گوئی سے کہہ دیا کہ یہ تو ممکن نہیں ہے۔ آپ کی اماں بہنیں مجھے بہت تیز لگتی ہیں۔ آپ کی دونوں بھابھیاں بھی کبھی کبھی نظر آرہی تھیں جب تک آپ مجھے نہیں بلواتے۔ میں اپنی امی کے گھر رہوں گی۔

ایک بار انہوں نے اپنے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ میرے دو تین رشتے آئے تھے۔ جو بہت اچھے بھی تھے۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ جب ان کا رشتہ آیا میرے تین رشتے آئے ہوئے تھے۔ میرے ذہن میں اس وقت کوئی بھی بات نہ تھی۔ جو سچ تھا بتا دیا۔

اب ان کے گھر والوں نے رشتے سے انکار کہلوا دیا ہے۔ وجہ یہ بتائی ہے کہ میں ان کے گھر میں ایڈجسٹ نہیں کر سکوں گی۔ میرا مزاج ان کے گھر کے ماحول سے مختلف ہے۔

یہ سن کر گھر والے تو پریشان ہو گئے لیکن میں غصہ سے پاگل ہو گئی۔ فون اٹھا کر انہیں کھری کھری سنا دیں۔ غصے میں وہ بھی کہہ دیا جو کہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ خاموشی سے سنتے رہے پھر فون رکھ دیا۔

اب میں پریشان ہوں۔ گھر والے مجھے برا بھلا کہتے ہیں۔ آپ بتائیے کیا سچ بولنا گناہ ہے؟

ج: اچھی بہن سچ بولنا گناہ نہیں ہے۔ بلاضرورت بولنا گناہ ہے۔ آپ کے منگیتر آپ کے مزاج سے واقف نہیں تھے۔ آپ نے اس کو اپنی عادت کے مطابق سچائی سے بتا دیا کہ آپ کو کوئی کام نہیں آتا۔ آپ اسی بات کو سلیقے سے بھی کہہ سکتی تھیں کہ مجھے کھانا پکانا نہیں آتا لیکن میں سیکھ رہی ہوں۔ جلد سب کچھ سیکھ لوں گی۔ ان کی ماں بہنوں کے متعلق بھی آپ نے نہایت نازیبا بات کی۔ وہ آپ کو تیز لگی تھیں۔ ضروری نہیں کہ تیز ہوں بھی۔ بالفرض تیز بھی ہوں تو اپنی ماں، بہنوں کے متعلق اس طرح کی بات کسی کو اچھی نہیں لگے گی۔ اگر وہ آپ کی والدہ کے متعلق ایسی بات کہتا تو آپ کو بھی اچھا نہ لگتا۔ پھر آپ کو غصہ آیا تو آپ نے ذرا بھی لحاظ کیے بغیر ان کو بقول آپ کے کھری کھری سنا دیں۔ آپ کو تحمل سے وجہ پوچھنا چاہیے تھی۔

اب جو ہو چکا۔ اسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔ لیکن ایک کوشش آپ کے والدین کر سکتے ہیں ممکن ہے۔ وہ انہیں سمجھا سکیں اور یہ رشتہ قائم رہ جائے۔

ن ..... ز ..... گجرات

میرا مسئلہ عجیب سا ہے شاید آپ یقین نہ کریں۔ لیکن میرے ساتھ یہی معاملہ ہے۔

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں لوگوں کے چہروں سے ہی ان کے تاثرات سے ہی ان کی شخصیت کا اندازہ کر لیتی ہوں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہوا ہے کہ میں سب کے چہروں سے اگلی کہنے والی بات کا اندازہ کر لیتی ہوں۔ اور میرے بہت سارے اندازے صحیح نکلتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اذیت ناک سوچیں ہفتوں جان نہیں چھوڑتیں۔ خوشی پہنچانے والے اندازے بھی ہوتے ہیں اور ہفتوں سرشار رکھتے ہیں لیکن میں اس چیز سے بیزار ہوں۔

دوسرا مسئلہ وہم ہے۔ جراثیم وغیرہ کا نجانے کیسی کیسی باتیں میرے ذہن میں آتی ہیں کہ اگر ہاتھ نہ دھوئے تو یہ ہوگا وہ ہوگا۔ اسکول ٹیچر ہوں۔ بچوں کے کان وغیرہ پکڑوں تو ہاتھ ضرور صابن سے ہی دھوتی ہوں۔ اپنی اس عادت سے بھی پریشان ہوں اور تیسرا مسئلہ۔ یہ ہے کہ جو بات خیال کی صورت ذہن میں آئے۔ وہ پوری ہو جاتی ہے۔ میرا بھائی کہیں جا رہا ہے میں نے خیال کیا کہیں موبائل گرا نہ آئے جب وہ واپس آیا واقعی موبائل گم ہو چکا تھا۔

ایک دم ذہن میں خیال آتا ہے اگلا پل حقیقت کا ہوتا ہے۔ لیکن فوراً سے پہلے اپنے خیال کو دوسروں سے شیئر کر دوں تو وہ پورا نہیں ہوتا۔

میرے لیے یہ تینوں مسئلے بڑی مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ میں بالکل عام سی لڑکی ہوں۔ صرف فجر کی نماز ادا کرتی ہوں کوشش اور دعا ہے کہ پانچوں پڑھا کروں۔ غصے کی تیز ہوں۔ منہ پھٹ اور بدتمیز بھی ہوں۔ لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ میں اپنی شخصیت میں تبدیلی لانا چاہتی ہوں۔

اچھی بہن! آپ کے دو مسئلے پریشان کن ضرور ہیں لیکن تشویش ناک نہیں۔ بعض لوگوں کی چھٹی حس تیز ہوتی ہے۔ وہ بہت سی باتوں کا ہونے سے ہی اندازہ لگا لیتے ہیں جو بیشتر اوقات صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اس بات کو اہمیت نہ دیں۔ ایسے کئی لوگ ہیں جو یہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

اصل مسئلہ آپ کے وہم کا ہے۔ اس کے علاج کی ضرورت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کر لیں کیونکہ یہ مسئلہ بڑھ کر تشویش ناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ کچھ عرصہ دوائیاں استعمال کرنے سے آپ کی یہ تکلیف رفع ہو جائے گی۔ غصہ کی تیزی، بدتمیز اور منہ پھٹ ہونا ایسی خرابیاں ہیں جن پر آپ تھوڑی سی کوشش سے آپ خود بھی قابو پا سکتی ہیں۔ علاج اور دواؤں کے باقاعدہ استعمال سے غصہ بھی کم ہوگا۔ آپ کے یہ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ بس تھوڑا وقت لگے گا۔

☆

WOMEN SKILLS GROUP

بیوٹی بکس

امت الصبور

راشدہ نسرین ...... لیہ

س: میری عمر چوبیس سال ہے اور میرا وزن پچپن کلو ہے لیکن میرے بالوں کی نشوونما نہ ہونے کے برابر ہے جب کہ گزشتہ چند مہینوں سے گنج پن بھی نظر آنے لگا ہے۔ ہفتے میں دوبارہ تیل بھی لگاتی ہوں مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ آپ کوئی ایسا حل بتادیں جس سے میرے بال گرنا بند ہوجائیں۔ اس کے ساتھ مجھے خشکی کی شکایت بھی رہتی ہے جس کی وجہ سے سر میں خارش کا سامنا رہتا ہے۔

ج: بالوں کی حفاظت، انہیں گرنے سے روکنے، گنج پن دور کرنے اور خشکی دور کرنے کے لیے ہر بار نہانے سے پہلے سرسوں کے تیل کو ہلکا سا گرم کرکے مالش کریں یا رات کو سر پر تیل لگائیں اور صبح اٹھ کر بال دھولیں، اس طرح بال اور سر کی جلد خشک ہونے سے محفوظ رہے گی۔ گنج پن دور کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی سے سر دھوکر پانچ سے دس منٹ تک انگلیوں کے پوروں سے سر کا مساج گنجے پن کا بہترین علاج ہے۔ اس کے علاوہ دو بڑے چمچے میتھی کے بیج رات کو پانی میں بھگودیں اور صبح ان کا لیپ بنا کر سر میں لگائیں۔ ایک گھنٹے تک لگا رہنے دیں پھر ریٹھا اور سکاکائی کا آمیز بنا کر اس سے سر دھولیں۔ سر کی خشکی دور کرنے کے لیے ناریل اور مہندی کا تیل ہم وزن ملا کر بالوں میں لگائیں۔ اس کے ساتھ مہندی میں لیموں کے چند قطرے اور انڈا ملا کر بالوں میں لگائیں اور ایک گھنٹے بعد سر دھولیں، خشکی سے نجات کے لیے بہترین عمل ہے۔ گنج پن کے خاتمے کے لیے آپ پیاز کے رس کا بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ پیاز کا رس کمزور اور جھڑتے بالوں کے لیے اکسیر ہے۔ سر میں پیاز کا رس لگانے کے ایک سے دو گھنٹے بعد صاف پانی سے سر دھولیں جب کہ اگر آپ کو شیمپو کی ضرورت محسوس ہو تو کم مقدار میں شیمپو کا استعمال کریں کیوں کہ شیمپو کا زیادہ استعمال بھی پیاز کے رس سے حاصل ہونے والے فائدے کو ختم کردیتا ہے۔

مریم اکبر ...... قصور

س: احتل آپی! میں بی اے کی اسٹوڈنٹ ہوں، یونیورسٹی جانے اور پڑھائی کی وجہ سے رات دیر تک جاگنے سے میری آنکھیں ہر وقت بوجھل اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جب کہ آنکھوں کی چمک بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔

ج: آنکھیں اگر خوب صورت نہ ہوں تو چہرے کی خوب صورتی بھی ماند پڑنے لگتی ہے۔ ہلکی سوجی آنکھیں اور آنکھوں میں لال ڈورے آپ کی آنکھوں کی خوب صورتی کے قاتل ہیں۔ آنکھوں کو روشن اور چمک دار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ رات کو جلدی سوئیں۔

بہت زیادہ سونا یا کم سونا، پانی کم پینا، ہائی بلڈ پریشر، تھکن، کاسمیٹک الرجی، سوجی ہوئی آنکھوں کی وجہ ہوسکتی ہے۔ فوری حل کے طور پر آپ برف کے ٹکڑے آنکھوں پر رکھیں۔ اس کے ساتھ استعمال کیے ہوئے ٹی بیگس کو پندرہ سے بیس منٹ تک فریج میں رکھیں اور پھر انہیں آنکھوں پر رکھ لیں۔ آپ خود فرق محسوس کریں گی۔ کھیرے کے ٹکڑے یا کچے آلو کے ٹکڑے بھی آنکھوں پر رکھنے سے خون کی گردش بہتر ہوتی ہے اور آنکھوں کی سوجن کو ختم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ آنکھوں کے حلقوں کی بڑی وجہ نیند کی کمی ہے۔ دن میں کم از کم آٹھ گھنٹے سوئیں۔ ذہن پر غیر ضروری بوجھ مت ڈالیں۔ اس کے علاوہ کھانے میں نمک کی مقدار کم کردیں۔